

نمواحہ کہتی ہیں

”قراقرم کا تاج محل“ میری زندگی کا سب سے مشکل ناول ثابت ہوا۔ مجھے اس میں ایک بہت مشکل موضوع عام فہم بنا کر لکھنا تھا۔ یہ بھی ایک نئی کہانی میرے پاس ردوبدل کی گنجائش بہت کم تھی۔ دوسرا میں ردوبدل نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ میرا خیال ہے جو مزا ایک نئی کہانی کو پڑھنے میں آتا ہے وہ فرضی داستانوں میں نہیں ہوتا۔ کہانیوں کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔ آپ کو وہ کردار اپنے قریب نظر آتے ہیں بہت اپنائیت ہوتی ہے ان میں۔ مجھے یہ بھی کہانیاں لکھنے کا خاص شوق ہے۔ اس سے پہلے ”پہاڑی کا قیدی“ لکھی تھی مگر بے حد ردوبدل کے ساتھ۔ اس ناول میں نے نام تک نہیں بدلے ہیں اس کو جیسی بھی لکھی ہی لکھنا چاہتی تھی شاید اسی لیے میرا یہ خیال تھا کہ میں اس میں لکھ پاؤں گی۔ یہ کہانی پچھلے دھائی برس سے میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی مگر میرے اندر ج پوچھیں تو لکھنا بہت نہیں تھی۔ پھر اگست میں میں نے جب اسے لکھنا شروع کیا تو روز ایک پیرا لکھ کر چھوڑ دی تھی میرا خیال تھا یا پھر تھا کہ میں اسے بھی لکھ نہیں پاؤں گی۔ مجھے کوئی بھی کام کرنے کے لیے ڈھیر ماری حوصلہ افزائی اور تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ”قراقرم کا تاج محل“ کے لیے مجھے تحریک ملی تھی تو مارچ 2005ء میں تو مارچ کے زندہ بچ جانے والے جب پاکستان آیا تھا تو اس کی شوکت عزیز کے ساتھ ایک تصویر چھپی تھی وہ تصویر میں نے بہت عرصے تک اپنے لپ ٹاپ کے بیک گراؤنڈ پر لگائے رکھی ہیں شاید وہ واحد پاکستانی تھی جس نے 2005ء میں تو مارچ کے زندہ بچ جانے کے لیے بہت دعاؤں کی تھیں۔ مجھے تو مارچ کے حقیقی زندگی کے ہیروز بہت اچھے لگتے ہیں۔ یقین کریں اگر اس سال پاکستان آتا تو شاید مجھے ناول لکھنے کی توانائی اور جذبہ بھی نہ ملتا۔

اس بات کی وہاں اسے ناول کی بات نہ آئی تھی کہ میں نے اسے سمجھ کر کوڑے میں بند کرنا نہیں آتا۔ اور ناول کو لکھنے سے پہلے میں نے ایک بار وہ لکھا تھا۔ مجھے ایک بات بہت دنوں سے لٹک رہی تھی مجھے کچھ عرصے سے اس بارے میں سوچا تھا کہ اگر اسے ناول بنایا جائے تو اس کی کہانی کس ”مطلب جو را خراب چنانداں میں جیتی“ کی لکھ کر اس کی تعلیم دلا دے گی۔ یہ کہیں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو ہر زبان میں ہونے لگتے ہیں الفاظ ایسے ہیں جو ہر زبان میں ہونے لگتے ہیں۔ یہ تو ایک کردار کی زبان اور لہجہ کی عکاسی کرنا ہے مگر یہاں یہ غیر ضروری اگرچہ الفاظ لکھنا مجھے غلام لگتا ہے خود اگر اردو میں انگریزی لکھ دیتی تو ساتھ ساتھ اس کو ایک سوچا سائیں ایسے ایسے بھی کرتی تھی کہ اس کو ترجمہ کر کے لکھ دیجئے گا کیونکہ میرے لیے یہ ایک شرم کی بات تھی کہ میرا قاری کیا کہے گا اس لڑکی کی اردو اتنی خراب ہے؟ مجھے بہت بعد میں جا کر احساس ہوا کہ جس چیز میں اتنی شرم نہ ہوتی تھی وہ ایک نرینہ بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے اب اس نرینہ کو ہمیں توڑنا ہو گا کیونکہ ہم رانٹرز کے بارے میں ہی طارق اسماعیل سا کرتے لکھا تھا۔

”خواتین رانٹرز جو انفرادیت ظاہر کرنے کے لیے جا بجا انگریزی الفاظ کا استعمال کرتی ہیں۔“

اب اس کے بعد اب آگے کیا رہ جاتا ہے؟ میرا نہیں خیال کہ اگر میں علم رکھتی ہوں تو مجھے اس کا اظہار یوں کر کرنا چاہیے یا دیکھیں گا ہمیشہ خالی برتن ہی سب سے زیادہ شور پیدا کرتے ہیں۔ مجھے اس غلطی کا جیسے ہی احساس ہوا میں نے اعتراف کر ڈالا کیونکہ میری ہمیشہ سے یہی سوچ رہی ہے کہ اگر میں بھاری بھر کم انگریزی کی اصطلاحات استعمال کروں گی تو انجان لفظ پڑھ کر میرا قاری ایک لمحے کو دھوکے کا اسٹے گا۔ اور جہاں وہ اسکا اور اس کی محبت ٹوٹ گئی وہاں میں بطور رانٹرز کا کام ہو جاؤں گی۔ نہ کہ میرے علم اور تحقیق کی دھماک پیٹھے گی، مجھے اپنے قاری کو کہانی پڑھانی ہے اس پر رعب نہیں ڈالنا۔

تو پھر ہوا کچھ یوں کہ میں نے خود سے عہد کیا کہ اسے مکمل اردو میں لکھوں گی (جیسے ظفر محمود کا ناول ”تیس دن“ تھا جس میں کپڑے کے باؤس کی بھی اردو لکھی تھی) اور الحمد للہ میرا یہ ریکارڈ رہا ہے کہ میں نے جب بھی کوئی عہد کیا ہے اسے پورا نہیں کیا۔

”مکمل اردو“ کے سارے دعوے کرنے کے بعد جب میں نے اس ناول کو لکھنا شروع کیا تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔

موضوع میں اردو کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہر لفظ انگریزی کا ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں میں نے اپنے بچپن سے گول جوتے کی انگریزی پوچھی تھی تو سرنے کئی دن سوچ بچار کے بعد مجھے لکھا تھا کہ انگریز گول کے نہیں لکھتے اس لیے اس کی اس نہیں ہوتی۔ اب کی بار میں یہ کہے رہی ہوں کہ قراقرم اور ہمالیہ کے سروے گروہوں نے ہی سب سے پہلے کیے تھے اس قبیلہ میں اردو کا کوئی آنا پنا نہیں ہے۔ جیسے ایک لفظ لے لیں Avalanche میں نے ہر بندے سے Avalanche کی اردو پوچھی، مجھے کوئی مناسب جواب نہیں ملا۔ میری کم علمی کہ لیں یا نا لکھی، مجھے اردو میں Corniced Ridge اور Serac جیسے الفاظ کی قبائل ٹرانسلیشن نہیں دے دیں نے ایک بلتی پور نرس سے پوچھا کہ یا تم لوگ ایوانج کو اردو میں کیا بولتے ہو؟ اس نے برا سا جانی تھکہ لگایا۔

”بابی آپ کو اتنا بھی نہیں پتا؟ ام اس کو گلشیر بولتا ہے۔“

دل تو میرا چاہا کہ پوچھوں پھر گلشیر کو کیا بولتے ہو؟ مگر چلو جاتے وہ بے چارہ تو ان پڑھ پور پڑھا میں نے تو اسے دیکھا اور ایکسپریس جیسے اخباروں میں اس سال اگست میں چھگوری پر ہونے والے ہولناک حادثے کی خبر دیکھی جو یوں شروع ہوتی تھی۔ ”گلشیر بھٹنے سے۔۔۔“ مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ یہ خبر دراصل چھگوری کی تاریکی کے اس بدترین واقعہ کی تھی جو حال ہی میں اگست کو وہاں تھا۔ پاکستان میں لوگ آج بھی ایوانج کو گلشیر بولتے ہیں۔ اب اگر میں عوام بہت کمپر وائز کرتی ہوں ایک دو انگریزی کے الفاظ لکھ بھی دیتی ہوں تو اس میں میرا قصور نہیں ہے۔

ناول حاضر ہے۔ کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ گو کہ ہمارے ہاں یہ رولنگ تو نہیں مگر پڑھیں۔۔۔

جیسے میں نے پہلے بھی ذکر کیا یہ ایک نئی کہانی ہے اور میں نے زیادہ ردوبدل نہیں کیا۔ چند کرداروں کے نام میں بدلے اور جن کے بدلے چاہیے تھے ان کے بدل دیے۔ بلکہ جو نے اعتراض کیا کہ تم نے شروع اور آخر میں ایک غیر ضروری کردار کو بہت پرو جیکشن دی ہے۔ میں نے ہاجرہ گوہری لکھا کہ جیسے تم دوست ہو دیسے وہ بھی دوست ہے۔ دوستوں کو بابی اگست کرنا پڑتا ہے نہ کرو تو وہ چھوڑتے نہیں ہیں۔

ناول کے علاوہ چند باتیں جسے ناول کی سبب تک میں نے بالکل مختلف کر دی یہ میرے لیے ضروری تھا کیونکہ میں لکھ چاہتی کہ کہی کہ اس سے تکلیف ہو۔ آپ لفظ قطب تو نہیں لکھ سکتے تھے۔ بہت سی باتیں آپ کو چھپانی بھی پڑتی ہیں۔ جیسے اس پروجیکٹ سے تعلق ایک بہت اہم تفصیل۔ میں نے پاکستان آری سے مانگی انہوں نے بہت کوشش کی مگر انہیں نہیں ملی۔ دو تین ماہ تک انہوں نے ہر جگہ سے ڈھونڈنے کی کوشش کی پرانی فائلز کھولیں، ایر اور NDMA کو ریفر کیا۔ آئی ایس پی آری فائلز چیک کیں اور آخر میں خالصے تاسف سے مجھے بتایا کہ وہ فائل نہیں ملی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میں بھی دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اگر پاک آری کو نہیں ملتی تو پھر تو کسی کو نہیں ملے گی۔ میرا کام زیادہ آسان ہو گیا میں نے کھانا کچھ نہ کچھ چھپانا پڑتا ہے۔

ہر حال میں نے ”قراقرم کا تاج محل“ لکھتے ہوئے اس کے لیے ریسرچ کرتے ہوئے اس کے لیے ”سفر“ کرتے ہوئے (اردو والا بھی انگریزی والا بھی) بہت انجوائے کیا۔ اس موضوع پر خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں آج تک نہیں لکھا گیا۔ اردو ادب میں سوائے سفر ناموں کے شاید ہی کچھ لکھا گیا ہو۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

لیا جن کلب آف پاکستان کا شکریہ اگر مجھے ان کی مکمل سپورٹ نہ ہوتی تو میں شاید یہ ناول نہ لکھ سکتی۔ (مجھے یہ محنت بھی ملا کہ ”نمرہ اللہ کے فضل سے تم خود بھی یا گل ہو“ اور کسی بھی دوسرے کو یا گل کرنے کی حاجت نہ رکھتی ہو۔)

جانے سے پہلے میں اناتولی بو کرٹیف جیسے اپنے فیورٹ رائٹر لاکھ، ہیرو کے الفاظ دہراؤں گی۔

”پہاڑوں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ ہمیں اپنی راجد حالی میں کھینچ لائیں جہاں ہمارے وہ دوست اب تک کے لیے ہوتے ہیں جن کی رو میں کبھی ان بلندیوں تک جانے کے لیے چلا کرتی تھیں۔ ان کو پہاڑوں کو مت بھلا نا جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آتے۔“

سلاطین کا دل

نوائے وقت، منگل 16 اگست 2005ء، 11 رجب
1426ھ

”راکاپوشی پر گلیشنر پھٹنے سے کوہ پیما لڑکی گر کر ہلاک“

ہنزہ (اے ایف بی) راکاپوشی سر کرنے والی ٹیم کی ایک لڑکی گلیشنر پھٹنے سے کئی فٹ گہرے شکاف میں گر کر

ہلاک ہو گئی۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسی کے مطابق گزشتہ روز صبح تین سے چار بجے کے درمیان راکاپوشی ٹیم کی ایک سبڈیشن کی ایک کوہ پیما چڑھائی کے دوران فحش لباس پہننے کی وجہ سے گری ہوئی۔ ایک سبڈیشن ٹیم کی لڑکی کی فوری ہلاکت کی تصدیق کر لی ہے۔ مزید تحقیقات جاری ہیں۔

20 جولائی 2005ء ایک ماہ قبل۔۔۔ سفید گیٹ عبور کر کے اس نے چند لمبے رک کر اور گرد اٹھانے لیا۔ گیٹ سے آگے سفید پتھروں سے بنا خوب صورت اور طویل ڈرائیوے تھا، دائیں طرف کھلا سالان، اس کے وہاں پر بنے جدید طرز کے پرآمدے میں کچھ بھی چار لاریوں میں سے ایک پر نشاء بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صبح کا اخبار تھا جو وہ عادتاً شام کے وقت ہی پڑھا کرتی تھی۔ نشاء کو سامنے پا کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ڈرائیو سے عبور کر کے پرآمدے تک آئی۔ اس سے پہلے کہ نشاء اس کے استقبال کے لیے اٹھتی، وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے، ایک دایرہ چڑھائے، ماتھے پر ہل ڈالے، پوچھنے لگی۔

مکمل ناؤں

”یہ لڑکا کون تھا؟“

”کون سا لڑکا؟“ اس نے اخبار تہہ کر کے میز پر رکھ دیا، اس کے لمبے میں حیرت تھی۔

”وہی جو باہر کھڑا تھا۔“

”باہر کھڑا تھا؟“ نشاء حیران سی کھڑی ہو گئی، ایک نظر اس نے پریشے کے چہرے کے بڑے زاویوں اور تھانے دار انداز میں کھڑے ہونے کے انداز کو دیکھا۔ ”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”وہی جو باہر حسیب کے ساتھ کھڑا تھا۔“

”اوہ وہ؟ وہ حسیب کا دوست ہے ملنے آیا تھا اور اب تو واپس جا رہا تھا۔ کیوں خیریت؟“

”خیریت؟ مجھے دیکھ کر اس بد تمیز لڑکے نے سیٹی بجائی



شرم تو آتی نہیں ہے آج کل کے لڑکوں کو۔ آئے دو حبیب کو ابھی پوچھتی ہوں کہ کس قسم کے وابہات لوگوں سے دوستی ہے اس کی؟

"کم آن پری!" نشا نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکراہٹ دینے ایک نظر اسے دیکھا۔

سادہ گلابی شلوار قمیض میں لباس پہنے سیدھے اور بے حد سادہ بالوں کو اوچی بونی شکل میں مقید کیے بالوں میں سفید اور ہلکے گلابی رنگ کے جو گرز پٹے وہ بہت نکلی سے نشا کو دیکھ رہی تھی۔

"بھئی سنی بھاری تو کیا ہوا بچہ ہے۔"

"ہاں اچھے فٹ کا بچہ ہے؟"

"بھئی حبیب کا کھانا اس ٹیبلو ہے یعنی ہو گا کوئی سترہ اٹھارہ سال کا منسلک عمر میں ہم سے کم از کم بھی آٹھ سال چھوٹا۔ بچہ ہی ہونا!" وہ اپنی کمرنگ کی بہ نسبت بہت زیادہ ناز پر رہی تھی اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

"نو مری کیوں چار رہی ہو؟ تمہارے لیے ہی ہے سیف چلی بیٹا تھا سوچا کچھ سبب بھی دے آؤں۔" اس نے دو ٹوک نشا کو تنہا تھا اس کا وہ سخت خراب تھا۔

"وہ سیف سنی مری کو بہت پسند ہے۔" نشا کا اس کے ہونٹوں پر غلطی لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"ہاں تو ممانی کے لیے ہی لائی ہوں، کون سا تمہارے لیے بتایا ہے؟"

"نشا آئی اور اصل پری آیا ہمیں بیمار کر کے اپنے ڈاکٹری چکانا چاہتی ہیں۔" کپتے دوست کو رخصت کر کے حبیب بھی اوجھڑا گیا تھا۔

"تمہارے لیے نہیں ہے منہ دھو رکھو۔"

"شیریں کے منہ دھلے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟"

"ہاں یاد آیا۔ تمہیں تو ماموں اور ممانی چڑیا گھر سے لائے تھے نا؟"

"کم آن!" وہ ہنسنے لگا۔ "وہیے ابھی کس نو فر لنگ کی بات ہو رہی تھی؟"

"وہی جس کے ساتھ تم باہر گیت پر کھڑے تھے لگا رہے تھے۔ وہ بد تمیز لڑکا مجھے دیکھ کر سنی بھاری تھا۔ کیسے لڑکوں سے دوستی ہے تمہاری؟"

"ارے وہ میرا دوست ہے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اور وہ آپ کو دیکھ کر سنی میں بھاری تھا وہ تو بس اس کی عادت ہے۔ نور مانڈا وہ تھوڑا سا اسپانڈ چائڈ ہے۔" اپنے

دوست کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ حبیب جھک کر بڑے ڈونگے میں سے سیف کے چٹے گنگر لٹس اٹھا کر کھا رہا تھا۔ "اور سنبھل کر آیا، اس کا باپ پاکستان کا دوست ہے!"

جواب میں پریشہ بڑا کر رہ گئی۔ پھر مانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

"کدھر چار رہی ہو؟ مری کو سلام تو کر لو!"

"بھاس گز کے فاصلے پر میرا گھر ہے۔ پھر آجائوں گی ابھی تو مجھے جانا ہے۔"

"بھئی بروکنگ کیوز تو سنتی جاؤ، حبیب اور اس کے چار دوست راکا پوچی میں کیمپ کازیک کر رہے ہیں۔"

"تو کرتے رہیں۔" اسپتے تھیں نشا نے پریشہ کو چہرہ دینے والی خبر سنی تھی مگر اس نے لاہور کی کدھر سے اپنے لیے۔

"میری کدھر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔" حبیب نے کیمپ میں رہیں۔ سیف اس کا اندازہ لگے۔

شرارت سے مسکرایا۔

"میں تو بھی نہیں رہی۔" وہ کھٹ سے کدھر گیت کی طرف تیز قدموں سے بڑھ گئی۔

"سنو تو تمہارے کپڑے آئے بڑے ہیں ٹیلر سے نو لیتی جاؤ۔" نشا بھارتی ہوئی اس کے پیچھے آئی تھی۔

"تم رات کو آئے جاؤ ابھی میں جلدی میں ہوں۔" وہ گیت کے ہنڈل پر ہاتھ رکھے ایک لمحے کو مڑی تھی۔

"کیوں؟ کیا جلدی ہے؟"

"وہ... گیت پر رکھا اس کا ہاتھ یکدم ڈھیلا ہو گیا۔

تدبر سے اس نے کہا اور وہ کدھر کی طرف نظر پڑا۔

اب کی بار نشا کا سوڈ خراب ہوا تھا۔ "کیا مطلب؟ ان کو اپنے گھر چھین نہیں ہے؟ ہر دو مری شام تو وہ تمہاری طرف ہوتی ہیں اور وہ نہ آیا کے شیطان کے انتہا شیطان بھی کوئی ہو گا؟ جاؤ جلدی گھر جاؤ وہ درجن بھر چیزیں تو توڑ چکے ہوں گے۔"

تھوڑی دیر پہلے کے تاثرات پریشہ کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے وہ بے بسی سے لب گلاٹ کر رہی تھی۔

"وہیے رات کا کھانا بھی یقیناً وہ تمہاری طرف ہی کھائیں گی نا؟ سیف بھائی بھی رات کو بھی آئیں گے اور یقیناً کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ حد ہوتی ہے روز روز کسی

کدھر کھانے کی، لیکن پچھو۔ اور معذرت کے ساتھ وہ بھائی کی وی مثال ہے کہ نیت سیر نہ ہو تو..."

"چلو کچھ نہیں ہوتا۔ بیابا کی ایک ہی بسن ہیں ان کے لئے سے بیابا کی خوش ہو جاتے ہیں۔"

"مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی ڈاکٹر پریشہ جہانزیب نام آئی کڑور اور جذباتی قسم کی دلیلیں کیوں دیتی ہو؟ اتنی اچھی طرح جانتی ہو سیف بھائی کو پھر بھی تم نے ان سے منگنی سے انکار نہیں کیا؟"

سیف سے منگنی کے ان عین برسوں میں نشا نے کوئی تمہیں ہزار دفعہ یہ بات کہی تھی۔

"یہ بیابا کی خواہش تھی نشا! اب اس بات کو بار بار دہرانے سے کیا حاصل؟ اور پھر میں انکار کس کے لیے کرتی؟"

"نشا حبیب رہی تو وہ گیت کھول کر ہر کھل آئی۔ اس کے لیے کہ جی انکار! پیچھے سے بہت آہستہ سے آئے۔ اس کے قدم ایک لمحے کو زنجیر ہوئے تھے۔"

"تمہیں وہ اچھا نہ بات ابھی تک یاد ہے نشا؟" وہ تو اسی سے مسکرائی اور سر جھٹکتے ہوئے اپنے بیگ کے گیت کی چابی نکال گئی۔

وہ لاؤنڈری میں داخل ہو کر پچھو اور ندا آیا ایک ہی کدھر پریشہ کو دے دے تھی میں کوئی بات کر رہی تھی۔

"کم کدھر رہی تھی؟" نشا نے پچھو سے جاتے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ جن کے پیچھے دروازے سے باہر گیا تھا۔

"وہ... کی طرف گئی تھی؟" اس کے کچھ برتن رہتے تھے۔ اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ برتنوں میں سیف علی بھی تھا۔

"سنو پری! یہ زیادہ میل جول نہ رکھا کرو ان لوگوں سے۔ برا مت مانا مگر تمہارے ماموں کی لڑکی بڑی چلتی ہے، میں بھی ایسی ہی ہے اس کی۔ دیکھنے میں ان سے معصوم کوئی نہیں لگتا اور اندر سے پوری ہیں یہ۔"

"اور وہ نشا تو جب بھی ملاقات ہو سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔"

وہ نشا اور ممانی جان کے بارے میں اس قسم کی گفتگو بھی نہ سنتی آگروہ اس کے سسرال والے نہ ہوتے۔

"جی نہیں ذرا اچانک لے آؤں۔" وہ آہستگی سے کدھر

کچن میں چلی آئی۔ وحید ٹرائی سیٹ کر رہا تھا وہ ٹرائی کو دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔

وہ جانتی تھی پچھو نشا اور اس کے ماموں ممانی کے متعلق ایسی باتیں کیوں کرتی تھیں "انہیں ڈر تھا کہ کہیں ماموں اور ممانی، جہاں زیب صاحب برہاؤ ڈال کر سیف اور پریشہ کی منگنی ختم نہ کرادیں۔ کیونکہ اول تو ماموں اور ممانی اس کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے اور اگر دیتے بھی تو صرف اور صرف پریشہ کے کہنے پر اس کی مرضی کے خلاف وہ کبھی بھی جہاں زیب صاحب سے کوئی بات نہ کرتے اور اس معاملے میں ہونے کا حق اگر اس نے ماموں ممانی کو دینا ہوتا تو تین برس پہلے ہی دے چکی ہوتی۔ پچھو کو نشا لوگوں سے دو سرا خوف یہ تھا کہ کہیں نشا پریشہ کو ان کے خلاف بھڑکانے دے، کیونکہ نشا اور ممانی خاصی صاف گو واقع ہوئی تھیں۔ بقول پچھو کے منہ پھٹ بد لحاظ اور بد تمیز جالانگ پریشہ کا خیال تھا کہ جتنی سویت اور کیرنگ ممانی تھیں اور جس طرح اس کی ممانی وفات کے بعد انہوں نے اس کا خیال رکھا تھا کوئی سکی خال بھی نہ رکھ سکتی۔

"باجی! یہ لے جائیں۔" وحید کی شرمیلی سی آواز اس کو خیالات کے بھور سے باہر نکال لائی۔ اس نے قدرے چونک کر اسے دیکھ کر پھر سر جھٹک کر ٹرائی تھام لی۔

"اے بچے بڑی میٹا! یہ کیا لڑکوں کی طرح جو گرز پٹے پھرتی ہو؟ کوئی سنڈل یا ٹیکل والی جوتی پہنا کر۔" جائے کے ساتھ موند دیکر لوازمات اپنی پلیٹ میں بھرتے ہوئے پچھو نے ہر بار کی طرح اس کے جو گرز پر اعتراض کیا۔

"اور کیا سوہ پریل والی سینڈل ہی پہن لیں جو تمہیں سیف بھائی نے لے کر دی تھی۔" ندا آیا اپنے بچوں کو ایک کھلاتے ہوئے بولیں۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ سیف کی پسند اس سے بہت مختلف تھی وہ شوخ رنگ اور ظاہری چمک دمک کو دیکھا تھا جبکہ وہ سوٹ کلرز اور کوالٹی کو ترجیح دیتی تھی۔

"جی بہتر۔" وہ سر جھکاتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گئی اسے علم تھا کہ وہ دونوں جب تک بیٹھی رہیں گی ان کے اعتراضات ختم نہیں ہوں گے۔

آٹھ بجے تک جہانزیب صاحب بھی آگئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے روشن اور سنی۔ کو خوب پیار کیا مگر ان کی زندگی میں ساری رونق ان ہی

لوگوں سے تھی۔ ان کے سامنے ان کی ٹون بدل جایا کرتی تھی۔

”پری اوجید کو کہہ کر اچھا سا کھانا بنوانا۔ کڑا ہی بریانی کچھ اور بھی ایڈ کر لینا۔“ انہوں نے آہستہ سے پریشے کو ہدایت دی۔ اس کا دل چاہا کہ کہہ دے۔

”ایسا! یہ لوگ روز تو یہاں کھانا کھاتے ہیں پھر ہر روز کا اہتمام کیوں؟“ مگر وہ جانتی تھی، بابا ان لوگوں کو کتنا عزیز رکھتے ہیں سو وہ ان کو باتیں کرنا چھوڑ کر خود کچن میں آگئی۔

پھپھو کی فیملی ہر دوسری شام یہیں ہوتی تھی اور اسے کبھی بھی اتنی کوفت نہیں ہوتی تھی جتنی آج ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج نشاء نے اسے برسوں پرانی ایک بھولی

بہن کی بات یاد دلادی تھی۔ پرانی یادیں۔۔۔ ٹوٹے خواب، بکھرے سنے ہر انسان کو تھکا دیتے ہیں، اس پر بھی عجیب سی تنگن اور بیزاری طاری ہو رہی تھی۔

”ماما میں یہ کھالوں؟“ نوسالہ روشن۔۔۔ قریح کا دروازہ کھول کر پیٹ بستر کا چار نکال کر دے گا تو آواز آئی۔

”ہاں کھالو بیٹا تمہارے ماما کا گھر ہے۔“ ندا آتے ہی والدہ کی آواز آئی۔ جس نے ملا کیمین پکھن بنانے کے لیے اتنا بڑا چار منگوایا تھا، بے بسی سے مٹھیاں پھینک کر کہہ گئی۔

”وہ روشن اور سنی کو ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔“

سنی پورے گھر میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ اسے کوفت ہو رہی تھی مگر وہ خاموش رہی۔ پھر چند منٹ بعد جب وہ چاولوں کو دم دے رہی تھی، اسے بلی کی وحشانہ میاؤں، آؤں کی آواز آئی۔

”یا اللہ!“ اس نے گھبرا کر کفگیر میز پر رکھا اور بھاگتی ہوئی کچن سے باہر نکلی، باہر زمین پر اس کی پالتو بلی کو روشن نے پکڑ رکھا تھا جبکہ سنی اس کی دم کو ماچس کی تیلی سے آگ لگا رہا تھا۔ بلی تڑپتی ہوئی چیخ رہی تھی۔

”ہٹو تم دونوں۔“ اس نے زور سے سنی کے ماچس والے ہاتھ پر تھپڑ مارا، بلی کو روشن سے کھینچا اور ماچس کی ڈبی اٹھا کر اپنے پیٹے میں کر لی۔ ”یہ کیا کر رہے تھے تم لوگ؟“

”آپ کو کیا مسئلہ ہے، جو بھی کر رہے تھے ہماری مرضی۔ ہمارے نانا کا گھر ہے۔ آپ کون ہوتی ہیں پوچھنے والی؟“ سنی کو تھپڑ لگا تھا، جس کا جواب اس نے بے حد

بد تمیزی سے دیا تھا۔

پورے دن کی کوفت، بے زاری، نشاء کی آخری کھانسی پھپھو اور ندا آپا کے طنز اور طعنے، ان دونوں کی بد تمیزیاں اس نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا مگر سنی کی بد تمیزی پر اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے رکھ کر دو پھپھو کی

اور دو روشن کو لگائے۔

”دفع ہو جاؤ ادھر سے تم دونوں۔“ چیختی روئی بلی کو اپنی آغوش میں سہلاتے ہوئے، اس نے عیسے سے کہا اور واپس کچن میں آگئی۔

وہ دونوں حلق پھاڑ کر روتے ہوئے ندا آپا کے پاس چلے گئے۔ عین اسی وقت سیف بھی آگیا۔ وہ آفس سے سیدھا ادھر ہی آیا تھا اور اس کا کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھر اس لیے نہیں گیا تھا کہ اسے علم تھا گھر میں کھانا نہیں بنا ہوگا۔

”کیا مارے؟ کس نے مارا ہے؟“ ندا آپا نے ان دونوں کو روک دیکھ کر اسان سر پر اٹھالیا۔ تمام ڈرامے کی آوازیں کچن میں، کچن سن سکتی تھیں اس کی کوفت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”پری آپا نے مارا ہے۔ بال بھی کھینچے ہیں اور منہ پر تھپڑ بھی مارا ہے۔“ روشن جلاتے ہوئے بتا رہا تھا۔ بد تمیزی سے کچن سے نکلی، بلی اس کی آغوش سے پھٹک لگا۔

”کودی اور بھاگتی ہوئی کچن سے باہر چلی گئی۔“

”ہائے اللہ پری! تم نے میرے تمام بچوں کو روک پیٹ ڈالا؟ ماموں! میں نے تو کبھی ان کو زور سے جھڑکا نہیں ہے۔“ ندا آپا اس کو دیکھتے ہی ادبچی آواز میں روئے لگیں۔

”یہ دونوں سنی کی آگ لگا کر مار رہے تھے۔ میں نے روکا تو سنی نے مجھ سے بد تمیزی کی، میں نے صرف تھپڑ مارا تھا، بال نہیں نوچے تھے۔“ کسی مجرم کی طرح کھڑی وہ صفائیاں دے رہی تھی۔

”لو! اتنے چھوٹے بچے بلی کو آگ لگا سکتے ہیں؟ انہیں تو ماچس بھی جلانا نہیں آتی۔“ پھپھو چمک کر بولی تھیں۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی پھپھو! یہ دونوں اس بلی کو اذیت دے رہے تھے۔“

”تمہیں اپنے بھانجوں سے زیادہ کسی جانور سے پیار ہے؟ یہ بچے ہیں، کچھ کر بھی دیا تو آرام سے بھی ٹوکا جاسکتا ہے پری!“

اب کے سیف بولا تھا۔ سیف اس کی حمایت تو کیا کرتا

اس نے تو اس کا یقین تک نہیں کیا تھا کہ اس نے روشن اور سنی کے بال نہیں نوچے تھے۔

”اچھا پری! اب سوری کر لو ان دونوں سے۔“ یہ پایا تھے، اس نے بے حد شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔ کسی کو بھی اس کی بات کا یقین نہ تھا۔

”ایسا! میں بڑی ہوں، میں نے کچھ کہہ بھی دیا تو آپ سب لوگ اس طرح کیوں ری ایکٹ کر رہے ہیں؟“

”پری! تم بچوں اور ندا آپا سے سوری کرو۔ دیکھو، آپ ابھی تک رو رہی ہیں۔“ سیف نے بہت سنجیدگی اور غفلت سے اسے مخاطب کیا۔

اس کا دل چاہا، وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر رونا شروع کر دے مگر اسے ضبط کرنا تھا، خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا تھا۔

”میری کوئی غلطی نہیں، پھر بھی ندا آپا سوری!“ ندا آپا نے منہ پھیر لیا، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی تک خفا تھیں۔

”میں کھانا لگواتی ہوں۔“ وہ وہاں سے چلی آئی، وحید کو کھانا لگانے کا کہا اور خود کچن میں بیٹھ گئی۔ جب تک وہ لوگ چلے نہ گئے، وہ باہر نہیں نکلی۔ اسے اپنے بے عزتی پر شکوہ ان لوگوں سے نہیں پایا تھا۔ پتا نہیں پھپھو نے بابا کو کیا گھول کر پلایا تھا کہ وہ کبھی ان کے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

”کیا میں اپنی پوری زندگی ان لوگوں کے درمیان گزار سکتی ہوں؟ اف۔۔۔۔۔ یہ کتنا کھن ہو گا!“ یہ ٹکلف وہ خیال اس کے دل سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔

”کدھر گم ہو؟“ نشاء نے کچن کے دروازے میں سے سر نکال کر جھانکا تو وہ چوٹکی پھر زبردستی مسکرا دی۔

”میں تو یہیں ہوں۔ تم کو، میرے کپڑے لے آئی ہو؟“

”ہاں، تمہارے کمرے میں رکھ دیے ہیں۔ مہمان چلے گئے تمہارے؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پریشے کھڑی ہو گئی۔

”ہاں چلے گئے، آؤ باہر بیٹھتے ہیں۔“ نشاء کو دیکھ کر اس کا ڈپریشن قدرے کم ہوا تھا۔ وہ دونوں ان کپڑوں کے متعلق باتیں کرتی لاؤنج میں آئیں تو جہاں سب صاحب کو وہیں بیٹھ بیٹھا۔

”آنکل! مہی کہہ رہی تھیں کہ سیف بھائی کی امی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آئیں گی، کب آئیں گی وہ؟“ نشاء

کی ان سے بہت بے تکلفی تھی اور وہ بھی بہت بولندہ ہر بات پر چھ لیا کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا آج پچھو اس کے لیے آگے نہیں پھر بھی اس نے پوچھا پریشہ کے لبوں کے مسکراہٹ بکھر گئی۔

”بیٹا! ڈیٹ تو تقریباً“ فکس ہو گئی ہے۔ عید نو مہر کے پہلے جتنے میں آ رہی ہے تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ عید کے میرے دن مندی رکھ لیں گے۔“ وہ خوش دلی سے بتا رہے تھے۔ اس کو اپنی گردن کے گرد پھنکرا ٹنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا ایک دم کمرے میں اتنی ٹھنک ہو گئی تھی کہ اس کا سانس رکے لگا۔

”نشاء!“ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ”حبیب اور اس کے دوست ہنزہ جا رہے ہیں نا؟ تم نے آج کچھ بتایا تھا؟“

”ہاں وہ راکا پوٹھی میں ٹیمپ کا ٹریک کر رہے ہیں۔“

”تو کون کہاں جا رہا ہے؟“ ان کی سرگوشیاں وہ تھیک سے سن نہیں سکے تھے۔

”پاپا! وہ۔۔۔ نشاء کے ایک کزن کی اپنی ٹور سکلٹی ہے مری میں آئے۔ ان سے تار دیا اور ان کے ٹور ڈیوٹ لیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جلد ہی ان کا کوئی ٹور چلے گا نا اور ان کو لایا گیا تھا۔ نشاء کے ساتھ چل جاؤں؟“ اس نے ہن ہن ہن کر دیا۔

”مگر وہ تو بہت بھرے لیے مٹکے تمہاری وجہ سے تکی ہے۔ اس کی تھک کا کوئی مسئلہ تھا تو اس کی سانس اور شوہر چند دنوں کے لیے سیالکوٹ گئے ہیں۔ وہ اگلا پورا ہفتہ اوھر آگئی کہ تمہارے ساتھ مل کر شادی کی شاپنگ کر لے گی۔“

وہ سوچ رہی تھی کہ چند دنوں تک کسی دور دراز پر قضا مقام پر چلی جائے مگر جیسے ہی پاپا نے ندا آگیا کی ایک ہفتے کی چھٹی گتایا اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ جلد ہی اسلام آباد سے پورے ہفتے کے لیے غائب ہو جائے گی۔ وہ کسی کے ساتھ بھی شاپنگ کر سکتی تھی مگر ندا آگیا کے ساتھ نہیں۔

”پاپا! سدا آگیا کی جوا اس بہت اچھی ہے، وہ خود ہی شاپنگ کر لیں گی۔ میں بس پانچ چھ روز میں واپس آ جاؤں گی۔“ اس نے بہت منت اور لجاجت سے کہا۔

”آہ۔۔۔ اچھا مگر کس جگہ جانا چاہتی ہو تم؟“ وہ نیم رضا مند تھے۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی کہ ہنزہ، گلگت، اسکرو، مگر اسے معلوم تھا کہ ان علاقوں کا نام سن کر پاپا سختی سے انکار کریں گے۔

”پشاور، سوات، کلام۔۔۔ اسی سائیڈ پر جائیں گے۔“

اس نے سوات کا ذکر اس لیے کیا کہ وہاں کوئی اچالی فٹ بلند پہاڑ تھا اور یہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ پاپا اگلے ہی گئے اسے اجازت دے دی۔

اس نے بے اختیار ایک چورنگا اپنے ہاتھیں کندھے ڈالی۔ صرف اس کندھے کی وجہ سے وہ اسکو روک سکتا تھا۔ اور قراقرم کے پہاڑوں میں نہیں جاسکتی تھی۔

جہانزیب صاحب اٹھ کر اندر چلے گئے تو نشاء نے مری کی طرف مڑی۔ ”میں نے کب بتایا تھا زار بھالی ٹور لینے سے؟“

”نہیں کیا تو اب کر لیتا۔“ اس نے لاپرواہی سے اشارے اچکائے ندا آپا پس پھلی کی آمد کے باعث چند لمحوں پہلے تک اس کے سر میں جو درد کی فیسیں اٹھ رہی تھیں وہ اب غائب ہو چکی تھیں۔

”تم اسلام آباد کی کسی ٹور کمپنی کا نام نہیں لے سکتی تھیں؟ اب اسے چھوٹ کو سچ بتا کر مری لے جاؤ گا اور اگر اس سے اتنی شہادت دے رہا ہے پھر پاپا نے کاتھ خیمہ اور ان کے فریڈو کے ساتھ راکا پوٹھی چلے جاتے ہیں۔“

”جس کی اجازت پاپا مجھے کبھی نہیں دیں گے اور حبیب کے دوست؟“ اس کی نگاہوں کے سامنے شام والا وہ لڑکا آ گیا۔ جس نے اس کو دیکھ کر بے اختیار سنبھل کر رہ گیا۔ اس کے سر سے سر جھٹکا۔ ”میں حبیب کے دوستوں کا سر پھاڑ سکتی ہوں، ان کے ساتھ چار دن پیدل راکا پوٹھی کا ٹریک نہیں کر سکتی۔“ اس کو وہ لڑکا بہت ہی برا لگا تھا نشاء خاموش ہو گئی۔

نشاء کے کمرے میں حبیب اب بھی سو رہا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ پانگ نظر آتا تھا جس کے سر ہانے دیو اور پر ”تومازیمو مر“ کا بہت بڑا پوسٹر چسپاں تھا۔ کمرے کی باقی زمین دیواروں میں سے دوپر ”میسز“ اور چند خیالی کوہ پتاؤں کے پوسٹرز آویزاں تھے ان تصویروں کو دیکھتے ہی ایک اور اس مسکین نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

پریشہ جمال زیب جس کے نام کا آخری حصہ ”شے“ ہٹا کر سب اس کو ”پری“ کہا کرتے تھے۔ بچپن سے ہی ایک ایکڑ سلسلے تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی کہ جن

کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا جن کو چیلنج کا سامنا کرنے میں مزا آتا ہے۔ سیف سے منگنی سے پہلے تک وہ واقعی بہت پرہوش تھی مگر ان گزرے چار برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔

اسی کو بچپن سے پہاڑ سر کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے پاپا اور ماما کی اگلی اولاد ہونے کے باعث خاصی لادلی تھی۔ ان کے لاد چار نے اس کو لگا ڈالیں، بلکہ بہت بہادر مضبوط اور پراعتاد بنا دیا تھا۔ اس کی ماما کو اس کا کوہ پائی کا شوق بہت عزیز تھا اور یہ سب سے بڑی وجہ تھی جس کے باعث ماما اس کو 1995ء میں اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئی تھیں۔ پاپا نے اس کی وجہ سے اپنے پرنس بھی اوہری کھٹل کر دیا تھا مگر وہ لندن میں ہوتے تھے اور ماما اور پریشہ ایک ڈسٹرکٹ میں۔

چار برس ایک ڈسٹرکٹ میں رہی وہاں اس نے بہت کچھ سیکھا اور میان میں صرف دو دفعہ وہ پاکستان آئی تھی۔ وہ مریوں کی چھٹیوں میں۔ کیونکہ مریوں کی پٹھانیاں وہ کمرے میں لے آتی تھیں یہ اس کا ایک مین ایج میکرت تھا جس کی بھانجی کو پاپا کو پر جاتی تو وہ بہت فضا ہوتے۔ (البتہ ماما واقف نہیں) اور ان دنوں پاپا اسے اپنے سے آٹھ سو سال بڑا سینئر واپس لوگ بہت برا لگتا تھا۔ وہ اس کے پاپا سے بہت ڈرتا تھا پاپا اور اس کی عجیب نگاہوں سے ٹکاتا تھا۔ اس نے اس کی اچھلتی پھرتی نہیں نہ باتیں۔ اس نے وہ دفعہ بہت سے جیسے ”تم بہت خوب صورت ہو۔“ کہنے کی کوشش کی تھی مگر وہاں سے نہ ہوا تھا۔

چھ سال پہلے وہ کسی حد تک سہول کی وجہ سے ماما کی وفات ہو گئی اور بچھو کے بعد اصرار پاپا اسے اسلام آباد لے گئے۔ اس نے اسے احساس ہوا کہ وہ۔۔۔

ماں اس کی بیٹی بڑی اور مضبوط ڈھال تھیں جس کے نہ ہونے سے پاپا پر اور لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

وہ پرنس بڑھتا چاہتی تھی مگر چھوٹے پاپا کو مجبور کیا کہ وہ پریشہ کو ڈاکٹر بنائیں۔ پوپا اس کا ایک سال ضائع ہو گیا مگر وہ میڈیکل میں بیچ ہی گئی۔

پھر 2001ء کے جولائی میں کچھ ایسا ہوا کہ اس کا کوہ پائی کا کیر ختم ہو گیا۔ سیالنگ کے ناقابل فراموش حادثے کے بعد پاپا نے اس کی کوہ پائی پر پابندی لگا دی تو اس نے خاموشی سے ان کا فیصلہ مان لیا۔ اگلے سال پاپا نے اسے بتایا کہ انہوں نے اس کا رشتہ سیف سے طے کر دیا

ہے ”اسے کوئی اعتراض تو نہیں“ تب بھی اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا ہاں تب اس نے ایک دفعہ اس کے متعلق ضرور سوچا تھا جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔

ایک ڈسٹرکٹ جانے سے پہلے وہ ایک خوابوں میں رہنے والی کم عمر لادرواسی لڑکی تھی۔ جس کے ”ایڈیڈلرم“ نے اسے ایک زندگی بھر چھاس کی طرح جھٹے والا خواب دیا تھا۔ اس اچھلی کا آپس کا انتظار ہر لڑکی کرتی ہے۔

اس نے برسوں پہلے نشاء کو بتایا تھا۔

”تمہیں یاد ہے ہم فیملی فیلڈ میں پرستان کی ایک پری کا قصہ بڑھا کرتے تھے جس کا ظالم دیو نے قید کر رکھا تھا اور پھر اسے چھڑانے ایک شہزادہ آیا تھا۔ سفید گھوڑے پر سوار، بھورے بالوں اور شہر رنگ آنکھوں والا گھڑ سوار وہ دیس دیس کی خاک چھانتا پرستان کی خوب صورت وادیوں کے قہقہے سن کر اس طرف آگیا تھا پری کی قید کا سنا تو وہ ہلاد شہزادہ اسے ظالم دیو کے پاس سے چھڑا کر خوب صورت وادیوں، چشموں اور پہاڑوں میں اپنے ہمراہ لے گیا اور پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔“ اس نے ایک گہری سانس بھر کر نشاء کو دیکھا تھا۔ ”کاش میرے لیے بھی ایک ایسا ہی شخص آئے شہزادوں کی ہی آن بان رکھنے والا ہمارا اور مضبوط ظاہر بہت کے بچاریوں جیسا نہ ہو۔“

یہ کوئی کچی عمر کا سینا نہیں تھا، ایک امید تھی، ایک وجدان تھا کہ کوئی ہے جسے اس کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ جو دیس دیس کی خاک چھانتا کسی روز اس کے پرستان میں آئے گا جس کو دیکھ کر اس کا دل کے گا کہ ہاں ظالم دیو کی قید میں موجود اس پری نے صدیوں اسی کا تو انتظار کیا تھا۔

ہاں یہی تو ہے جس سے اس نے روتے روتے وجود میں آنے سے قبل عشق کیا تھا جو اس کی ذات کا نوٹ کر بکھرنے والا ایک گمشدہ حصہ تھا۔

اور ہاں وہ یہ بھی تو جانتی تھی کہ ”اگر میں پریوں کی ہی طرح حسین ہوں تو پونہی کسی سے شادی نہیں کروں گی بلکہ وہ جیسے پریاں اور شہزادیاں شرارت رکھا کرتی تھیں نا“ سات سوالوں کی شرط، سامری جاو کر کے سنے کی شرط، ایسی ہی شرط رکھوں گی۔“ تو نشاء نے سب سے حد تجسس سے پوچھا تھا کہ ”کیسی شرط؟“

تب وہ کھکھلا کر بولی تھی۔ ”میں صرف اس کا ہاتھ تھاموں گی جو میرے لیے دنیا کا سب سے خوب صورت پہاڑ راکا پوٹھی سر کرے گا۔“

آیا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ ان کے قریب آیا اسے احساس ہوا کہ وہ اس سے خاصا لبا تھا۔

"وہ سمجھ رہا تھا میں اس کا گھوڑا لے کر بھاگ گیا ہوں۔" ان کے قریب آکر وہ ہستے ہوئے چلا رہا تھا۔ ہستے ہوئے اس کی شد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ اندازہ نہ کر سکی کہ وہ ہستے ہوئے زیادہ پر تشش لگتا ہے کہ لب بھیجے۔

"تم اتنے خطرناک طریقے سے رائیڈنگ کیوں کر رہتے تھے؟" نشاء کو بزرگی بھاڑنے کا شوق تھا سو اس کو اس لاپرواہی پر ڈانٹتا اس نے اپنا فرض سمجھا۔

"میڈم! میں پانچ سال کی عمر سے رائیڈنگ کر رہا ہوں اور گھوڑوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔ وہ اور نشاء سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ واک کرنے لگے۔ پریشے وہیں کھڑی رہی۔ دفعہ "اسے کمرے کا خیال آیا۔

"سنو! ان دونوں نے مز کرنا چھوڑ دیکھا۔" "تمہارا کمرہ؟" اس نے قدرے زور سے کمرہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"سنو! تمہیں یوں اپنا اتنا قیمتی کمرہ دے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں اسے لے کر بھاگ جاتی تو؟" وہ پھر مسکرایا۔ "مجھے پتہ تھا تم ایسا نہ کر سکتے۔" جینے پر ہاتھ پاندھے وہ اس کے سینے سے اٹھ ا ہوا۔

"اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارا کمرہ لے کر بھاگ چکا ہوتا۔" "تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کمرہ ہرگز نہ دیتا۔" وہ مسکراہٹ دیا۔ بہت سنجیدگی سے بولا۔

"ہو نہ! وہ اس کے اس انداز پر سر جھٹک کر دوسری جانب مال پر پھیلی دکانوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ وہاں رش اب بڑھتا جا رہا تھا۔

نشاء نے اس "بد تمیزی" پر اسے گھورا بھی مگر وہ تو اس کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ گھڑ سوار نے گردن جھکا کر کمرے کی اسکرین پر نگاہ ڈالی اور زرب لب مسکرایا۔

"اچھی تصویر کھینچنے کا شکریہ۔" تصویر دیکھ کر اس نے سزا خاستے ہوئے کہا اور کمرہ کو ریش ڈال دیا۔ وہ پھر مغرور نظر آنے کی اداکاری کرتی جواب دیے بنا دکانوں کو دیکھتی رہی۔

رہی۔

"تم اس تصویر کا کیا کرو گے؟" اس کے اہل اس کم کرنے کے لیے نشاء نے بہت دستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

"میں نہیں پرس بعد ایک سفر نامہ لکھوں گا۔" فرٹ پر یہ تصویر لگاؤں گا۔" "اور اس تصویر کا کپشن کیا ہو گا؟" نشاء نے اسے پوچھا۔

"میں اس کے نیچے لکھوں گا۔" اس کوہ نیکی تصویر راکا پوشی سر کرنے جا رہا تھا۔ "وہ غر سے بنا رہا تھا۔" پریشے نے تیزی سے گردن کھٹا کر اسے دیکھا۔

شاگ سا لگا تھا۔ "تم راکا پوشی سر کرنے جا رہے ہو؟" بے اختیار پوچھ لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس کو کوئی تعلق ظاہر کرنا تھا اسے پچھتاوا ہوا۔

"ہاں۔" پریشے کی بے ساختگی اس نے پرانی سے اپنی مسکراہٹ صبا لکھی تھی۔ "تم راکا پوشی سر کرنے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

ایورسٹ یا سنے ٹوپر کرنا اصل کامیابی ہے۔ "کہہ کر وہ اس سے دانتوں کو دیکھنے لگی۔

"ویسے کل ہم لوگ ایک نور کینی کے ساتھ کلام جا رہے ہیں۔" نشاء کے حلق پر اس نے آنکھیں سکوڑ کر مائل طرف دیکھا۔ سن شان ٹریوٹر کا دفتر سامنے ہی تھا۔ اس نے جیسے ایک لمحے کو سوچا پھر بولا۔

"میں بھی کل کلام جا رہا ہوں۔" سن شان ٹریوٹر کے ساتھ تم کمرے کے ساتھ اسے پوچھا۔ "پریشے کو کچھ شک سا ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے تمہاری دوست بھی جا رہی ہے کیا؟" مسکراہٹ یوں تلے دیائے اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔ پریشے نے سر قدرے مزید موڑ لیا۔

"ہاں مگر تمہیں کیسے پتہ یہ میری دوست ہے؟" "بہت آسان۔۔۔ وہ خوب صورت ہے۔" اس کے سنجیدہ انداز پر نشاء ہنس پڑی، جبکہ پریشے کے ہاتھ پر ناگواری کی شکن ابھری تھی۔

میں نشاء ہوں۔ نشاء سعید اور یہ میری کزن کم دوست۔" اکثر پریشے جھانزب۔

"پاری شے؟" اس نے اپنے پورین لب و لہجے میں کامیاب دہرایا۔

"پاری شے نہیں پڑی۔۔۔ شے۔" "میرے نام کے نیچے کیوں پڑ گئی ہو؟" نشاء نے خود کو یوں ہنسوتے دیکھ کر وہ تنگ کرارہ نہیں ہوئی۔

"یہ مینرز کے خلاف ہے۔ تم دونوں کو میری موجودگی میں اپنی زبان میں بات نہیں کرنی چاہیے۔" وہ مسلسل پریشے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک تو کمبخت بلا کا بیٹا سم تھا اور اسے اتنے خوب صورت انداز میں آنکھیں کھیل کر دیکھتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ کنبیوڑ ہونے لگی۔

"مطلب کیا ہوا تمہاری کزن کے نام کا؟" "میری چھوڑی۔ یہ ایران کی ایک شہزادی کا نام تھا۔" "کیسے تو میں اس کو پری کہتی ہوں۔"

"تمہاری کزن پر سوٹ بھی کرتا ہے۔ پری مطلب فیری؟" ہماری زبان میں بھی فیری کو پری کہا جاتا ہے۔" "تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"میری بائیں اتنی ارسلان ہوں۔ تری سے آیا ہوں۔" "ویسے تم کے لحاظ سے انجینئر ہوں مگر ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار کارکن بھی ہوں۔ تمہارے پاکستان میں دنیا کے سے خوب صورت راکا پوشی کے لیے آیا ہوں۔" اس نے تنگ تنگ تعارف دیا۔

"اور تم لوگ کیا کرتی ہو؟" "میں گاڑی کی خرید و بیچ کرتی ہوں۔" "تو چلو۔" قدرے سے سے کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی گاڑی کی طرف آگئی۔ غلٹ میں اتنی ارسلان کو خدا حافظ کہہ کر نشاء دوڑتے قدموں کے ساتھ اس تک پہنچی تھی۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے نشی؟ نہ جان نہ پہچان، خواہ مخواہ کسی اجنبی وہ بھی گورے کے ساتھ یوں سر راہ کیس لگانے کا قصہ؟" ڈرائیوگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ نشاء پر پرس پڑی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر وہ ترک سیاح ان سفید چوگور بلاکس کے ساتھ ابھی تک کھڑا تھا۔ دفعہ "اس نے پری کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا، جسے اس نے نظر انداز کر دیا۔

"بھئی میرا مسلمان بھائی ہے، ایک برادر اسلامی ملک میں نشاء ہوں۔ نشاء سعید اور یہ میری کزن کم دوست۔" اکثر پریشے جھانزب۔

"پاری شے؟" اس نے اپنے پورین لب و لہجے میں کامیاب دہرایا۔

سے آیا ہے ہمارا مسلمان ہے، میرا اسلامی فریضہ ہے کہ میں میزبانی نبھائوں۔"

"اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہیں۔ مسلمان لڑکی!" گاڑی واپس اسلام آباد کے رستے پر ڈالتے ہوئے اس نے دانت پیسے تھے۔ "کیا ہم اب کسی اور ٹور کمپنی کے ساتھ نہ چلے جائیں؟"

"اس بات کا تو ذکر ہی مت کرنا۔ اگر ہم اس ٹور کمپنی کے ساتھ نہیں جائیں گے تو پھر بالکل نہیں جائیں گے!" نشاء نے بڑے اطمینان سے فیصلہ شادیا۔ وہ خاموش رہا ڈرائیوگ کرتی رہی۔ آٹھ دن بعد آپا کے ساتھ یا آٹھ دن اس ترک سیاح کے ساتھ؟ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کیونکہ بڑا آپا کے ساتھ آٹھ دن گزارنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ نشاء کو ڈراپ کر کے گھر آئی تو فون بج رہا تھا۔ اس نے کیڑیل پر دھرا ریسور اٹھایا۔ "ہیلو؟" "تم اپنی کزن کے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟" ناگواری بھرا باز پرس کرنے والا لہجہ تھا سیف کا۔

"کلام۔ اور بھی لوگ جا رہے ہیں۔" "ماسوں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہیں کیسے اسکیل جانے کی اجازت دے دی؟ کیا اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں دور افتادہ علاقوں میں باپ بھائی کے بغیر سڑکیں تا پتی پھریں گی؟" وہ اس سے واضح طور پر ناراض تھا۔

"یانا نے مجھے اجازت دے دی ہے سیف! ایک نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے اس خیال نے اسے تھکا دیا تھا۔ "مگر میں کہہ رہا ہوں کہ تم یوں نہیں جاؤ گی۔ تم اپنی کزن کو منع کر دو۔" "تھم بھرا انداز۔ وہ بے بسی سے لب کاٹ کر رہ گئی۔

"ہم اسکول میں بھی تو ٹورز کے ساتھ چلے جاتے تھے، ایک قابل اعتماد ٹریول ایجنسی کے ساتھ۔" "یہ بونے نہیں ہے پریشے! اس کا انداز تو ٹوک تھا۔

"بس تم اپنی کزن کو منع کر دو۔" "اٹھا۔" پریشے نے فون رکھ دیا۔ چند لمحے آزدگی سے اسے دیکھتی رہی پھر نشاء کا نمبر ہلایا۔

"میری آواز سے بغیر چین نہیں آ رہا جو گھر پہنچے ہی فون کھڑکاری ہو؟" "نشاء! میں کلام نہ جاؤں تو؟"

نشاء ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی۔ "پری! وہ کچھ دیر بعد

بولی۔ ”وہ ایک اچھا انسان ہے، تم اس کے ساتھ ان کمفر ٹیبل قتل نہیں کرو گی۔ بلوی پریسا“
”نہیں نشاء! سیف نے منع کیا ہے۔“

”واٹ دی ہیل؟“ اس کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔ ”وہ ہوتا کون ہے تمہیں منع کرنے والا؟ میں تو ابھی تک تمہاری منگنی کو یہی قبول نہیں کر سکی تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہو ہی نہیں، لیکن تم نے شاید شادی سے پہلے ہی اس کی غلامی قبول کر لی ہے۔ ٹھیک ہے، فائن! میں یونہی تمہاری لیے ہلکان ہوتی ہوں۔ جہنم میں جاؤ تم، جہنم میں جائے سیف اور جہنم میں جائے افق ارسلان۔“

ایک پڑمردہ مسکراہٹ پریشے کے لبوں پر بکھر گئی۔
”میں نے اس کی غلامی قبول نہیں کی۔ اور سنو، میں نے پروگرام بھی کینسل نہیں کیا، لیکن اگر تم نے میرے نام کے ساتھ افق کا نام پھر لیا تو میں پروگرام کینسل کر ہی دوں گی۔“ مزید کچھ کہے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔
اسے سیف کے کئے کی پروا نہ تھی۔ کالام سے واپسی کے بعد اس کی اس سے شادی ہو ہی چکی تھی۔ دل کے سب مرہی جانا تھا اور شاید سیف جیسے انسان کے ساتھ زندگی کی شروعات کرنے کے بعد اسے کسی کی بھی پروا نہ رہے۔
دھک کی نہ خوشی کی۔ شاید تب وہ بے حس ہو جائے، مگر اس بے حس کے دور کے شروع ہونے سے قبل صرف اچھا دن وہ زندگی کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔



اتوار 24 جولائی 2009

پاپا کی ڈھیر ساری دعاؤں نے کروہ گھر کے گیٹ سے باہر کھڑی ٹور کپنی کی بس میں چڑھ گئی۔ ان کا گائیڈ کم ڈرامیور ظفر اس کا سامان لوڈ کر کے ڈرامیونگ سیٹ پر آگیا۔

بس میں اسے چار انجان چہرے دکھائی دیے تھے۔ وہ ایک نسبتاً ”چھلی سیٹ پر کھڑکی کی طرف بیٹھ گئی۔ نشاء یا وہ ترک سیاح ابھی تک نہیں آئے تھے۔

کھلے شیشے سے آتی ٹھنڈی ہوا اس کی آنکھوں کو بند کر رہی تھی۔ اس نے شیشہ بند کر دیا اور لیٹرز میں کئے سیاہ بالوں کو اوپچی پونی ٹیل میں باندھا۔

دفعۃً اسے دوسرے مسافروں کا خیال آیا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ ان پر ڈالی۔ اس کے بائیں طرف والی نشستوں کی قطار میں اس کے برابر ایک کم عمر لڑکی بیٹھی تھی۔

عمر بمشکل بیس ایکس سال کندھوں سے اوپر آتے کھلے بال جو اتھے پر بینڈز کی صورت میں کٹے تھے گوری رنگت۔ وہ محویت سے سڑک کے کنارے بھاگتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سفید ٹراؤزر اور گھٹنوں تک آنکھیں پہن رکھا تھا اور پاؤں میں سینڈل تھے۔

دوسرے مسافروں میں ایک پچاس پچپن سالہ انکل تھے، غالباً ”کوئی رٹائرڈ افسر“ یا ”کوئی امیر بزنس مین۔“ خاتہ گریس فل سے تھے۔ وہ سب سے اگلی سیٹ پر براہمن تھے۔

ان کے علاوہ ایک کپل تھا۔ ہوی قدرے کرخت اور نلک چڑھی سی لگی تھی، ”میاں“ ”بیبا“ ساتھ۔ پریشے کو تو یہ شناسی سے گہری دلچسپی تھی۔

”صبح چھ بجے کوئی وقت ہے جانے کا؟ مجھے سونے بھی نہیں دیا۔“ نشاء اس کے مقابل آکر بیٹھی تو بیس جو نشاء کو پک کرنے لگی تھی، پھر چل پڑی۔

سو جاؤ، لمبا سفر ہے۔“ اس نے نشاء کی خواہش کو انہیں دیکھ کر کہا۔

ظفر نے اپنا آخری مسافر ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل سے اٹھایا تھا۔ وہ بس میں داخل ہوا اور پریشے کی بات بات کے برسر ان دونوں کی جانب آنے کے بجائے ”ریجنل“ ”حب“ کے ساتھ والی خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے تو گریٹنگز جیسے سے مسافر دونوں کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔

کافی آگے بیٹھا ہوا تھا اور وہ بھی بائیں قطار میں سو وہ اس کا محض دایاں کندھا بازو اور سر ہی دیکھنے سے دیکھ سکتی تھی۔ لائٹ براؤن شرٹ، سفید جینٹ، کلا والی سیلو لیس ہلکی سی ٹورسٹ جیکٹ، گردن میں مفلر، پاؤں میں جو گرز وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بالوں اس کے سر پر ایک پی کیپ بھی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھ رہی پھر نشاء کی طرح سو گئی۔

کوئی دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ لوگ ابھی حالت سفر میں تھے۔ نشاء جاگ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ نظروں سے افق کو دیکھا، وہ اپنے سیل فون کے ہنڈس کھیل رہا تھا۔

”سنو پری! تمہیں یہ شخص اچھا نہیں لگا؟“
”نہیں، اور میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتی۔“
کے باہر دیکھنے لگی۔

"مگر میں کرنا چاہتی ہوں۔" نشاء بھند تھی۔

"ٹھیک ہے پھر جا کر اسی کے پاس بیٹھ جاؤ۔"

بقیہ سارا راستہ خاموشی سے گناؤں جڑھے پس پشاور کی حدود میں داخل ہوئی سڑکوں پر خاصا رش تھا۔ اوپر سے اپنے دونوں پر چمکتا سورج شہر کو جھلسا رہا تھا۔

"کتنی گرمی ہے یہاں حالانکہ پشاور پہاڑوں پر واقع ہے۔"

یار اس سے ٹھنڈا تو دھارا اسلام آباد تھا۔ "نشاء کو اپنا شہر یاد آیا۔"

ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں ان کی بکنگ ڈور کھینچی گئی تھی۔ اس ہوٹل کے باہر تنگ سی سڑک پر بے شمار شیشے کے سڑک کے اچھے خاصے حصے پر لڑائی والوں کا قبضہ تھا۔ گاڑی ایک ڈھلوان پر چڑھ کر ہوٹل کے پار تنگ ایریا تک آئی۔ وہاں گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

"ٹائٹ بیڈ!" بس سے نکل کر نشاء نے سہرا کیا۔ پری ہوٹل کی بلند عمارت کو دیکھنے کے بجائے اس سکون کو محسوس کر رہی تھی جو اتنی دیر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کے بعد کھڑے ہو کر اس کی ٹانگوں کو ملا تھا۔

ٹرک سیاہ ان دونوں سے فاصلے پر کھڑا سفید جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، آنکھیں سنبھلے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا اس کو اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرایا پریشہ نے نگاہوں کا رخ پھیر لیا۔

"ہیلو گراؤز! کیسی ہو تم دونوں؟" وہ ان کے قریب چلا آیا۔

"اوہ تو آپ ہمیں پہچانتے ہیں؟" نشاء کو اس کا پورا راستہ ان کو ٹھٹھرتا رہتا ہوا دکھائی دیا۔ سطر کیے بٹھیرے وہ تھی۔ "ایسا نہیں ہے۔"

"میں نے سوچا میں صحیح تہذیب سے بے حال ہوتے لوگوں کو نہ دیکھا جائے اور انہیں پہچانیں تو آرام سے گپ شپ کرتے رہیں گے۔" وہ مسکراہٹ دہائے سنجیدگی سے بولا۔ پریشہ ان دونوں کو چھوڑ کر اس بین ایج لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

246 نمبر کمرے میں پہنچ کر ظفر نے چابی اس کے حوالے کی۔ وہ ٹرپل بیڈ روم اس کو نشاء اور اس لڑکی کے ساتھ شیئر کرنا تھا۔

"لو کے" نشاء کو ملاقات ہو گئی۔ "افق ان دونوں سے کہہ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میاں بیوی سامنے

والے کمرے میں چلے گئے۔

"میں ڈاکٹر رہنے جہاں زیب ہوں۔" کمرے میں اپنے لہوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے اس لڑکی کی طرف ہاتھ پڑھا۔

"میں اور سہ بخاری ہوں۔ ویسے آپ کا نام بہت یاد آ رہا ہے پریشہ! وہ لڑکی اور صحیح کرنے والے انداز میں ہلکی پریشہ آئی۔"

"آئی؟" ان دونوں نے بیل پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"در اصل میں پاکستانی گزرتو اگر بغیر آئی باقی کے بلاؤں تو دادو!" مگر پریشہ نے کہا کہ کوئی نہیں سوچیں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی پاکستانی لڑکی کو آئی باقی کے بغیر نہیں بلائے۔ وہ دونوں ہنس پڑیں۔

کھانا انہوں نے ساتھ ہی کھایا تب تک کہ صرف کھانا کھل ہو چکا تھا۔

ارسہ کا تعلق اس سے تھا مگر بی بی یوحی انگلینڈ میں تھی اور لکھنؤ کے ایک تھیں سربوٹشی بہت مشکل سے تھی۔ اس کے پاس اس کم عمری میں بھی ایک ایچا Alpine دیکھا رہا تھا۔ زیادہ تر وہ یورپین Alps سر کر چکی تھی اس کے علاوہ تبت میں اس نے cho oyur shishapangma کو سر کیا تھا۔

"تم افق کے ساتھ راکا پوشی جا رہی ہو؟" نشاء نے مصدوم اور ذہین سی لڑکی سے اچھی لگی تھی۔

"ہاں! اس نے سر ہلا دیا۔ "راکا پوشی میرے ناول کی سیٹنگ ہے۔ وہ میں بتانا بھول گئی نہیں راکا پوشی ہوں۔ دو ناول لکھ چکا ہوں۔" اسے اتنی بات یاد تھی۔

تھی۔ ارسہ ہنس پڑی۔ "محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کیا تھا میں نے تو اس عمر میں صرف پہلا ناول لکھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"اچھا تو تمہارے ناول کی اسٹوری کیا ہے؟" اس کو دلچسپی ہوئی۔

"ایک کوہ پیما ہیرو اور ایک کوہ پیما ہیروئن کی راکا پوشی کرنے کی روایتی داستان۔" وہ مزے سے بولی۔ نشاء سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔

"ایڈیسی کوئی یا نہ ہو چکا؟"

"نہیں۔ کیونکہ نہیچک اینڈ یادگار ہوتا ہے۔"

ایسے آپ نہیں آئیں گی راکا پوشی؟ آپ جلد ہی تمہیں کہ آپ بھی گلا بٹھیں۔"

"ہاں! میں نے کمرے کے ڈاکٹر کے الیکٹرونک سے سات منٹ کے کورسز کیے تھے مگر میں راکا پوشی نہیں آؤں گی کہ مجھے اپنے فلاور کی پریشی نہیں ہے۔"

"کمرے کے ٹوٹے ہوئے آئی ایم امپریسڈ!"

"اور سوکس Alps کے علاوہ میں نے spanlik کو بھی سر کر رکھا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگی۔

"اوہ ویسے آپ آئیں تو مرزا آتا۔ افق بھائی بہت اچھے ہیں۔ میری ان سے ملاقات فلائٹ کے دوران ہوئی تھی۔ وہ مصر سے آ رہے تھے اور میں انگلینڈ سے۔"

"اب سوتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ "افق نامہ" شائع کرتی پریشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ارسہ اندامی سے بستر لیٹ گئی۔

نشاء اور ارسہ اس کی ہی باتیں کرتی تھیں۔ ارسہ نے منہ نہ کھولا۔ پھر وہ شام تک سوئی رہی۔ ارسہ اور نشاء جلدی اٹھ گئی تھیں اور با آواز بلند باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اسے بھی جگاڑا لیا تھا۔ مگر وہ آگے بڑھ کر اٹھ کر سوئی ہی رہی۔

دفعہ بد ازبے تک ہوئی پریشہ کا دل نور سے ہڑکا تھا۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا مگر وہ جانتی تھی کہ باہر کون سا۔ وہ مسکرائی۔ "افق ارسلان کی خوشبو پہچانی؟"

"انداز اسلام آباد کی خوشبو؟" اس نے اشارت سے کہہ دیا۔ پریشہ نے اس سے کہہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں اب کی ہلکوں کا نقاش دیکھ لیتا۔

"گتا ہے اچھی لڑکیوں کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔ آؤ بیٹھو۔" وہ اتنا منہ بڑا شائستہ اور ہنس مکھ تھا کہ نشاء اور ارسہ فوراً اس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے کرسی آفر کی۔

"یونہی سمجھ لو۔" وہ پریشہ کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی اور بیڈ کی بائیں طرف فاصلہ خاصا کم تھا، جگہ تنگ تھی وہ بیٹھ تو گیا مگر اس کے جو گورڈ بیڈ کے سرے کو چھو رہے تھے۔

"میں اس سفر کو یاد گار بنانا چاہتا ہوں اور بطور ایک اچھے سیاح میں کوئی لمحہ فارغ نہیں رہنا چاہتا۔ سو پھر تم لوگ

بتاؤ شام کا پروگرام ہے؟" اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ بولتے ہوئے بھی بھٹک بھٹک کر افق کی نگاہیں اسی کے چہرے پر رہ رہی تھیں جو اس نے آدھا سفید بازو کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ کپل بھی گردن تنک لے رکھا تھا۔ صرف چہرے کا ٹپکلا حصہ نمایاں تھا۔

"میری اٹھ جائے تو کوئی پروگرام بناتے ہیں۔"

"تمہاری دوست بہت زیادہ سوئی ہے کیا؟" اس کے انداز سے پریشہ کو لگا وہ جان گیا ہے کہ وہ سو نہیں رہی۔ "نہیں آج بس ذرا تھک گئی ہے۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ۔"

"میں آج تمہارے پشاور کے بازار ایسی کینٹ اور صدر وغیرہ کھنگالنے کا سوچ رہا ہوں۔ باقی نورسٹ انٹرکسٹنگ کل دیکھوں گا۔"

"تو پھر ہم بیٹوں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں افق بھائی یا امر صاحب اور افق بھائی کی مرضی وہ جہاں بھی جائیں۔ یا پھر ان سے پوچھ لیں؟" ارسہ متذبذب تھی۔

"وہ کپل بہت ریزرو ہے وہ یقیناً ہم سے گھٹنا ملنا پسند نہیں کریں گے۔" امر صاحب تو آدھا گھٹ ہوا کہیں چلے بھی گئے ہیں۔ پھر ہم چاروں ساتھ چلتے ہیں مگر نشاء وہ ایک لمحے کو راکا پوشی کے کان کھڑے ہو گئے۔

"مگر کیا؟"

"مگر وہ سکتا ہے تمہاری دوست کو کوئی اعتراض ہو۔" ارسہ نہیں۔ وہ بہت ٹاکس اور سوٹ ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"ویسے نشاء اچھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دوست میری بہت تعریف کر رہی تھی۔"

پریشہ نے ایک جھٹکے سے کپل اتارا اور تیزی سے سیدھی ہوئی۔

"میں نے کب ایسا کہا تھا؟"

افق کا قبضہ بے اختیار رہتا ہوا تھا۔ اسے اپنی حماقت پر شرمندگی ہوئی۔ نشاء اور ارسہ قدرے حیران تھیں "نہیں ابھی" لطیفہ "سمجھ میں نہیں آیا تھا۔"

"تم اٹھ نہیں؟ میں کچھ سو رہی ہوں۔"

"میرے سر پر جو تم لوگ کول میز کانفرنس کر رہے ہو میں بھلا کیسے سکون سے سو سکتی تھی۔" اپنی شرمندگی چھپانے کو اس نے غصے کا سہارا لیا اور بستر سے نیچے اتر گئی۔

ڈرنگ روم تک جانے کے راستے میں افق کی لمبی ٹانگیں
حائل تھیں۔ اسے قریب آتا دیکھ کر اس نے پیر سیٹ
لیے۔ وہ پیر تختے ہوئے اس ٹنگ جگہ سے گزری۔
"سوری پری امیں مذاق کر رہا تھا۔" وہ بمشکل ہنسی
کنٹرول کرتے معذرت کرنے لگا مگر وہ جھنجھلائی ہوئی نمود
زور سے الماری کے پٹ کھولی بند کرتی رہی۔

"اچھی لڑکیو اتار ہو کر لابی میں آجاؤ۔ تمہارے پاس
صرف پندرہ منٹ ہیں۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو
پری نے کن انہیوں سے اسے دیکھا اس نے لباس تبدیل
کر لیا تھا۔ پیش کی طرح شرٹ کی آستینیں اُدھی مگر
رنگ سیاہ تھا اور اوپر سفید ٹورسٹ جیکٹ آگروں کے گرد
بدرجائے ریڈ مفلر۔

"رائٹ پاس!" ارمہ نے تابعداری دکھائی، وہ
مسکراتے ہوئے ایک نگاہ خود کو دیکھتی پریشے پر ڈال کر باہر
اٹھ گیا۔ وہ "لف" کہتے ہوئے ٹنگ سے گزرا۔

ان دو دنوں میں اس نے کئی بار سوچا کہ ان دونوں کو
"سفر" کا نام دانا تمام ہے اس کے ساتھ "سفر" لانا تھا۔
"سفر" کی دوسری طرف سے وہ بہت ہی بولی تھی۔

"جیسی نے اپنی اپنی لابی لابی ہے افق بھائی سے؟ وہ
لاہور کی ایک اور سوکھت ہیں۔"

"سفریوں کی داستان ہے تمہیں ایک شام میں نہیں
بجھ آ سکتی۔" نشانے آہ بھر کر کہا تھا جیسٹر رش کرتے
پریشے کے ہاتھ ایک لمحے کو جھمکے تھے۔ وہ اندر سے کانپ کر
رہ گئی تھی۔ پلٹ کر ایک شانسی نظر نشاء پر ڈالی اور دوسری
اپنی انگلی میں موجود ایمرلڈ رنگ پر نشاء نے لاپرواہی سے
گلدھے اچکا دیے۔ ارمہ کے سر کے اوپر سے سب کچھ
گزر گیا تھا۔

وہ پیر تختے کر لیا تھا روم میں بیٹھی تھی۔ نشاء کی بات وہ سمجھا
ماتا نہیں کرتی تھی مگر اب اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ
تھا۔ نشاء اور ارمہ چلی جاتیں تو اس نے بھلا کیا تصور کیا تھا
جو وہ اس کی جھوٹے سے کمرے میں بیٹھی رہتی ہیں بھی
افق کے ساتھ مارکیٹ جانا اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ البتہ
یہ ظاہر کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔

پارکنگ ایریا میں کھڑی نور کینی کی بس کے ساتھ افق
ٹیک لگائے کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر سیدھا
ہو گیا۔ ایک استقبالیہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ
کر لیا تھا۔ لی کیپ اب بھی اس کے سر پر تھی۔

"کینٹ چلتے ہیں یہاں سے بہت قریب ہے۔" ان کو
لید کرتے ہوئے وہ بول کے پارکنگ ایریا سے نیچے مڑا۔
تنگ جاتی ڈھلوان سے اتر رہا تھا۔

"تم ترکی سے آئے ہو یا صوبہ سرحد سے؟" نشاء کو اس
کی پشاور اور ارد گرد کے متعلق معلومات حیران کرتی تھیں۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "بس پچھلی دفعہ اوپر آیا تھا
خامس دن یہاں گزارتے تھے۔ اس لیے آئیڈیا ہو گیا ہے۔"

"پچھلی دفعہ کب آئے تھے؟"

"دو سال پہلے۔" وہ لوگ ڈھلوان اتر کر نیچے سڑک پر آ
چکے تھے۔ سڑک اچھی غاصی کھلی تھی۔ سڑکوں کی
ریڑھیوں اور خانچہ فروشوں کے ہاتھی تھیں۔ اب

بہت تنگ ہو گئی تھی۔ اس جگہ ہونٹن لابی کی
"دو سال پہلے" کا سیرو سیاحت کے لیے آئے تھے

میں سے ان کو افق کی ہری سڑک پر راستہ بنا
کر دینا پڑا۔ اس نے کہا پھر بھی وہ بہت دھیان سے ان
دو توں کی گفتگو سن رہی تھی۔ "ہاں سیرو سیاحت کے لیے
اوپر آئے ہوئے لوگ دو کد مچھاؤش ہو گیا۔"

"اور۔۔۔ بس یہ کام تھا۔" وہ صاف جمل گیا تھا۔ نشاء
خبردارتے قہقہے سے ہی کہ اگر وہ ہل رہا تھا تو وہ اس کے

کی سانسوں کی آواز سن رہی تھی۔

افق نے ٹیکسی روکی، جیسی والا انگریزی سے نا بلند تھا
کرایہ کا معاملہ نشاء نے ہی طے کیا۔

کینٹ کی خوب صورت دکانوں کے باہر تانگی سے چلتے
ہوئے وہ جانے لگے۔

پھر ارمہ ان کو سڑک پر سیدھا ایک کھانے کی دکان پر لے گیا۔
وہ تینوں ایک چوڑی شاپ میں داخل ہو گئے۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ جب نشاء مختلف ایریز گزرو دیکھ رہی
تھی تو اپنی ذیلی پونی کو کتے ہوئے پریشے کے بالوں کو جکڑا
رہرہ میڈ ٹوٹ گیا۔ اس کے بال کسی آبشار کی طرح گہرے گہرے
گئے۔

"نئی! تمہارے پاس کوئی کیچر ہے؟" اپنے لیے
ایرئیز میں کتے بالوں کو سنبھالتی وہ پریشانی سے نشاء سے بولی۔

"اپنا خریدتے ہوئے تمہیں موت پڑتی ہے؟" وہ بہت
مصروف تھی سو کھٹ سے بولی۔

"دفع ہو جاؤ۔" وہ بیڑا تے ہوئے سامنے شوکیں پر

کی باسکٹ میں رکھے کیچر زور زور پونیاں دیکھتے گئی۔
"یہ کیسا ہے؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ افق ہاتھ میں ایک کیچر
لے آئے دکھا رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا کر کیچر کو
دیکھا۔ وہ سلور کلر کا تھا اس کے نیچے ایک طرف گول براسا
لیوزی رنگ کا پتھر جبکہ دوسری طرف سبز اور نیلا اور گانگا پتھر
بڑا تھا۔

"اچھا ہے۔" اس نے خوب صورت کیچر لینے کے
لیے ہاتھ بڑھایا۔ افق نے وہ اس کی پتھلی پر رکھنا چاہا
پکڑتے پکڑتے وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ کھرا کر پتھلی اور کیچر
اٹھا لیا۔ اس کے دو رنگے پتھر کے درمیان ضرب لگنے سے
ایک ہلکی سی سپرنگی کھیر پڑ گئی تھی۔

"کوٹ تو نہیں کیا؟" وہ پوچھ رہا تھا اس نے لٹی میں
سنا کو جنبش دی۔ پھر اسے نظر انداز کر کے میلز میں سے
خبر پوچھی۔

"اس میں روپے۔"

افق نے پیسے دکان دار کی طرف بڑھائے۔
"سودی یہ میں خود خریدوں گی۔" اس نے دبی آواز
میں اسے ٹوکا۔

"میں اسے لالچ میں اس سے گفت کر رہا ہوں کہ کل کو
بھی مجھے اسے گفت کرنا تھا۔"

نہیں گفت کر لیتی ہوئی وہی ہوں۔ اس نے پرس
میں سے پیسے نکالے۔ اس نے اسے دیا اور لیٹھا بھی پتھر
کر رہا ہوں۔ "وہ پتھر اس کے نظر انداز کر کے اسے سٹار
میں کو تھمائے غنائی غنائے سے ایک کیا لیا۔ پتھر نکال

یا۔۔۔ اسے اس کے پاس آئی۔

ارمہ کے آنے اور نشاء کی شاپنگ مکمل ہو جانے کے
بعد وہ لوگ باہر نکل آئے۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا شاپس
کے اندر اور باہر روشنیاں جگمگانے لگی تھیں "اسٹریٹ
لائٹس اور سائین بورڈز بھی جل اٹھے تھے۔

"رات کے کھانے کے لیے میں تم لوگوں کو پشاور کے
بہترین ریسٹورنٹ لے چلوں؟" وہ ان کے دائیں طرف
ایسٹوں میں ہاتھ ڈالے سامنے دیکھتے ہوئے ہل رہا تھا وہ

اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"لی سی؟" ارمہ نے بھٹ بڑھایا۔

"میں میں پر مزہ پانی اور پچھلے کھانوں سے لطف اندوز
نہیں ہوتا۔ میں تمہیں ایک بہتر جگہ لے کر جا رہا ہوں۔"

شرکی ٹنگ و تارنگ گلیوں سے جیسی میں انہیں وہ ایک
ایسی ٹنگ گلی میں لے آیا جہاں بے تحاشا تیسرے درجے
کے ریسٹورنٹ سے ہوئے تھے کھانا میں ہر طرف مزے دار
مسالوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

وہ انہیں ٹنگ منڈی لے آیا تھا۔ پریشے کو حیرت ہوئی
تھی کہ اس کے ٹنگ کو اس سے زیادہ جانتا تھا۔

ٹنگ منڈی کی ٹنگ والی کڑا لٹی کھا کر جب وہ لوگ وہاں
سے نکلے تو نشاء نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"تم اگر ان جگہوں پر اپنی دفعہ گھوم چکے ہو تو اب پھر
کیوں لوہر آئے ہو؟"

"میں تو میں کہہ رہی تھی۔ اچھے بھلے ہم جولائی میں ہی
راکا پوشی کا ٹنگ شروع کر دیے۔" خواجہ ادھر آنے کی کیا

ضرورت تھی! یہ نہیں افق بھائی کو اچانک ان علاقوں کا
وزٹ کرنے کا خیال کیوں آیا اور مجھے بھی ساتھ کھینٹ

لائے۔" ارمہ بے اختیار بول اٹھی۔ افق نے کوئی جواب
نہیں دیا۔

اپنے بول کے کمرے میں واپس آکر نشاء پھر مطلب
اللسان تھی۔

"میں نے اتنا سوٹ "ٹانکس اور اچھا انسان زندہ گی میں
پہلی دفعہ دیکھا ہے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ جتنی معلومات ان علاقوں کے متعلق
ان کو ہیں، میرا خیال ہے وہ ایک بہت کامیاب سفر نامہ نگار

بن سکتے ہیں۔"

"رہنے دو ارمہ!" وہ جھوٹی ڈیڑھائی کے قریب کھڑی پانی
کی بول منہ سے لگائے پانی پی رہی تھی قدرے حج کر بول

منہ سے پھٹائی۔ "یہ مغربی دنیا کے لوگ ہمارے ٹنگ میں
اگر معلومات اس لیے اچھی نہیں کرتے مگر عالمی دنیا کو ہمارا

سوٹ اچھا کر پڑھو تو تمہیں علم ہو کہ یہ لوگ ہمارے بارے میں کیا
اٹھا کر پڑھو تو تمہیں علم ہو کہ یہ لوگ ہمارے بارے میں کیا

کیا تو ہر اگلے ہیں۔ ہمیں جانل، پیمانہ اور غیر ترقی یافتہ
کہتے ہیں۔ تمہارے یہ افق ارسلان بھی ترکی جا کر یہی کام

کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار عالمی پر ادبی کو یہ بتائیں گے کہ
ہمارا ملک کتنا قدامت پسند مغرب اور سولیات سے نا بلند

ہے۔ یہاں کتنی گندگی اور بد نظمی ہے۔ یہ سارے ایک
جیسے ہوتے ہیں پر وہ بھینٹا کرنے والے۔"

بول رکھ کر وہ لٹی تو سناٹ رہ گئی۔ افق لب بھینچے کھڑا
تھا۔ وہ یقیناً "جیسی کا کرایہ ادا کر کے انہیں شب بھر کتنے

136

جنوری 2009ء

۱۵۸

جنوری 2009ء

دیکھا کہ یہ بات کس نے کی ہے۔ اسے حیرت ہوئی تھی کیونکہ یہ افتخار صاحب تھے۔

"یہ بولتے بھی ہیں؟ میں تو سمجھتی تھی ہونگے ہیں۔" نشاء نے بہت متوجہ انداز میں اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ اس کے لبوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا تھا۔

سب نے یہاں تک کہ ڈرائیو کرتے ظفر نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسی کنٹرول کرنے کی کوشش کے باوجود ہنسی چلی جا رہی تھی۔ افتخار اس کو یوں بچوں کی طرح ہنستے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی ہنسی کو پر یک لگ گئے وہ سختی سے لب سمجھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"نشاء! اپنی دوست سے کہو اس کی کھڑکی کے باہر خشک پہاڑ ہیں اور یہاں تو باریاں طرف بہ رہا ہے۔ وہ کس کو دیکھ رہی ہے؟" وہ نشاء کے ساتھ والی نشست پر تھا اس کی اور نشاء کی نشست کے درمیان aisle تھا۔ وہ ایک جوگر اپنی سیٹ کے آگے اور دو سرائے aisle پر رکھے قدموں سے جھک کر آہستہ سے نکلا۔

"ہی! اتنی ساری کھڑکی کے باہر خشک پہاڑ ہیں اور یہاں تو باریاں بہ رہا ہے مگر اس کو دیکھ رہی ہے؟"

"پہاڑ کونسا؟" اس نے چہرہ موڑا۔ بنیر خجید کی سے لہا۔

"گنا ہے ذاکر کا موڑ پھر سے خراب ہو گیا ہے۔ ویسے ان کو یہ دور سے دن میں کتنی دلچسپی پڑتے ہیں؟"

"جتنی دلچسپی کوئی عامیاد انداز میں میری تعریف کرے۔"

"کھٹ سے جواب آیا تھا۔"

"اوہ! وہ سمجھ گیا تھا۔" میں تو بس دل رکھنے کو کہہ رہا تھا تاکہ تم ہنستی رہو اور اتنی غصے والی اکھڑی اکھڑی سی شکل ہر وقت نہ بنائے رکھو۔ تمہیں برا لگا؟"

"ہاں! وہ ابھی تک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔"

افتخار نے بمشکل مسکراہٹ لبوں تک روکی تھی۔ "بہت معذرت میں آئندہ ایسے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کروں گا۔"

"تمہارے حق میں کچھ ٹھیک رہے گا۔"

"بہتر آپ اس طرف دیکھ لو۔ دریا بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔"

اس نے گردن کو بائیں جانب جنٹیش دی "افتخار مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ اپنی کھڑکی کی طرف موڑ چکا تھا۔ اس نے افتخار کی کھڑکی کے کھلے شیشے کے پار نگاہ ڈالی اور

پھر نگاہ پلٹ کر واپس تباہیوں گئی۔

جنرے سے ڈھکے بہر پہاڑوں کے درمیان سڑک۔ کوئی سو میٹر نیچے مل کھانا اٹھا دیا۔ رہا تھا۔ اس کا کسی تندی سے ٹھوڑا سا زیاہ چوڑا تھا پانی بے مدد حال جس کے اوپر سفید جھاگ پتھروں سے ٹکرانے کے پامند پیدا ہو رہے تھے۔ کسی نیلے سانپ کی طرح مل کھانا سارا کہ سڑک سے خاصا نشیب میں تھا مگر اس میں رکے اور قامت پتھروں سے ٹکرانے پانی کا شور بہت بلند تھا۔ راستہ اور کلام میں یہ شور آپ کا چچھا نہیں چھوڑتا۔

دریا کے دونوں طرف کے پہاڑ سرسبز تھے جن پر مقامی لوگوں نے فصلیں اگا رکھی تھیں۔ پہاڑوں کی ڈھلوان ہموار نہیں ہوتی، سو فصلیں بھی سبز چھوٹی کی شکل میں اگائی گئی تھیں عموماً معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جیسے کھجور کے لیے شاد سبز زمین سے ہٹتے ہیں۔

کھل سے کر جس وقت پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے ہیں تو اپنی اس کی گفتگو چلی چلی تھی۔ دراصل وہ دریا کے کنارے پرست تھا کہ وہ اس پر سے نگاہیں نہ ہٹا پارہی تھی۔

پھر بس شریں داخل ہوئی میری یہ ہوئی "سید جو شریف کی عمارت کے قریب سے ٹرن لے کر بس "مرغزار" کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کھجور کے قایم اسٹار ہوئے ہیں اس کی شکل جھگڑی تھی۔

"ظفر! وہ ہوئے رائل بلیس کہاں گیا؟" افتخار کھڑکی سے باہر شاشی نظروں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"سراوہ جو دانی سوات کا محل تھا؟"

"ہاں! وہ اب کوئی بیون انکیدی بن چکا ہے۔" ظفر نے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے دانی سوات کا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔ "ویسے سراوہم سے وہ بہت خوب صورت ہوئے تھے۔"

"ہاں! وہ بہت خوب صورت تھا۔ میں دو سال پہلے ادھر آیا تھا تو ایک دن رہا تھا وہاں پر۔ اسے ٹوشن سنٹر بنا کر دانی سوات نے اچھا نہیں کیا۔"

پری نے چونک کر افسوس سے سر ہلاتے افتخار کو دیکھا۔ برسوں شام جب نشاء نے اس سے دوسری بار مل پاکستان آئے کے متعلق استفسار کیا تھا تو وہ ٹال گیا تھا۔ وہ دو سال پہلے یہاں کیوں آیا تھا؟ ایسا کون سا کام تھا جس کے متعلق

نہیں بتاتا تھا؟ اسے ابھمن سی ہوئی ساتھ میں جنٹیش می ہوا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ الجھ کر افتخار کو دیکھ رہی تھی تو اس نے مسکرا کر ٹوکا۔

"کچھ نہیں! وہ سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

مرغزار جانے والا راستہ شہر سے دور ہٹ کر خاما سنبان اور پر سکون سا تھا۔ دور دور تک ان کی بس کے علاوہ کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہر طرف اتنا سکوت اور ویرانہ سا تھا کہ پریشہ کو لگا "ظفر راستہ بھول گیا ہے، وہ یقیناً کسی انجان راہی میں جھٹک رہے ہیں۔ مگر ہر گز میرے بعد "وائٹ ٹیس اسٹے کاویٹر دور" کا بورڈ اس کے دل کو تسلی دیتا تھا۔

"ہوئی مینجمنٹ کے نقطہ نظر سے وائٹ ٹیس کی لوکیشن درست ہے۔ آبادی سے بہت دور اس مرغزار میں ایک حد ہوئی ہے کہ جب ٹورسٹ کئی کلو میٹر سفر کر کے پہنچا تو تک پہنچتا ہے تو اس کے آسمان کو چھوے رہے ان کو بھی واپس پلٹنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔ ظفر ایک منٹ گاڑی روکو۔" وہ ہوئے کی اویکیشن پر کھنٹ کرتے ہوئے اچانک سیدھا ہوا کر بولا "ظفر نے گاڑی روکی۔" افتخار نے اپنا ہیشہ نیچے کر لیا۔

پھر ایک منٹ ٹھکت لو کہ پری بالوں والا بچہ کھڑا تھا۔ اس نے اس سبیل سے اٹھا ہاں میں آج بھی نہیں تھا اس نے لیے اور اس کے منگوں کے کچھ اور اس کے لگا رکھے تھے۔

آخرت سب اور پے۔

"اس سے کہو سو روپے کی ہے دے۔" افتخار نے ایک منٹ کے لیے اسے ہیشہ کی طرف بڑھایا۔ اس صاحب نے تڑپ کر لگی۔

"یہ سب تو چالیس روپے کی ہے۔" بچہ بولا تھا۔ احمر صاحب نے افتخار کو بتایا۔

"تو پھر یہ ساری دے دو!"

"تم ساری لے لے گا تو ام شام تک تمہارا سر نیچے گا؟" بچہ سارے انجیر دینے پر راضی نہ تھا۔ احمر صاحب نے جوابی کر رہے تھے۔

"اوہ! تو دو روپے دو اور باقی بچے رکھ لو۔"

"افتخار! وہ ایسے نہیں رکھے گا۔ تم اس سے صرف بیس روپے کی انجیر خرید سکتے ہو۔"

"اچھا۔" افتخار نے دس کے دو نوٹ باہر نیچے کو دے

دے اس نے دو ششیاں اس کی طرف بڑھائیں۔

بس پھر سے چل پڑی تھی۔ پریشہ جانتی تھی کہ افتخار کو انجیر کھانے کا کوئی شوق نہ تھا وہ بس اس بچے کی مدد کرنا چاہتا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ بالی لوگوں میں انجیر مانت رہا تھا۔

"تم خود بھی کھاؤ نا!"

"میں پھل وغیرہ نہیں کھاتا۔" اس نے لاپرواہی سے شانے جھٹکے۔

ظفر نے بس روک دی۔ بس سے باہر نکلے ہوئے اس نے بالوں میں لگے کپچر کو جھکنا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ کپچر کا دور نگاہ پھر دے ڈھیلا ہو چکا تھا۔ بس ایک پار کرنے کی دیر تھی اور پھر وہ کپچر سے الگ ہو جاتا۔

اس نے وہ افتخار کو واپس کرنے کا سوچا تھا مگر جانے کیوں اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا کہ وہ اسے واپس کرے اب وہ اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی بیشک کے لیے۔

یہاں ایک کھلا سا پارکنگ لائٹ ہوا تھا جس کے آخر میں بہت چوڑی سیڑھیاں تھیں۔ پارکنگ لائٹ کے بائیں جانب ڈھلوان تھی۔ وہاں چند فٹ نشیب میں تین چار رکائیں تھیں جن پر سوائی شالیں لٹکی دکھائی دے رہی تھیں۔ دکانوں کے بائیں طرف پہاڑ ختم ہو جاتا تھا اور آگے دکھائی تھی جس میں چشمہ بہہ رہا تھا۔ کتے پانی کی آواز اسے بہت پسند تھی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر دور تک پھیلا سبز اٹن تھا جس میں سنگ مرمر کے بیچ گریساں اور میزوں رکھی تھیں۔ لان کے اختتام پر ایک سفید رنگ کا محل تھا۔ وہ کی طرح سفید محل۔ اتنا خوب صورت کہ نگاہ نہ ٹھکتی تھی۔ لان کے دائیں طرف سپدھی پتھری روش تھی جس کا اختتام پہاڑ کوکٹ کر بتائی تھی طویل سیڑھیوں پر ہوتا تھا۔ یہ سیڑھیاں وائٹ ٹیس کی بلڈنگ سے ہٹ کر تھیں۔

"پری! یہ ہوئے میں نے دیکھ رکھا ہے۔ وہ دراندہ "موم کا چہرہ" نہیں تو شوٹ ہوا تھا۔" نشاء نے آہستہ سے اسے بتایا۔ شہلا اور افتخار کو اس روش کے دائیں جانب بنے کمروں میں سے ایک مل گیا تھا جبکہ باقی سب کو دو سری منزل پر کمرہ ملا تھا۔

"مجھے نہیں رہنا دو سری منزل پر۔ ناٹا پر بہت سر کرنا آسان ہے، وائٹ ٹیس کی سیڑھیاں چڑھنا بہت مشکل! افتخار نے یہ سننے ہی کہ اسے دو سری منزل پر رہنا ہو گا منہ بنایا تھا مگر کسی نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی۔

وائٹ پیلس کی وہ سفید عمارت دراصل اس کی پہلی منزل تھی۔ پتھر کی روش کے بائیں جانب جہاں چند کمرے اور دکانیں تھیں ان کے آگے طویل سیڑھیاں پہاڑ کے اوپر لے جاتی تھیں جہاں دوسری منزل تھی۔ وائٹ پیلس کی چاروں منزلیں اسی طرح مختلف altitudes مگر ایک ہی پہاڑ پر اترتے تھیں۔

وہ سیڑھیاں واقعی مشکل تھیں یہ احساس اسے انہیں عبور کرتے ہوئے ہی ہو گیا تھا۔ نیچے جتے جھرنے کا شور ابھی تک اس کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ شام کو اس جھرنے تک ضرور جائے گی۔

”اور سے دیکھتے ہیں یہ طویل سیڑھیاں جتنی خوب صورت لگتی ہیں۔“ انہیں چڑھنے لگو تو اتنی ہی تھکاتی ہیں۔ ”اف اللہ!“ سیڑھیاں نیچے اترتے ہوئے اس نے بے اختیار جھنجھلا کر دائیں طرف نصب بجھرے پر ہاتھ مارا تو اندر بیٹھا خوب صورت اور سہم کر بیٹھا ہوا۔

”سوری!“ اسے بے اختیار شرمندگی ہوئی۔ اس کے آگے سیڑھیاں اترنے والی نے سر کھٹکرا کر دیکھا اور ہلکے سے مسکرایا۔ پھر مسکراہٹ چھپانے کو رخ آگے پھیر کر نیچے اترنے لگا۔ اس نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی وہ بہت مسکوری ہو کر اس خوب صورت مورد کو دیکھ رہی تھی۔

ان سیڑھیوں کے دائیں اور بائیں طرف بہت بڑے بڑے بجھرے بنے تھے جیسے چڑیا گھر میں ہوتے ہیں۔ ان بجھیوں میں مختلف پرندے مورد اور بندر مقید تھے۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ اس نے اتنے خوب صورت مورد کو ذرا دیا تھا۔

”رک کیوں گئی ہو؟ چلو!“ نشاء نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھٹک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ وہ چاروں نیچے جھرنے پر جا رہے تھے۔

پتھر کی روش جہاں ختم ہوئی تھی اور جہاں سے پارکنگ لائٹ میں جانے کے لیے چند بے حد چوڑے زینے بنے تھے اس جگہ پر ناشپاتی کا ایک درخت تھا جس کے تنے کے ساتھ کرسی پر ایک بوڑھا سیکوئی گارڈ بیٹھا تھا۔

”یہاں سے ناشپاتی نہیں توڑ سکتے؟“ اس نے بڑی حسرت سے درخت کو دیکھا۔

افتخار میرے سے مسکرایا ”وہاں ٹھہرنے کے اوپر اس طرف کے پہاڑ پر چڑھتے جاؤ تو آگے جنگل بے دہاں ناشپاتی کے بہت سارے درخت ہیں۔ وہیں سے تو اس درخت کو تو یہ آوی تھیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“

”تم اوھری پیدا ہونے تھے یا یہ انفارمیشن ہم پر اپنی ہمارا جھاڑنے کو دیتے ہو؟“

”نہیں“ اصل میں جینک جنگلی ناشپاتی بہت شوق سے کھاتا ہے۔ پچھلی دفعہ وہ میرے ساتھ آیا تھا تو وہاں جسے کے اوپر ہم نے ناشپاتی کے درخت ڈسکور کیے تھے۔“

”جینک کون؟“ ارسہ اور نشاء نے رکنگ لائٹ

احاطہ عبور کرتے ہوئے ایک وقت پوچھا تھا۔

”میرا بہت جینک یقین۔“ (Clen yab)

اس کی آواز سے پھر وہی عجیب سی جھنجھلاہٹ بھی

رہی تھی۔ ”یہ درخت کے باعث ملک گیا تھا۔“

جھرنے کی کڑی سی آواز سے وہ دوسرے پہاڑ پر

مقرر لوگوں کے بنائے گئے کچے راستے پر اور چڑھنے لگے۔

راستہ بہت کچا تھا پریشے کے جو مرکز پر مٹی لگ رہی تھی

اس نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور سر جھٹکا ہوا تھا۔

افتخار جینک جیوں میں ہاتھ ڈالے اس کے برابر میں مگر چند

قد کا فاصلہ چل رہا تھا۔

”وہ رہے ناشپاتی کے درخت۔“ افتخار کی آواز پر اس نے

چلتے ہوئے سر اٹھا کر اوپر دیکھا وہاں درختوں کے جھنڈے تھے

اسے سامنے رکھا پتھر کھائی نہیں دیا اس کا پاؤں پکا سا

پتھر سے ٹکا۔ ”وہ جھٹکا کر لیا کہ وہاں افتخار کی

اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ لڑھکتے نہیں گئی تھی بلکہ سی لڑکھائی تھی مگر وہ

سمجھا تھا کہ وہ پہاڑ پر سے گرنے لگی ہے اس لیے اس نے

ریفلیکس ایکشن کے طور پر اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا

اور پھر فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ ارسہ اور نشاء ان سے کافی آگے

تھیں۔

وہ چلنے کے بجائے رک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ قدرے

وضاحت دینے والے انداز میں بولا ”سوری میں سمجھا تم

گرنے لگی ہو۔“

”تمہارا ادب درست ہے؟“ وہ اس کے سامنے کھڑی

اسے گھور رہی تھی۔

”پری۔ میں۔“

اس نے افتخار کی بات سے بغیر تیزی سے اس کی کھائی

کھائی۔

”تمہیں بخار ہے؟ اتنا تیز بخار۔ ہاتھ دیکھو کتنا گرم ہو

ہا ہے اور نبض دیکھو کیسے دوڑ رہی ہے اور تم بجائے

رست کرنے کے ہائیکنگ کرنے نکلے ہوئے ہو پاؤ۔“

اسے اس لاپرواہ انسان پر بہت غصہ آیا تھا۔ ”تم سے اتنا بھی

نہیں ہوا کہ مجھے بتا دی دو۔ میں ڈاکٹر ہوں، تمہیں دوائی تو

دے سکتی تھی مگر تمہیں خود کو انتہیت دے کر اپنے آپ

کو بیمار کھلاؤ گے کا شوق ہے۔ تم انتہائی فضول انسان ہو!

”اور! واپس چلو میرے ساتھ۔“

وہ جو پہلے بوکھلا گیا تھا اب مسکراہٹ لبوں تلے دبائے

مر جھٹکائے کھڑا اس کی ڈانٹ میں رہا تھا۔

”معاذ کرنا ڈاکٹر میرا نہیں خیال کہ میں اتنا بیمار ہوں

کہ۔۔۔ سے لگ کر بیٹھ جاؤں۔“

فیصلہ کرنے والے تم نہیں میں ہوں سمجھے تم؟“

وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بھی سر جھٹکائے اس کے فکر مندی

بھرنے سے غفلت ہو گیا اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ

بیوقوفی ہوئی پاؤں سے نیچے اتر رہی تھی۔

”ڈاکٹر! میں واقعی اتنا بیمار ہوں۔“

وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ وہ اس کے عقب میں محض

قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس کے ایک دم مڑنے پر فوراً

پلٹ کر اس کے سامنے آ گیا۔

”تمہیں کئی دفعہ دیکھا ہوں۔ میرے سامنے

اپنا منہ بند کر دو۔“

افتخار نے تھک کر اسے بول کر اپنی رکھی۔ ”سوری

ڈاکٹر! سب میں بدوں۔“ اس کے لیے اور شدید رنگ

آنکھوں سے شرارت جھٹک رہی تھی۔

”ہاں! اب ٹھیک ہے چلو!“ وہ اس کے آگے چلنے لگی۔

”وہیے کتنی دیر تک نہیں بولنا؟“

”جب تک میں نہ کہوں اور اب خاموش رہو۔“ وہ

اس کے آگے چلتی ہوئی اوپر کمروں تک لے آئی۔ اس کو

چراغ پناہوں کی دو گولیاں دے کر سختی سے سو جانے کو کہا۔

”مگر میں سونا نہیں چاہتا۔“ ریڈر پر جیسے افتخار نے احتجاج

کیا۔

”خاموش! بالکل خاموش رہو۔ ڈاکٹر کے سامنے اپنی

زبان بند رکھا کرو۔“

اس کو باقاعدہ ڈانٹ کر وہ اس کے کمرے سے آگئی۔ دوسری منزل پر کمروں کی دو متصل قطاریں تھیں سامنے لائن تھا جو مستطیل شکل کا تھا۔ لائن کے دہانے پر جہاں کھائی تھی جھاڑیوں اور چند درختوں کی معمولی باڑی بنی تھی۔

وہ اپنے بیک سے ڈائری اور چم اٹال لائی اور لائن کے

وسط میں چھٹی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اپنے سفر کے

متعلق لکھنے لگی۔ جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ اس پاس

اس کے سوا کوئی نہیں ہے تو اس نے جو کچھ یاد کر پاؤں میز

پر رکھ لیے اور ڈائری کھول دی۔ ڈائری لکھتے ہوئے وہ گاہ

بگاہے افتخار کے کمرے کی جانب نگاہ بھی دوڑا لیتی تھی۔ ایک

دفعہ جا کر دیکھ بھی آئی وہ آنکھوں پر بازو رکھے سو رہا تھا۔

اسے تسلی ہوئی۔ واپس آئی تو ایک چھوٹا سا بندر میز پر بیٹھا

اس کی ڈائری سے پھینچ کر ہاتھ کر رہا تھا۔ ایک اور بندر نیچے

گھاس پر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کو قریب آتے دیکھ کر

چھوٹا بندر تو چھپاک سے غائب ہو گیا۔ جبکہ گھاس پر لیٹا

بندر احراماً سیدھا ہو گیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنا بال بوائٹ بندر کی طرف

پوچھا ”جیسے اس نے اپنے انسان نما ہاتھوں کی مدد سے پکڑ لیا

کچھ دیر وہ اس سے کھیلتا رہا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے

دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم بندر نے اس کا ہاتھ زور سے اچھالا

”وہ لائن کے دہانے پر سے ہوتا ہوا نیچے کھائی میں گر گیا۔

پریشے کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”رفع ہو جاؤ تم!“ اس نے غصے سے پاؤں زور سے زمین

پر مارا۔ بندر اچھلتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ پری نے

افسوس سے کھائی کی طرف دیکھا۔ اس کا چم اب واپس

نہیں آسکتا تھا۔

پھر وہ افتخار کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے سیف کے

متعلق سوچنا برا لگتا تھا مگر افتخار کی باتوں اس کی شرارت

بھری شد رنگ آنکھوں اور اس کی لبوں میں چھپی

مسکراہٹوں کو سوچنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ شخص

جسے چار دن پہلے تک وہ جانتی تھی نہیں تھی اب بہت

شناختا لگ رہا تھا۔ بلکہ نہیں وہ تو شاید اس کو بپا کو صدیوں

سے جانتی تھی مدح سے وجود میں آنے سے بھی پہلے پہلی

سامنے لینے سے بھی پہلے سے۔

اسے نگاہ افتخار کی گویا پکار رہا ہے وہ کمرے کا دروازہ کدھ

نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ دور نیلے آسمان پر تاریخی سورج طلوع ہونے کو بے تاب تھا مگر گہرے سیاہ بادل اسے رستہ نہیں دے رہے تھے۔

”تم نے آج سور کو ناپتے دیکھا تھا؟“ اس کی نگاہیں یہاں آسمان پر چھائے بادلوں پر تھیں۔ وہ خاموش رہی۔

”میں جب بھی اوھر آتا ہوں سور مجھے پہچان کر اپنا تاریخ ضرور دکھاتے ہیں۔ جن چیزوں کو ہم سیاح صرف لطف اندوزی کا سامان سمجھتے ہیں وہ ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد کرتی ہیں ہمیں یاد دلاتی ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا پرانی کہ وائٹ پیلس کی میڑھیوں کے ساتھ نصف بنجرے میں مقید مور ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد کرے گا اس جھرنے کا تیز بہتا پانی پانی میں رکھے پتھر اور اس میں کے قریب لگے درخت پر وہ او اس گیت گاتی پڑیا ہمیں یاد کرے گی؟ سیاح سمجھ نہیں پاتا اور نہ ہمارے قدموں کے نشان تو صدیوں ان پتھروں، مرغزاروں اور ان کیے راستوں پر ثبت رہتے ہیں۔“

”کل شام جسیں کیا ہو گیا تھا افق؟“ وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔ ”مال آقا میرے متوجہ تھا کہ افق نے چونک کر اسے گھٹا۔“

”اب کل شام؟“

”م نے اپنی ناشپاتی میں کھائی۔“

”بات مستبد لو۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بارش آنے والی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔“ کھڑے ہو کر اس نے اپنی بیٹ جھاڑی ایک سرخ رنگ کا کیر اس کے گھٹنے سے پیچھے پتھری زمین پر گرا۔

”تم جاؤ۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔“ پریش نے نقل سے منہ پھیر لیا۔ جھرنے کے بستے پانی نے دیکھا تھا کہ وہ دونوں اس بل ایک دفعہ پھر اجنبی ہو گئے تھے۔

وہ کچھ کے بنادیاں سے چلا گیا وہ پھر ویسے ہو گیا تھا جیسے کل شام تھا جیسے جیل کے رستورٹ میں تھا۔ اجنبی غیر شناسا۔

تیز بارش میں بھینکتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ وہ بہت ادا سی ترک زبان میں ان سوروں کو کوئی گیت سن رہا تھا۔ نیلے پتھر والا سور تاج رہا تھا۔ افق کے سر پر کیپ نہیں لگا۔ بارش نے اس کا پورا جسم جھگوڑا کیا تھا۔ اس کو یوں دکھائی دیا جیسے وہ کھڑے دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا تھا۔

”کیوں کھڑے ہو تم اوھر؟ جاؤ اپنے کمرے میں۔“ کئی دفعہ کہوں تم سے یہ بات؟ کچھ میں نہیں آتی تمہیں؟ ابھی تمہارا بخار بھی نہیں اترنا۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔“

وہ غصے سے بلند آواز میں پلائی تھی۔ سر پر نہ رکھ کر بارش کے پانی سے بچتے اس دھڑلے جو تیزی سے میڑھیوں پھلاکتے ہوئے اتر رہا تھا حیرت سے گردن پھیر کر ایک لمحے کو اسے دیکھا ضرور تھا جو خود بارش میں بھینکتی اسے ڈانٹ رہی تھی۔

”جسوں کوئی حق حاصل نہیں مجھ پر؟“ اچانک اس نے وہ بھی جواب دیا۔ ”تو ایک لمحے کو وہ جیسی ہو گئی۔“

کہاں حق رکھتی تھی ایک اجنبی۔

”ایک سے پھر اس بارش میں۔“ وہ تیزی سے میڑھیوں پھلاکتی اور آگئی۔ لان میں تین بندر انہیں کھلیاں کر رہے تھے لان کو بھاگتے ہوئے گرا کر اسے اس نے راستے میں پڑی مثل دائرہ کی خالی بوقل اٹھا کر میز پر چڑھے بندر کو زور سے مارا بندر سم کر جھانپنے لگا۔

وہ بارش میں بھینکتی کمرے تک آئی تھی۔ ایک بارش سوات کے پہاڑوں پر ہو رہی تھی ایک اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔ وہ خود پر کھیل نان کر پوری دنیا سے پھپھپ کر رہی تھی۔

”بارش میں بارش۔“ اس نے اشارہ کر دیا۔

سوروں کے ہجرے کے ساتھ گھڑا افق اور سلمان ابھی تک بھجک رہا تھا۔

وہ تمام دن اپنے کمرے میں رہی تھی پھر جب دن ڈھل گیا اور افق پر سیاہی پھیلنے لگی تو وہ بیوی کے آگے سے ہٹ کر جس پر بی بی بی اور جیو کے سوائے کوئی چینل نہیں آتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا پھر نشاء اسے زبردستی اٹھا کر وائٹ پیلس کے باہر بی بی کانوں تک لے آئی۔ اس کو سواتی شاہوں اور قیمتی پتھروں کی شاپنگ کا کوئی شوق نہیں

تھا مگر محض نشاء کا ساتھ دینے کو وہ کافی دیر تک وہاں سر کھپاتی رہی۔

دونوں داہیں آئیں تو وائٹ پیلس کی سفید عمارت کے سامنے پھیلے وسیع و عریض لان کے وسط میں دائرے کی صورت میں احمد صاحب، شمس، افتخار اور افق بیٹھے تھے۔ افق کے پیچھے سنگ مرمر کا سفید بیٹھ تھا جس سے ٹیک لگائے وہ ایسے بیٹھا تھا کہ دائیں ٹانگ لکھاس پر پھیلا رکھی تھی اور بائیں گھٹنا سیدھا کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے لکھاس کے نیچے نوج رہا تھا۔ اس کی پی کیپ اس کے سر پر تھی۔

احمد صاحب اور باقی افراد کسی بحث میں محو تھے۔ نشاء بھی ساتھ شامل ہو گئی۔ صرف وہ اور افق خاموش تھے۔ وہاں وائٹ پیلس کے برآمدے سے آنے والی روستی اور چاندنی چاندنی کے علاوہ دوسری کوئی لائٹ نہیں تھی جس سے باعث وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی مگر وہ اسے پہلے کی نسبت بہتر لگا تھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

احمد انکل انٹ کو مشرف سے اتنا ترک تک لے گئے تھے ان کے پکارنے پر اس کی لکھاس نو بجتی انگلیاں رکھیں اس نے پوچھا کیا کیا۔ حقیقی چاندنی نے اس کے چہرے کے خند خال کو دیکھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

احمد انکل انٹ کو مشرف سے اتنا ترک تک لے گئے تھے ان کے پکارنے پر اس کی لکھاس نو بجتی انگلیاں رکھیں اس نے پوچھا کیا کیا۔ حقیقی چاندنی نے اس کے چہرے کے خند خال کو دیکھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

احمد انکل انٹ کو مشرف سے اتنا ترک تک لے گئے تھے ان کے پکارنے پر اس کی لکھاس نو بجتی انگلیاں رکھیں اس نے پوچھا کیا کیا۔ حقیقی چاندنی نے اس کے چہرے کے خند خال کو دیکھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

احمد انکل انٹ کو مشرف سے اتنا ترک تک لے گئے تھے ان کے پکارنے پر اس کی لکھاس نو بجتی انگلیاں رکھیں اس نے پوچھا کیا کیا۔ حقیقی چاندنی نے اس کے چہرے کے خند خال کو دیکھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

احمد انکل انٹ کو مشرف سے اتنا ترک تک لے گئے تھے ان کے پکارنے پر اس کی لکھاس نو بجتی انگلیاں رکھیں اس نے پوچھا کیا کیا۔ حقیقی چاندنی نے اس کے چہرے کے خند خال کو دیکھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

احمد انکل انٹ کو مشرف سے اتنا ترک تک لے گئے تھے ان کے پکارنے پر اس کی لکھاس نو بجتی انگلیاں رکھیں اس نے پوچھا کیا کیا۔ حقیقی چاندنی نے اس کے چہرے کے خند خال کو دیکھا۔

”نشان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ افق؟

سے آنے والوں کی بہت قدر کرتا ہے۔ مجھے تو اس نے آج تک نہیں پوچھا۔ شاید اس لیے کہ میں مسلمان ہوں؟“

”فکر مت کرو۔ تم راکا پوچی سر کر لو، تمہیں کوئی ایوارڈ دلائی دیں گے؟“ نشاء نے کہا۔

”کون سا ایوارڈ؟ نشان حیدر؟“ وہ دلچسپی سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں۔ وہ تو شہید ہونے کے بعد ملتا ہے اور ملٹری اعزاز ہے۔ خیر تم پہلے کوئی پاکستانی پہاڑ سر تو کر لو، قومی اعزاز کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔“

وہ بد مزہ سا ہو کر پیچھے ہوا۔ ”تیس گھنٹہ ہوم نو براؤ ٹیک اور ناگاہ رست سر کر چکا ہوں۔ تمہارے صدر نے مجھے کبھی نہیں بلایا۔ اب تو میں نے امید لگانا بھی چھوڑ دی ہے۔“ وہ بہت مصنوعی افسوس سے کہہ رہا تھا۔

”تم نے ناگاہ رست سر کیا ہے؟“ دی گھر ماؤ نشیں؟“ پریشہ چو کی تھی۔

”ہاں!“ وہ کیپ ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چلتا ہوں۔ اب لوگ باتیں کریں۔“

پری کی نگاہوں نے لان عبور کر کے میڑھیوں پر چڑھنے افق کا دور تک تعاقب کیا تھا۔ آج وہ سوروں کے ہجرے کے پاس نہیں رہا تھا۔

محفل چل رہی تھی جب وہ وہاں سے اٹھ کر اوپر آگئی۔ وہ افق کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ مستطیل لان میں نہیں تھا۔ وہ ہی اپنے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں وہ تو اپنے کمرے میں بھی نہیں تھا۔ لان میں اس رات بندر بھی نہیں تھا۔

وہ قیسری منزل پر آگئی۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔

چوکور احاطے کے دائیں طرف کونے میں آگے جا کر ایک بالکونی بنی تھی اسے وہاں افق کی جھلک دکھائی دی۔ وہ وہیں آگئی۔

وہ بالکونی پر اپنے وقتوں کے محلوں کی طرز پر تھی۔ اس کی رنگ اور پٹی تھی جس پر کہنیاں نکائے وہ قدرے جھک کر بیٹھے جھرنے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے عقب میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کی کیپ کا پچھلا حصہ اس کے سامنے تھا اس پر سفید مار کرے کسی نے ہاتھ سے لکھ رکھا تھا۔

Hail to Tayyip Erdogan اس نے یہ وہ پہلی دفعہ ٹوٹ کیا تھا۔

گنگنا رہا تھا۔

”سون اکشام استوری میں۔۔۔ اسے بچا ہوا سوڈو دینا۔۔۔“
کیڈم کسی کی موجودگی کا احساس کر کے اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

”تمہاری کیپ پر طیب کے سچے غلط لکھے ہیں، طیب کے آخر میں ”B“ آتا ہے، تم نے ”P“ لکھ رکھا ہے۔“ اس کے خود کو سوالیہ نظروں سے گھورنے پر جو اس کے منہ میں آیا وہ بول پڑی۔

”میں نے نہیں لکھا۔“ پھر وہ واپس چھرنے کی طرف موڑ کر وہ بے نیازی سے بولا۔ ”یہ جینک کی کیپ ہے، اس نے لکھا ہے۔ ترک زبان میں ”B“ کی جگہ ”P“ استعمال ہوتا ہے یہ فقرو انگریزی میں اس لیے لکھا ہے کہ وہاں ترکی میں لوگ انگریزی سے نااہل ہوتے ہیں۔ ملٹری والے بھی اور وہاں کی ملٹری اردگان کو پسند نہیں کرتی۔“

”مگر تمہاری انگریزی تو بہت اچھی ہے۔“ وہ اس کی طرح جینک پر کھنکھایاں نکالے کھڑی ہو گئی، فرق یہ تھا کہ وہ جانتے دیکھ رہا تھا اور وہ اسے۔

”میں بھارت میں کافی عرصہ امریکہ میں رہا ہوں، شاید اس کا اثر ہو۔“

”اچھا، تم نے جینک کی کیپ کیوں لے رکھی ہے؟“

”میں مصر جا رہا تھا تو ایترو کے ایئرپورٹ پر پوئٹی مذاق میں میں نے اس کی کیپ بھیجی اور اس نے میری۔ بس پھر بعد میں واپس ہی نہیں کرے گا۔“ وہ رکا اور قدرے توقف سے بولا۔ ”ہم دونوں اچھینتر میں اور سائنس پر جاتے ہوئے کیپ لیتے ہیں، دھوپ ہوتی ہے۔ تو بس عادت پڑ گئی ہے۔“

”اور یہ مفلر؟“ اس نے گردن میں موجود مفلر کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔

”یہ مفلر نہیں ہے، یہ ترکی کا جھنڈا ہے۔“

”اوہ! وہ حیران ہوئی۔“ میں تو اسے مفلر سمجھی تھی۔“

”میں اسے راکا پوشی پر لہرانے کو لایا ہوں۔“ وہ پھر سے اندھیرے میں دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھنے سے دانستہ گریز کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے افق نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

”تم ابھی کیا کار ہے تمہے؟“

”کچھ نہیں۔ ہمارا ایک لکھاری سے اجازت اور اس نے لکھی تھی۔ ایک نرسری راکم سے۔۔۔“
”پھر وہ رخ پھیر کر جینک سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا اور دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔“

”کیا مطلب ہے اس کا؟“
”افق اس کو مطلب سمجھانے لگا۔“

”مجھے سناؤ نا۔ ویسے ہی جیسے تم ابھی گنگنا رہے تھے۔“ وہ ضد کر رہی تھی۔ چند لمحوں خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بہت مدھم آواز میں گنگنا نے لگا۔ ”سون اکشام استوری میں۔۔۔“

”آزادگی کے سفر میں پھرنے سے پہلے ملن کی آخری شام کے دھکنے سے پہلے اور ایک دوسرے کی سانسوں اور دھڑکنوں کی آخری آواز سننے سے پہلے کہ جس کے بعد تم میری دنیا سے چلے جاؤ گے۔“

”تمہیں مجھ سے ایک وعدہ ہو گا۔“

”اب میں سورج طلوع ہو گا۔“

”اوہ! انا طویل کی کلیوں میں روشنی بارش کے قطروں کی طرح گرنے کی اور ارا رات کے جاتی پھاڑوں پر جمی برف چھلنے کی۔“

”اور پھر۔۔۔ اس برف میں دہلی دامتنان مار مار کے۔۔۔“

”میں ہر جگہ کی۔“

”تب تم کو مجھ سے ایک وعدہ بھانا ہو گا کہ اس رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والی ہر صبح کی ٹھنڈی ہوا اور۔۔۔“

”اور۔۔۔“

”اور جاسی پھاڑوں پر دودھ کی کی می برف کو دیکھ کر تم مجھے یاد کرنا۔“

”کہ یہ میرا تم پر اور تمہارا مجھ پر قرض ہے۔“

”وہ اسی مدھم سر میں جینک سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے گنگنا رہا تھا اور وہ اس کے لیے اس کی آواز میں کھوئی ہوئی تھی۔“

”دفعہ نا بادل گرے تو افق چونک کر رہ گیا اور گردن اٹھا کر سیاہ تاریک آسمان کو دیکھا۔“

”چلو چلتے ہیں بارش ہونے لگی ہے۔“ وہ چل پڑا، پری اس سے پیچھے اس کے ہاتھوں کے نشانات پر جو گھاس میں کم ہو رہے تھے پاؤں رکھتی چلتی گئی۔

”مجھے اپنے کمرے کی جو کھٹ پر پہنچ کر دروازہ بند کرنے سے پہلے افق نے ایک لمحے کو رگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔“

”آئی ایم سوری۔۔۔ آئی ایم سوری فار ابوری۔“

”جینک والے واقعے کے متعلق دھیرے سے کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔“

”دور تاریک آسمان پر بادل اٹھتے ہو رہے تھے۔“

جمرات 28 جولائی 2005ء

سوات کے بھائیوں پر ٹھنڈی پرنیم اور بادلوں سے ڈھکی ہوئی ہوئی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا، کل کی طرح آج بھی بادلوں نے آسمان کو اپنی راجہ مانی ہوئی۔ آج بھی ان کا رنگ بکا تھا۔

”خدا رکھے آج بارش نہ ہو۔“ اپنے کمرے سے باہر پر آمد سے پہلے جیتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں بے اختیار سنا مانی تھی۔ آج انہیں سوات سے کلام جانا تھا۔

”تا تو کلام طلوع سوات کی تحصیل ہی، مگر پھر بھی لوگ ہنگوڑہ اور۔۔۔ جو شریف ہی، سوات۔“ بولتے تھے۔

”آج سے ہر سال ان کے سوا میں جس جگہ کل وہ نماز پڑھتا تھا آج بھی وہاں ہی۔ آج وہ نماز نہیں پڑھ رہا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے لگا ہوا تھا۔“

”جرا میں تھیں، بلوچستان کے، شہر اور۔۔۔ کہہ ہوئے۔“

”وہ۔۔۔“

”ہاتھ کھنوں پر رکھے بیٹھا یوگا کر رہا تھا۔“

”وہ دبے قدموں سے چلتی اس کے عقب میں آئی، جوتے ایک طرف اتارے اور اس کے پیچھے دائیں طرف اسی کے بدھا والے انداز میں آلتی پالتی کر کے بیٹھ گئی۔“

”افق نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھوں کی پوزیشن بدلنے ہی لگا تھا کہ کسی احساس کے تحت پلٹ کر دیکھا۔ ریٹے کو اپنے پیچھے یوگا کے Sukhasana پوز میں بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت در آئی۔“

”مجھے یوگا؟“ اس نے یک لفظی استفسار کیا۔

”صبح بخیر۔ ہاں یوگا۔“

”وہ گھاس پر لیٹ گیا بازو سر کے پیچھے کر کے پاؤں کیاری کی اینٹوں تک لمبے کیے اور فلور پوز کرتے ہوئے پوری قوت سے اینٹوں کو دھکیلا۔“

”تک سے کر رہی ہو یوگا؟“

”اوہ منٹ پہلے سے۔“ وہ اپنے جواب پر خود ہی ہنس پڑی۔

”واقعی؟“ کھٹے کو لٹے لٹے سینے تک لے جاتے ہوئے افق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔ میں سولہ سال کی عمر سے یوگا کر رہی ہوں۔“

”تب ہی تم اپنی عمر سے کم دیکھتی ہو۔“ وہ اب بائیں کھٹے کو آہستہ آہستہ اوپر بٹخ کر رہا تھا۔

”شکریہ۔ میں کتنے کی دیکھتی ہوں؟“

”سولہ سال کی!“

”میرا خیال ہے اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”جھوٹ نہیں، مبالغہ آرائی۔“ وہ ہولے سے ہنسنا۔ ”تم آکس بائیں برس تک کی دیکھتی ہو۔ اس سے زیادہ نہیں۔“

”وہ یوگا چھوڑ کر لان میں رکھی سفیر کر رہی رہا بیٹھی۔“

”کیا پرائس ہو گئیں؟“ وہ ماؤنٹین پوز کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

”اوہ تو۔۔۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں ہفتے میں صرف تین دفعہ یوگا کرتی ہوں، آج وہ دن نہیں ہے۔“

”وہ سر ہلا کر خاموشی سے یوگا کرتا رہا۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ دور جنگل سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں وقفے وقفے بعد سنائی دے رہی تھیں۔“

”کتنے بے گناہ ہے کلام؟“ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی، سوئی پوچھ لیا۔

”مفلر نے اٹھ بچے کا کہا تھا۔“ اپنی مشق ختم کر کے اس نے گھاس پر رکھی کیپ اُٹھاسنے سے پہلے اتار دی تھی، اٹھا کر سر پر رکھی، اور میں پڑی گھڑی اپنی بائیں کلائی میں سینے لگا۔

”تم پہلے کتنی دفعہ ان علاقوں میں آچکے ہو؟“

”دو دفعہ پہلے آیا تھا، ایک دفعہ تب جب مجھے شہر بروم نو سر کرنے آیا تھا اور دو سہری دفعہ دو سال پہلے۔“ وہ گھاس پر بیٹھا جو گرز پھین رہا تھا۔

”دو سال پہلے کیوں آئے تھے؟“

”یو نہیں۔“ وہ سر جھکائے جو گرز کے قے بند کر رہا۔

پریشہ جواب کے انتظار میں اس کے ہاتھوں پر نگاہیں مرکوز کیے رہی بائیں کلائی میں پستی گھڑی کو آج پہلی دفعہ اس نے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے سیاہ چمکتے ڈائل کے درمیان میں بیروں کا چھوٹا سا ہرام بنا تھا۔

"اچھی ہے تا میری گھڑی؟" اسکندر یہ سے لی تھی۔ معمری اپنا ٹریڈ مارک ہر چیز میں بہت شوق سے ڈالتے ہیں۔ "وہ دس گر کہتا ہوا پینٹ بھاڑتا آٹھ کھڑا ہوا۔" "یہ ہمارے وائٹ پیس میں آخری دو گھنٹے ہیں۔ کو یہاں کھڑے پھرتے ہیں۔" وہ اس کے ہمراہ بیڑیوں کی طرف بلی آئی۔

"تم نے وہ کمرہ دیکھا ہے پہلی منزل پر جس کو رائل سوئٹس کہتے ہیں؟ اس میں ملکہ الزبتھ تھری تھیں۔" وہ بیڑیوں سے اترتے ہوئے اس کو اس تین سو سال قدیم وائٹ پیس کی تاریخ بتا رہا تھا اس نے بے اختیار جمائی روکی۔

"یہ ہوٹل پہلے وائی سوات کا محل تھا۔ پھر یہ وہ بیڑیاں اترتے ہوئے اسے بہت کچھ بتا رہا تھا وہ پورے گھر گئی۔ اسے وائٹ پیس کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر محض اس کا دل دکنے کو رہتی رہی۔

سوئس کا بچہ پیچھے ہموڑ لڑکے کے روش پر اسے تودہ دیا سالان قاسمی میں ڈوبا تھا۔ روش کے اختتام پر ناشپاتی کا درخت تھا جس کے ساتھ کرسی ڈالے وہ بوڑھا سیلوینی گارڈ بیٹھا تھا۔

"تم کیا ہر سال یونہی بیرو سیاحت کے لیے نکل جاتے ہو؟" وہ دونوں چلتے چلتے روش کے ایک طرف بے نیلی ٹاکر ڈالے فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔

"میرا سال؟ میں تو سال کے دس مہینے مگر مگر پھر ہوں۔ میں پیدا کی سیاح ہوں۔ مجھے دنیا کو ایک سیلور (دریافت) کرنے کا شوق ہے اس کو گھوم پھر کر دیکھنے کا شوق ہے۔ سیاحت انسان کی زندگی بدل ڈالتی ہے آپ ایک دفعہ پہاڑوں پر نکل جائیں تو واپسی پر آپ ویسے نہیں ہوتے آپ بدل جاتے ہیں پہاڑوں کا سفر انسان کو بدل ڈالتا ہے۔ اس کے بعد

"Life is Never the same again" "میسز نے کہا تھا اگر عالمی لیڈر چند دن کسی پہاڑ پر اسی جگہ جاتے گزاردیں تو دنیا کے تمام معاملات اور مسائل حل ہو سکتے ہیں۔"

"اگر وہ اچھے کوہ چا بھی چند دن راکا پوٹی پر سنا کر دس تو یقین کر ان کے بھی سارے مسائل ہو سکتے ہیں۔" اس نے بڑی سنجیدگی بھری معصومیت سے کہا تھا۔

مگر وہی۔ "ہو سکتا ہے اس مسئلے پر وہ جائیں۔" "تم ان تم ایک کلا تیر ہو تمہیں دنیا کا سب سے خوب صورت پہاڑ دیکھنا چاہیے۔"

"میں نے تصویریں دیکھ رکھا ہے۔" "تمہیں اسے سر کرنا چاہیے؟" "وہ میں خیالوں اور خوابوں میں کئی دفعہ کر چکی ہوں۔" "مگر تمہیں "میرے" ساتھ سر کرنا چاہیے۔" اس نے "میرے" پر زور دیا۔

"ناممکن ہے کیونکہ یا مجھے قراقرم کی پہاڑیوں کا دوبارہ نہیں دیکھنے دیں گے نہیں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں یہ گہرا کہاں جا رہا ہے؟" اس کے اصرار سے بچنے کی بجائے اس نے اس کی چوڑی گارڈ مارک ڈال دی جو کسی کام کے لیے کسی کی عمر کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ افق نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ "اس کو شاید کسی نے بلایا ہے۔"

تم نے بھی چوڑی کی ہے؟" افق نے گردن واپس گھما کر انہیں سیکر کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔" "تمہیں نہیں کی۔ مگر اب میرا دل کر رہا ہے۔"

"چوڑی کرے گا؟" "نہیں تم سے کروانے کا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" افق نے اسے گہرا دیکھا۔ "تمہیں اس سے کتنا شوق ہے؟" "میں خوشامد سے متاثر نہیں ہوتا۔ سوری؟" "اور تم ایک بہت اچھے انسان بھی ہو۔"

"میں جی من کر بھی غلط کام نہیں کرتا۔" "اور میں دعا کروں گی کہ تم راکا پوٹی سر کر لو۔ اگر تم مجھے اس درخت پر سے ایک ناشپاتی توڑ کر لاؤ تو؟"

وہ چند لمحوں خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ "بہت بہتر لانا ہوں؟" وہ چند قدم کے فاصلے پر آگے درخت تک گیا اور ہاتھ بڑھا کر ایک شاخ کو اتنی زور سے پکڑا کہ اس پر نیچی نیلی چڑیا سم کراؤ گئی۔

"اوہ۔ تم نے اسے ذرا دیا۔" پری نے تاسف سے

آسمان پر اڑتی چڑیا کو دیکھا۔ شاخ ہاتھ میں پکڑے افق نے رک کر بغور اسے دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ "تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو جو چڑیا کی پروا اور موروں سے سوری کرتی ہے۔" (زندگی میں؟ کیلئے اس کی زندگی میں آچکی تھی؟) "اور ہر ترکی میں ہوتی ہیں ناشپاتیاں؟" اس نے بے حکا سوال کیا۔

"ترکی میں سب کچھ ہوتا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک سوئی تازی رستلی سی ناشپاتی توڑ لی۔ "اس کو میں مبالغہ آرائی کہوں؟"

"نہیں، تم اس کو ایک محب وطن ترک کا نمونہ کہو۔" وہ مسکراتا ہوا ناشپاتی لیے اس کے قریب گیا۔

"اور ہاں نہیں ایک ترک سیاح کی طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیں۔" اس نے جھک کر ناشپاتی پھینکی پر اس کی طرف بڑھائی۔

شکر ادا کیا سارے ترک چوڑی کے تحفے دیتے ہیں اس نے اسے چراتے ہوئے ناشپاتی اٹھالی۔

"اسے چلو زیادہ ہو نہیں تمہارے ہی کہنے پر لایا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں فوارے کے کنارے بیٹھے تھے اور ناشپاتی بچے لٹکا رہے تھے۔

"یہ ایک ناشپاتی ہے۔" میں شروع کروں گی اور تم ٹھیک؟" اس نے ناشپاتی کی ایک بانٹ لی اس کا ڈالٹھ کھینچا اور اسے اس کی ہسی چھوٹ گئی۔

"نہیں کیوں رہتی ہو؟"

"یہ ناشپاتی ہے۔" وہ مسلسل ہنسی جاری تھی۔ "اور کرواؤ چوریاں۔ دیکھ لیا یہ ہوتا ہے چوڑی کا انجم۔ تم ناشپاتی سے ملتے جلتے پھل کو ناشپاتی سمجھ کر دعوہ کرنا نہیں بہت اچھا ہوا۔" وہ مصنوعی انداز میں ڈانٹ رہا تھا وہ ہنسی جاری تھی۔

"اچھا سنو مجھے بھی پتہ تھا اور اس کو ختم نہیں کرتا۔ یہ ہم اس فوارے کے پیچھے رکھ دیں گے۔ یہ ایک یادگار ہے۔" بھی ہم دوبارہ اصرار آئے تو اسے ضرور ڈھونڈیں گے۔" اس نے ایک بانٹ لے کر اوجھ کھائے بگو کوٹھے کو فوارے کے پیچھے کر کے ایک جگہ چھپا دیا اور وہ جو پنے جاری تھی ایک تخت رک گئی۔

"بکھی ہم دوبارہ اصرار آئے۔" ہم؟" افق نے "ہم" بولا تھا؟ مگر کیوں؟ اس نے ایک نگاہ اپنی انگلی میں پستی لکھنؤ کی انگوٹھی پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔ مستقبل کسی آٹھ ہزار میٹر بلند پہاڑ کی چوٹی کی طرح دھند میں لپٹا تھا۔

جمعہ 29 جولائی 2005ء

"ارم تم اپنے باؤل میں یہ بھی لکھنا کہ جب ہم لوگ میرا مطلب ہے جب ہمارے کردار کلام کی مال روڈ پر پہنچے تو وہاں مری مال روڈ کی طرح کارش تھا پورے پاکستان کے لوگوں کے وہاں جمع تھے اور یہ بھی لکھنا کہ کلام سے روز صبح نو بجے کرائے کی لینڈ کروزر پہنچیں اور پچاروڑ دو مختلف "دوس" پر جاتی ہیں اور سنو تم یہ بھی لکھنا کہ تمہارے کردار آٹھ چیل ڈالے روٹ کے بجائے ماہو ڈھنڈ بھیل ڈالے روٹ پر جارہے تھے ہماری طرح۔ اور۔"

وہ چاروں آگے پیچھے مال روڈ کے کنارے رہ جاتے ہوئے دائیں طرف بٹتے دیر پر بنے اس لکڑی کے قی کی طرف جارہے تھے جس کے دوسری طرف سڑک پر لینڈ کروزر زاور پیراڈوز کی ایک بسی قطار کھڑی تھی ان کرائے کی گاڑیوں کے ماہر ڈرائیور اپنے اپنے مسافروں کا انتظار کر رہے تھے۔ "آگے میں جانا ہوں اور آگے تم لکھنا ان کے پاؤں کے نیچے سڑک تھی اور سر پر آسمان تھا اور دریا کاپانی شور بہت عجا تھا۔" وہ ارم کو جس طرح اچھی یاد سے رہی تھی اس طرح اس کے انداز کی نقل کرتے ہوئے وہ بولا تو پریشہ نے براہ راست بنایا۔

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ میں اسے صرف مشورہ دے رہی تھی۔"

"ہاں تو میں بھی مشورہ ہی دے رہا ہوں۔" وہ اسے بڑا رہا تھا وہ خفگی سے سر جھٹک کر رفتار تیز کر کے آگے نکل گئی۔

"سنو ارم ایک خبر سنو؟" "پیچھے آتے افق نے ڈانٹ باند آواز میں محض اسے سناتے ہی غرض سے کہا۔ پریشہ نے چلتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ "ارم تو ماڑ ہو مر پاکستان میں ہے۔"

کانوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود اسے سنائی تو دیا تھا اخیر ہی

ایسی تھی کہ وہ جھٹکے سے مڑی اور پوری آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔ ”واقعی؟ کدھر؟ کلام میں ہے؟“
”میں تو ارسہ کو بتا رہا تھا۔“ وہ پٹانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہاں تو اسے ہی بتاؤ میں کون سا من رہی ہوں۔“ اس نے شانے جھٹکے اور آگے ہولی۔

”ویسے ارسہ وہ ناٹنگا پرست جا رہا ہے۔“
”میں نہیں سن رہی!“ پریشے نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اتنی بلند آواز میں کہا کہ قریب سے گزرتے دو لڑکے رک کر اسے دیکھنے لگے۔

”تم لوگ کیا سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ٹین ایجنز والی حرکتیں کر رہے ہو؟ تیز چلو!“ نشاء نے گھر کا تو اسے احساس ہوا سو پل پار کرنے تک وہ سارا راستہ خاموش رہی۔

وہ اس گھرے اور سلور پیراڈو پر ماہو سٹڈ کے روٹ پر جا رہے تھے۔ زیادہ گاڑیاں ماہو سٹڈ ہی جا رہی تھیں۔ آنسو جھیل ریف ٹورسٹ سٹ کم جاتا تھا۔ کرائے کی ان گاڑیوں کے ڈرائیور پر خطر راستوں پر ڈرائیونگ میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور، کراچی میں گاڑی چلانے والا عام ڈرائیور کلام سے آگے کے ان راستوں پر گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔

وہ پیراڈو کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور اسے پہچان گیا تھا۔ کل شام کلام پہنچنے کے بعد یہ پریشے ہی تو تھی جس نے ظفر کے ساتھ اس کی سوانہ کی سوانہ کا سودا طے کیا تھا۔ ظفر بارہ سو رہتا چاہتا تھا، جبکہ ڈرائیور بند رہ سو ناٹنگ رہا تھا۔ پریشے کو تین سو روپے کے لیے اتنی تکرار اچھی نہیں لگی، سو اس نے معاملہ خود ہی سیٹل کرادیا تھا۔

وہ پیراڈو کے ساتھ کھڑی پل کی جانب دیکھنے لگی، جہاں وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آرہے تھے۔ افق سب سے آگے تھا، بلیک جینز، میرون شرٹ، سفید ٹورسٹ جیکٹ، گردن میں سرخ مفلز، سر پر پی کیپ، پاؤں میں جوگرز اور کندھے پر بیک بیک اٹھائے، چپو ٹم چپا تا وہ اس کی جانب آ رہا تھا۔

رنگوں کے اس امتزاج پر پریشے کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ اس نے خود بھی سیاہ ٹراؤزرز کے اوپر میرون کشمیری کڑھائی والا کرتا اور بڑا سادہ پٹے لے رکھا تھا۔ بالوں

کو اس نے کیچو میں باندھ رکھا تھا اور پاؤں میں ٹک اور وائٹ جوگرز تھے۔

افق پیراڈو کی فرنٹ سیٹ پر جبکہ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے بالکل پیچھے بیٹھی تھی۔ اسے افق کا چہرہ ٹھیک سے دکھائی دے۔ اسے خود پر بھی حیرت ہوئی کہ جب وہ مری میں ملے تھے تو وہ اس سے بات تک نہیں کر رہی تھی اور اب وہ کتنے اچھے دوست بن گئے تھے؟ اس سفر میں اسے پانچ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔

پیراڈو پر خطر راستوں پر دوڑنے لگی تو وہ کھڑکی سے باہر دائیں طرف بہتے نیلے دریا کو دیکھنے کے بجائے افق سے پوچھنے لگی۔ ”تمہیں کیسے پتا کہ تو مازیا کستان آیا ہوا ہے؟“ ”میں اس کامیڈیا ایڈوائزر تو ہوں نہیں، ظاہر ہے اخیر میں ہی پڑھا ہے۔“

”تم اس سے کبھی ملے ہو؟“ اسے جاننے کا بہت مذاق تھا۔

”جسے جہاں زیب، یہ کلائمبنگ ورلڈ بہت چھوٹی اور کھلی ہوتی ہے، یہاں درجنوں بار آپ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ میں تو ماز سے پچھلی بار ناٹنگا پرست بن کر آیا تھا، وہ آ رہا تھا اور میں جا رہا تھا۔“

”کیسے دیکھتے ہیں؟ اتنا ہی گڈ لکسنگ جتنا تصویر میں آتا ہے۔“

”اب میں اس سے جیولیس جا رہا ہوں، اس لیے میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔“ وہ مسکین کی صورت بنا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا تو وہ بیڑوائی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ”ویسے پری۔“ اس نے محض چھیڑنے کی غرض سے اسے نکارا۔ ”تمہاری گورنمنٹ ان علاقوں میں کیسے کیوں نہیں لاتی؟ یہ لوگ دیار کی قیمتی لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔“

”گورنمنٹ وردی اتار دے، یہ بہت ہے۔ گیس بھی آتی رہے گی۔“ نشاء گورنمنٹ کے ذکر پر بد مزہ ہو گئی۔ وہ ہنس پڑا۔ پریشے خاموش رہی کیونکہ غیر ملکوں کے سامنے وہ اپنے ملک کی کسی خامی کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ افق ٹاپک کو بند کر دے، چور نظروں سے اس نے ارسہ کو دیکھا، ارسہ نے بات سنی ہی نہیں تھی، وہ مسلسل کھانے سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”کیا ہوا ارسہ؟“

”نہیں ابھی آتا ہے تو رکھاتی ہوں۔۔۔ پچھلے سال تو اصرار ہی تھا۔ پتا نہیں کدھر گیا۔“ وہ دیر دور تک پچھلے پھاڑی سلسلے کو مٹلاتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”پھاڑ تھا پتا نہیں کدھر گم ہو گیا ہے۔“ وہ فکر مند سی تھی۔

”لیس۔۔۔ ان کی سنیں۔ پھاڑ بھی گم ہوئے ہیں۔“ ارسہ میڈم؟“ افق خوب جہاں تھا ارسہ نے سنائی نہیں۔

”مجھے لگتا ہے اس ڈرائیور کی گاڑی کے مالک سے کوئی دشمنی ہے۔ تب ہی اتنے کنارے پر ڈرائیور کر رہا ہے۔ ابھی پھر ادھر ہوا اور ہم گئے نیچے۔“ انشاء نے پریشے سے انگریزی میں کہا اس نے کھٹ سے وہی بات ڈرائیور سے کہہ دی۔

”پانی اب بارہ روز کا روٹ ہے۔“ آپ نہیں گروگی اللہ خیر کرے گا۔“ وہ بھیچنے لگا۔

”آپ“ ایسے کہہ رہا ہے جیسے ہم اکیلے کریں گے خود بھی تو ساتھ ہی گرنے لگا۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ اسے اتنے بے خطر راستے سے بہت خوف آ رہا تھا۔

”الٹی تصویریں بنا رہا تھا ارسہ ابھی تک پریشانی سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی پریشے نے لکڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔“ کتنا قاصد رہ گیا ہے؟“

”گھنٹے تک اشو دلی پہنچ جائیں گے۔“ جواب افق نے دیا تھا۔ وہ آج بہت بول رہا تھا اور خاصے ہشاش بشاش موڈ میں تھا۔ ”پہلے اشو دلی رکھیں گے پھر گلشن پھر آبشار پر اور آخر میں جھیل جہاں ہم آج رات گھاس پر گزریں گے۔ پری ایم اس ملک میں رہتی ہو اور تم نے ابھی تک یہ جگہ نہیں۔“

”وہ آگیا۔ وہ دیکھو۔ بالکل سامنے۔“ ایک دم ارسہ خوشی سے چلائی تھی۔ ”وہ سامنے ہے“ وہ دیکھو۔

”جھگوری؟“ ادرہ؟ کلام میں؟“ پریشے نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا جہاں بالکل سامنے جامنی پھاڑوں کے سلسلے کے درمیان ایک الگ سارے سے ڈھکا سفید پھاڑ کھڑا تھا۔

”یہ جھگوری ہے؟ مگر جھگوری تو اسگردو سا بیڈ پر ہے۔۔۔ قراقرم کے پھاڑوں میں۔۔۔ ہے نا افق؟“ اس نے

الٹ کر افق کو مخاطب کیا ”گروہ اپنی گود میں رکھ کر کمرہ 1 دیکھ رہا تھا اس نے جواب نہیں دیا۔

”یہ جھگوری نہیں ہے۔“ مگر مقامی لوگ اسے جھگوری کا چھوٹا بھائی کہتے ہیں۔ بالکل وہی اہرام والی شکل ہے اس کی۔ ویسا ہی دیکھتا ہے؟“ ارسہ بڑی خوشی بخاری تھی۔

”واقعی۔ بالکل ویسا ہی ہے۔“ اس کے لمبے میں قراقرم آیا تھا۔ آخر کو جھگوری دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی اس کے ملک میں تھی وہ غریبوں نہ کرتی؟

”ویسے افق اب جھگوری کا نام کے ٹوکس نے رکھا تھا۔“ افق اپنے کمرے میں مصروف تھا اس نے جواب نہیں دیا۔

”افق! پڑھنے بھرا ہے پکارا۔“ ”پتا نہیں مجھے یہ سیٹ کرنے دو۔“ وہ کمرے بچکے بے زاری آواز بولا۔ پریشے نے بری طرح چونک کر دیکھا۔

”پتا جاتی ہوں پری آئی! جب کچن میں جی شکری نے قراقرم کے پھاڑوں کا سروے کیا تھا تو اس نے جس ترتیب سے پھاڑ دیئے تھے اسی ترتیب سے ان کا نام رکھ دیا تھا۔ کے دن کے ٹوکے تھری اور کے فورڈ وغیرہ۔“

”کے سے تم؟“ انشاء نے پوچھا۔

”Kis for Israkorams“ وہ سر سے بولی۔ ”ہے نا پری آئی؟“ اس نے تاکید چاہی۔

”ہوں۔“ پریشے نے تو اس کی بات ٹھیک سے سنی بھی نہیں تھی۔ وہ تو افق کا کمرہ ہی تھا جو ہر جگہ کے کمرے کے ہنسنے اور ہنسنے پر ہنسنے کا نام لے رہا تھا۔ کہ اس کا ذہن نہیں اور ہے۔ وہ ایک دم لٹا بے زار اور آگاہیوں گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

اشو دلی پہنچنے تک سارا راستہ وہ اور افق خاموش رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے پر جھکا رہا اور پریشے خالی الذہنی کی کیفیت میں لکڑی سے باہر نیچے پڑے نیلے دریا کو دیکھتی رہی۔

”کبھی بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ افق اس سے کچھ کہے اپنے اور اس کے نامعلوم ان کے تعلق کی وضاحت کرے۔“ اسے بتاتے کہ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان اگر کچھ ہے تو وہ کیا ہے۔ مگر یہ سب وہ اس سے کہنے سے قاصر تھی۔

اشو فلک بوس پھاڑوں کے درمیان بنی ایک چھوٹی سی وادی تھی جس کے درمیان سے اشو کا دریا بہتا تھا۔ وادی میں سیاحوں کی خاصی گھاٹی تھی۔ ان کی بیرونوں کے ساتھ پتھار اور جھیلوں کا جو ایک پورا قافلہ کلام سے نکلا تھا ان میں سے تقریباً سب ہی گاڑیاں اشو میں رک گئی تھیں۔ مزید پچھے آ رہی تھیں۔

”تو۔ اس کیمین میں چلتے ہیں۔“ یہ سلی بات تھی جو ادھر آرافق نے کی تھی اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے پیچھے چل دی۔

سڑک کے دائیں طرف نیچے شور مچا رہا تھا۔ سڑک کے بائیں جانب پریشے کا دریا کے اوپر لکڑی کا ایک کیمین سا جگہ تھا۔ اس کا فرش لکڑی کے تختوں کا تھا جن کی درزوں سے کئی فٹ نیچے بہتا تھا دریا دکھائی دیتا تھا۔ جس طرف سے کیمین میں داخل ہوئے وہ کھلی تھی۔ تین اطراف میں نیچے کر کے لکڑی کے پھٹے گئے تھے۔ وہ کیمین بالکل لگ رہا تھا۔

”پتا جاتی ہوں پری آئی! جب کچن میں جی شکری نے قراقرم کے پھاڑوں کا سروے کیا تھا تو اس نے جس ترتیب سے پھاڑ دیئے تھے اسی ترتیب سے ان کا نام رکھ دیا تھا۔ کے دن کے ٹوکے تھری اور کے فورڈ وغیرہ۔“

”Kis for Israkorams“ وہ سر سے بولی۔ ”ہے نا پری آئی؟“ اس نے تاکید چاہی۔

”ہوں۔“ پریشے نے تو اس کی بات ٹھیک سے سنی بھی نہیں تھی۔ وہ تو افق کا کمرہ ہی تھا جو ہر جگہ کے کمرے کے ہنسنے اور ہنسنے پر ہنسنے کا نام لے رہا تھا۔ کہ اس کا ذہن نہیں اور ہے۔ وہ ایک دم لٹا بے زار اور آگاہیوں گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

اشو دلی پہنچنے تک سارا راستہ وہ اور افق خاموش رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے پر جھکا رہا اور پریشے خالی الذہنی کی کیفیت میں لکڑی سے باہر نیچے پڑے نیلے دریا کو دیکھتی رہی۔

”کبھی بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ افق اس سے کچھ کہے اپنے اور اس کے نامعلوم ان کے تعلق کی وضاحت کرے۔“ اسے بتاتے کہ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان اگر کچھ ہے تو وہ کیا ہے۔ مگر یہ سب وہ اس سے کہنے سے قاصر تھی۔

تھے۔ مجھے دکھانے کو لی کو بیار کر رہے تھے۔ ہے؟“ ”تمہیں وہ بات ابھی تک یاد ہے؟“ وہ جواب دیے بنا گردن پھیر کر پانی کو دیکھنے لگی۔

”آئی ایم سوری فار ایٹ پری میں۔۔۔ بس۔۔۔ پتا نہیں کبھی کبھی مجھے یاد ہو جاتا ہے۔“ اس نے گردن موڑ کر اسے نہیں دیکھا وہ پوچھی پیچھی دریا کو دیکھتی رہی۔ چند لمبے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پتھروں سے سرخٹے پانی کے شور کے بازو جو اسے بہت خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

”جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں بارگاہ کی پھاڑیوں پر سلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا؟ مجھے لگا تھا میں واقعی کسی پری کو دیکھ رہا ہوں۔ تم نے واسٹ اور پتھار رنگ میں رکھا تھا تمہیں یاد ہے؟ میں یوں کبھی بھی اجنبیوں سے فریٹک نہیں ہوتا میری طبیعت۔ پتھار اور پتھار سوڈی کہ لو! کھڑکہ لو۔۔۔ مگر تم سے بات کرنے کو میرا دل چاہتا تھا۔“

”کیمین کے دائیں طرف سے دھوپ اندر آنے لگی تھی۔ سورج کی شعاعیں ڈائریٹ پریشے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں وہ اس کے دائیں طرف سے آکر کھڑکھڑا دھوپ کا راستہ رک گیا تھا۔

”تمہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں تمہیں جانتا ہوں۔ ہزاروں برس سے جانتا ہوں۔ تم میری ذات کا وہ گمشدہ حصہ ہو جو نوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ ہم دونوں صدیوں پہلے کسی اور دنیا میں پھجڑے تھے اور اس روز مارگلہ کی پھاڑیوں پر پھر سے مل گئے تھے۔ تمہیں ایسا لگتا ہے پری؟“

پریشے نے سر جھکا لیا اپنے جو گزرتے لکڑی کے تختوں کی درزوں سے اسے جھاگ اڑا تا تھا پانی نظر آ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا وہ کچھ نہ بولی۔ تب ہی اسے ارسہ کی آواز سنائی دی وہ افق کو بلا رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ چند گز کے فاصلے پر لکڑی دور ہی سے بہت بلند آواز میں اسے کسی ٹریک کا قاری رہی تھی۔ وہ سر ہلا کر پریشے کے دائیں طرف سے ہٹ گیا۔ سورج کی تیز شعاعیں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں اسے لگا وہ اس کے جانے سے ایک دم تنہا رہ گئی ہو۔ بھری دھوپ میں بالکل تنہا۔

ارسہ کی طرف جاتے افق کی پشت کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے گوشے بھگتے چلے گئے۔ ان دونوں کا سات دنوں کا ساتھ تھا۔ وہ ان مزید رہ گئے

تھے، پر سول انمول نے واپس چلے جانا تھا، پھر راستے اور منزل میں جدا ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں مگن ہو جاتے کی اور وہ سڑک کو پتہ دینا کی سب سے حسین چوٹی سڑک کے واپس چلا جائے گا اسے تو شاید یاد بھی نہ رہے کہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر جب بادل نیچے اترے ہوئے تھے تب اسے سچ سڑک پر ایک لڑکی ملی تھی وہ بھلاوے گا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس نے سوات کے سرخاراں میں نو دن بتائے تھے وہ نو دن جو صدیوں پر بھاری تھے یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ وہ مسافر تھا اور وہ جانے کے لیے آیا تھا اور خوراس کی سیف سے تین ماہ بعد شادی ہونے والی تھی وہ اس مسافر سے متاثر ہو رہی تھی۔

خفی سے آنکھیں رگڑ کر وہ نیچے شور مچاتے دریا کو دیکھنے لگی۔

میلشٹر پر گاڑی نہیں روکی تھی، ان کے خیال میں وقت کا ضیاع تھا۔ آبشار تک کے تمام راستے میں گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ نشاء سو رہی تھی، ارمہ اسٹیشن تک کا ہال پڑھ رہی تھی، افق کھلی کھڑکی پر کسی بولے مسائل باہر دیکھ رہا تھا، اب وہ دریا اس کی طرف تھا، جب پریشہ دریا پر پتوں پر لگاؤں لگائے، کسی بیتے گئے کے فوٹوں میں لکھتی تھی۔

اس کے ذہن میں افق کے الفاظ گردش کر رہے تھے وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہ کیا نہیں کہہ رہا تھا؟ کوئی اظہار کوئی اعتراف کوئی اقرار؟ یا پھر وہ کھس کھسوں سے کھیل رہا تھا؟ اور وہ ایک طرف محبت کا شکار تھی۔ جس قطرے جتنی محبت کو اس نے سیپ میں بند کر دیا تھا وہ قید وہ کر بھی سکتی تھیں چکا تھا اس کو اور آک خاصی دیر سے ہوا تھا۔

وہ آبشار بہت بلندی سے گر رہی تھی۔ اس کا منبج پہاڑ کی چوٹی کے قریب تھا وہاں سے شروع ہو کر وہ کئی سو فٹ نشیب میں سڑک تک آتی تھی، اور سڑک کے نیچے سے ہو کر اشوکے دریا میں گر جاتی تھی۔

سڑک کے کنارے چند کولڈ ڈرنک گارنز بنے تھے وہاں خاصی گھما گھسی تھی، ان کے آنے سے پہلے بھی وہاں خاصی بڑی تعداد میں بچے، بوڑھے، نوجوان جوڑے، فیملیز کھوم پھر رہی تھیں۔ چند لڑکے پتھروں پر چڑھتے ہوئے اوپر آبشار کے منبج تک جا رہے تھے، ایک سبز کپ

والا لڑکا سب سے آگے تھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنی بڑی آبشار پاکستان میں ہے۔“ نشاء نے ان تینوں کے ہمراہ پتھروں پر اوپر چڑھتے ہوئے بے اختیار کہا تھا۔ وہ پتھر آبشار کے کنارے پر ہی تھے، اتنے خطرناک کہ ذرا پاؤں پھسلے اور بندھ پانی میں جا کرے۔ تیز رفتار بہتے پانی میں تو یوں بھی لاش نہیں مل کرئی۔ ”میں نے ہیٹ خوبصورتی کے پارے میں ناروان کاٹان کا نام سنا تھا۔“

”نشاء مانتہ مست کرنا، ٹھنڈا ناروان کاٹان اتنے خوبصورت نہیں جتنا ان کو کہا جاتا ہے۔ وہاں پہاڑ قدرے خشک ہیں اور واحد خوبصورتی جھیل سیف الملوک ہے جس پر پریاں اترتی ہیں۔ ناروان کاٹان کو اگر کوئی پاکستان کا بہترین تقریبی مقام سمجھتا ہے تو اس نے یقیناً ”کاٹان“ سوات کا حسن نہیں لکھا ہوتا۔ میں ان دونوں جگہوں کو کسی وقت کر چکا ہوں، میری رائے میں ناروان کاٹان، شکر ہے۔“

”جگہیں سوات کے وکلام سے زیادہ حسین نہیں۔“

وہ آگے بڑھتے، سر میٹھا کر چڑھ رہے تھے، نشاء اور ارمہ اگلے نیچے کی جگہ پر رگ کی تھیں، افق کو ایک خالی چارپائی نظر آئی، اس نے کسی سختی مزدور کی طرح وہ چارپائی اپنے کندھے پر اٹھائی اور اوپر چڑھنے لگا۔

”بس یہیں رکھ دو۔“ وہ سڑک سے کافی اوپر پتھروں پر چڑھتے ہوئے تھے، افق نے اس کے کھنکھرتے پتھروں اور پانی کے درمیان چارپائی رکھ دی۔

”گندے پتھروں کی طرح جوتے اتار کر پانی میں پاؤں مارنا مجھے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا ہے۔“ اس نے جیسے ہوئے جو کر، براہ راست آ کر کھڑے ہوئے، ”اور اس جگہ پر براؤز نہ کرنے سے کافی پرکھ رہے ہیں، سید پاؤں ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے۔ افق بھی ساتھ بیٹھ گیا، مگر اس نے جو گرز نہیں اتارے۔ ”تم بھی جوتے اتار دو نا، اتنا مزا آ رہا ہے۔“ وہ پتھروں کی طرح پانی میں اپنے پاؤں سے دائرے بنا رہی تھی، افق نے مسکرا کر سر ہٹائی میں ہلا دیا۔

”تم آن افق جوتے اتار دو۔ پانی اتنا ٹھنڈا ہے، لگا نہیں یہ جولانی کا مینہ ہے۔“ افق نے پھر بھی جوتے نہیں اتارے۔ اس کے بجائے اس نے قدرے جھک کر ہاتھ پانی میں ڈال دیے۔

”تم جو گرز بھی اتار دو۔“ اس نے تیسری دفعہ اصرار کیا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ گردن اونگی کر کے اور پہاڑ سے پھوٹی آبشار کو دیکھنے لگا۔ اسے حیرت ہوئی تھی وہ اس کی بات فوراً ”مان جاتا تھا تو اب؟“

”یہاں پر ایک ہوٹل بنایا جاسکتا ہے، مگر اس کے لیے پہلے ان کو اس علاقے کی مٹی کے ٹیسٹ کرانے پڑیں گے اور۔۔۔“

”میں بھول گئی تھی کہ تم انجینئر ہو، یاد کروانے کا شکریہ۔“ وہ اس کی بات پر ہنس پڑا۔

”بہت جلدی بھول جاتی ہو مجھے بھی اتنی جلدی بھول جاؤ گی؟“

”بیسے تم نے کس چیز میں انجینئرنگ کی ہے؟“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے جھکی ہوئی پانی میں ہاتھ مار رہی تھی۔

”میں جیولوجیکل انجینئر ہوں۔“

”اب پھر ہم پاکستانیوں کے تو کسی کام کے نہیں ہو۔“

”پانی سے جیسے اڑ رہے تھے وہ چہرے پر آگے پانی کے جیسے صاف آگے ہوئے سیدھی ہو کر ٹھنڈی سے مسکرائی۔

”اچھا۔“

”ہاں۔ آخری زلزلہ 80 سال پہلے کوئٹہ میں آیا تھا، اس سے پہلے 35 سال لوگ مر گئے تھے۔ پھر اس کے زلزلہ نہیں آیا۔ اس کے تم ہمارے تو کسی کام کے ہو۔“

”مگر صاحب، یہ محض کے مطابق صرف بلوچستان میں ہے۔“

”زلزلے آئے تھے۔“

”میں نے سنا ہے کہ اسے کر رہی ہوں۔“ وہ سر ہٹاتے ہوئے کہتی تھی۔

”میں چند سال پہلے جب پہلی دفعہ ایورسٹ سیر کرنے گیا تھا تو ترکی میں زلزلہ آیا تھا۔ میں ایکسیپڈیشن لینڈ کر رہا تھا اور ہم Balcony (بالکونی) پر تھے، جب مجھے زلزلے کی اطلاع ملی۔“ وہ اوپر آبشار کی چوڑی دھار کو دیکھتے ہوئے یاد کر کے بتا رہا تھا۔

”اور۔۔۔ تو پھر بالکونی سے ایورسٹ کی چوٹی تک کا سفر یقیناً تم نے ڈپریشن میں کیا ہو گا۔“

”افق نے گردن پھیر کر سنجیدگی سے پریشہ کو دیکھا۔

”میں زلزلے کے متعلق سنتے ہی ”بالکونی“ سے واپس پلٹ گیا تھا۔“

”کیا؟“ اس نے تھیرے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

”ڈونٹ ٹیل می، تم بالکونی سے واپس پلٹ گئے تھے، اوپر سے ایورسٹ کی چوٹی کا فاصلہ ہی کتنا تھا بھلا۔“

”میں چوٹی سے ایک قدم دور بھی ہونا تو زلزلے کا سن کر واپس چلا جاتا۔ میں ایورسٹ کی فتح کس کے لیے کر رہا تھا؟ اپنے ملک کے لیے؟ تو میرے ہاتھ میں میرے ملک کا جو سرخ جھنڈا تھا، وہ جھنڈا مجھے کہہ رہا تھا کہ تمہارے ایورسٹ سر کر لینے سے ترکی کے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہاں اگر تم واپس پلٹ جاؤ تو شاید بہت سے بے یار و مددگار لوگوں کی کچھ مدد کر سکو۔ پھر میں دلپس آ گیا۔ اس بے حد کامیاب انٹرنیشنل ایکسیپڈیشن کو چھوڑ کر جس میں بیسیوں کو پنا شامل تھے، ساتھ تو صرف مقامی Sherpas (شیرپاز) تھے۔ مگر میں ترکی گیا۔ وہاں بہت بری حالت تھی۔ ہر طرف لمبے تھا، لاشیں بکھری تھیں۔ اس کے بعد سے مجھے زلزلوں سے بہت خوف ہوا آتا ہے۔“

وہ تھیرے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا کوئی انسان اتنا نرم دل بھی ہو سکتا ہے کہ بالکونی سے ایورسٹ Summit کے بغیر پلٹ جائے؟ کیا کوئی کوہ پیما بالکونی سے بھی واپس آ سکتا ہے بغیر کسی جسمانی یا موسمی تغیر کے؟

”پھر تم ایورسٹ نہیں سر کر سکتے؟“

”کر لیا تھا، 2001ء میں۔ اور پلینز زیادہ ایکسیپڈ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میرے علاوہ تقریباً سترہ سو اور لوگ بھی کر چکے ہیں، یہ کوئی اتنی بھی بڑی بات نہیں ہے۔“

”تم میں بہت عجزی ہے۔“

”ان پہاڑوں پر اتنی مار پڑی ہے کہ ہمارے کس مل اکل گئے ہیں۔ تمہیں دنیا کا کوئی بہت اچھا کوہ پیما مقرر نہیں ملے گا۔ کیونکہ ہم کلا تمبر سے زیادہ کونا جان سکتا ہے کہ ہم انسان Mother nature کی ایک حقیر سی مخلوق ہیں۔ میں اتنی بلندیاں دیکھ چکا ہوں کہ اپنا آپ کچھ لگتا ہی نہیں ہے۔“

”سو رہی مگر میں آپ کے رومانس میں مغل تو نہیں ہوئی؟“ ارمہ اچانک ہی چارپائی کے سامنے آئی تھی۔

پریشہ نے ہنر واکر اسے دیکھا۔

”ہاں بالکل مغل ہوئی ہو۔“ افق نے بات کاٹے جانے پر اسے براہ راست بنا کر دیکھا۔

"نہیں۔ ارے! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر وضاحت دینے والے انداز میں کہتا چاہ رہی تھی ارے نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا وہ بیچے سے آتے ایک گلابی رخساروں والے بچے کی طرف متوجہ ہو چکی تھی جو بیٹ بچا رہا تھا۔

پریش نے سر جھکا کر شک لبوں پر زبان بھیری۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے ارد گرد کے لوگ کیا واقعی سب کچھ جان گئے تھے؟

"میں کسی لگ رہی ہوں؟" وہ بچے سے ایک ہیٹ لے کر سر پر زالی کر رہی تھی۔

"یا اکل ٹالی ٹینک والی کیٹ ونسلڈا"

"میں اتنی موٹی لگ رہی ہوں؟ بس رہے دو مجھے نہیں چاہیے ہیٹ۔" اس نے فوراً ہیٹ اتار کر بچے کو واپس کر دیا۔ اس کی گلابی رنگت پر مایوسی چھا گئی وہ مجھے چہرے کے ساتھ ملنے لگا۔

"سنو مجھے تو دکھاؤ ہیٹ! اس سے رہا نہ گیا تو بچے کو بالائیاد وہ فوراً پلٹا اور سارے ہیٹ اس کے سامنے رکھ دیے۔

"میں اسے جان کر کچھ اور تو نہیں لگ رہی؟" اس نے ایک اسکن کلر کا ساوہ ہیٹ جس میں اوجھ کھلا اسلی ہے حد میں کتاب اگاتھا خرید لیا۔

"نہیں! بہت اچھا۔ ہیٹ ہے۔" افق نے مسکرا کر کہا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ "تم اچھی لگ رہی ہو۔"

اس نے ایک دفعہ غلطی سے اس کی ہنسی کی تحریف کر دی تھی وہ بھی شاید مذاق میں کی تھی۔ وہ کبھی اس کی مینڈلی آکھوں کرے ہوئوں یا سیاہ چمک دار بالوں کی تحریف نہیں کرتا تھا۔ وہ شاید اس کو غور سے دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ ظاہری چیزوں کی پوجا کرنے والوں سے بہت مختلف تھا۔

افق ہاتھ پائی میں ڈالے اس ہیٹ والے بچے کی طرف پائی اچھال رہا تھا بچہ اپنا ہیٹ ایک طرف رکھ آیا تھا اور اشارے کے بالکل کنارے پر اپنی پینڈیاں ڈالے ایک "گورے" نورسٹ کے مذاق کو انجوائے کر رہا تھا ساتھ ساتھ وہ بھی پائی اس پر پھینک رہا تھا۔

"مت کرو تم دونوں میرے اوپر پائی آرہا ہے۔" اپنا کڑھائی والا نیا کرنا خراب ہوتے تو کچھ کردہ غصے سے بولی۔

"ہم کھیل رہے ہیں۔"

"بہتر۔ تم شاید تین سال پہلے اپنے بچپن میں چلے

گئے ہو مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں ہا ہوں۔" وہ کسی صورت پائی پھینکنے سے باز نہیں آیا ہاتھ دیکھتے ہوئے وہ اپنے جو گزرا تھا میں اٹھائے پتھوں بیچے اترنے لگی۔

وہ لوگ خاصی دیر تک آبشار پر بیٹھے رہے یہاں تک کہ سورج ان کے سروں پر آگیا اور آبشار کا پانی صاف دھوپ میں مزید چمکنے لگا۔ بہت سے نورسٹ آبشار سے جا رہے تھے کچھ اب آرہے تھے غرض آبشار پر چڑھنا روٹی لگی رہتی تھی۔

دوسرے دن جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو پریش نے اتنی تھک چکی تھی کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی سو گئی۔ اسے نیند نے تب اٹھایا جب ماہو ڈھنڈ آگئی تھی۔

وہ گاڑی سے اٹھ کر اس کی آنکھیں کھلے تو بھل تھیں مگر سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی منہ رکا۔ سامنے سی ساتھ ہی ساتھ بھی ایک دم رک گئی۔

سامنے ایک سبزہ بچھا تھا جسے کوئی ہزاروں سال پہلے لگوئی لا ہوا تھا۔ اس کے اقتسام پر اشوک کے دریا کا پانی ایک جگہ اکٹھا ہو جاتا تھا اور وہاں اس کی رفتار بند ہونے کے برابر آتی۔ اس جھیل کی صورت اسٹے ہوئے پانی کو ماہو ڈھنڈ بھیل کہتے تھے۔

جھیل کا پانی سبزی مائل نکلا تھا اس کی سطح پر ڈوبتے تھیں۔ جھیل کی سطح پر پانی والی پریاں رہتی تھیں۔ جھیل کے نیچے بلند بالا سبز پہاڑ تھے جنہوں نے پورے علاقے پر سایہ سا کر رکھا تھا۔ پہاڑوں کے ساتھ ماہو ڈھنڈ کے دائیں طرف دیار کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہ اس سبزہ خاں میں ایک رخسار تھے۔ انکا اسے جھل کر مسرور کرتے تھے۔

ٹولیوں کی صورت میں نورسٹ دور دور تک گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے ایک ٹولی والا چھان گھوڑے کی باگ تھاے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پریش کو بے اختیار مصری مالی روڈ والا واقعہ یاد آیا۔ افق نے کیپ سیدھی کرتے ہوئے گھوڑے والے کو اشارے سے اپنے قریب بلا لیا۔ "اندھا" انگلش راہی کا؟" قریب آئے پر اس نے شلو اور قمیص میں لمبوس جھولی چھوٹی راڈھی والے پٹھان سے پوچھا۔

"نہ۔ انگلش نہ راہی کا۔ پختور راہی کا؟"

افق نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلادی۔

"تم پختوبول رہے ہو؟" اس نے حیرت سے افق کو

دیکھا۔

"ارے نہیں یہ تو ایسی سی والوں نے دو چار لفظ لکھا دیے تھے۔ تم اس سے کہو کہ آج اپنا گھوڑا لے آئے ہیں اس پر سواری کروں گا۔"

پریش نے یہ جاننے کے بعد کہ اس گھوڑے پان جس کا نام امیر حسن تھا کو اردو آتی ہے اس تک افق کا پیغام پہنچا دیا اور یہ پشاور اور اس سے آگے لوگوں کی اکثریت اردو سے باندھ تھی۔

"آج ہمارے ٹرپ کا آخری دن ہے کل واپسی ہے سو آج رات ہم کیپ فائر کریں گے۔" گھاس پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے بیک بیکس کسی بوجھ کی طرح ایک طرف اتار بیٹھتے ہوئے پریش نے کہا۔

"اور میرے پاس متاثری بھی ہے وہ بھی سھیلیں گے۔" نورسٹ یہاں سے چلے جائیں پھر یہ پورا سبزہ زار ہو گا۔ اور ہاں افق بھائی آپ نے پریش آپلی کو

"دوبل دیں۔"

"دوبل دیں تو بھول بھی چکا تھا۔" وہ کھنپوں کے بل گھاس پر ہم دراز تھا مقرر اس کے بیک اور کیپ سینے پر رکھی تھی۔ اس کی شرت سامنے ابھی تک لگی تھی۔

"تو پتہ ہے آپ کا؟" پریش کے لاکھ کھوڑنے پر کہ اگر وہ یہاں کا تھا تو پتہ کتنے دور ہے دو بھی ارے کہہ اٹھی۔

"ایسا ہے جیسے جہاں ہے آپ کل صبح ہمیں ماہو ڈھنڈ کی جھیلیں دکھائیں کہ میں اسے خود لوں گا۔"

"اور ہم سی اس کے ساتھ۔"

"ہاں یا اکل۔" وہ پھر سے مصنوعی خند کی طاری کے ساتھ اپنے اپنے شلے اچکا دیے۔

"ہاں ہاں ہاں ہاں اور کتھیاں ہیں؟"

"میرے پاس سب ہے ناما ہا۔"

پھر جب شام کا گلابا اندھیرا چھلنے لگا اور سورج کی کرنیں ماہو ڈھنڈ کے پانیوں سے روٹھ کر مغرب میں روپوش ہونے لگیں اور سیاہوں کی گھما گھمی ماند پڑنے لگی ایسے میں وہ چاروں کھلے آسمان تلے گزارنے والی رات کی تیاری کرنے لگے۔ اپنے بیک بیکس سے گیمینگ گاسماڈن نکالا ہتے ہوئے باتیں کرتے خیموں کے پوڑ اور جوائنٹس سیٹ کئے ان پر شیٹ ڈالی سلیسنگ بیگز بچھائے اور خود خیموں کے ایک طرف کھلے آسمان تلے دائرہ بنا کر بیٹھ گئے درمیان میں امیر حسن کے لٹکا سے

منگوئی لکڑیوں سے آگ جلائی۔

"میں بیٹھ رہی ہوں گی۔ ڈیکر کم پلیس۔" ارے مونو پلی کا بورڈ اور کارڈ وغیرہ سیٹ کرتے ہوئے بولی۔ الاؤ کے ایک طرف وہ اور نشاء تھیں دوسری طرف پریش اور افق مونو پلی کا بورڈ درمیان میں ہی آگ کے قریب کسی طرح ایڈجسٹ کر رہی تھیں۔

مونو پلی جیسی ٹیم میں کھٹے منٹوں کی طرح گزرتے ہیں دیکھتے گزرتے اور انہیں پکائی نہیں چلا۔

"یہ پکاؤ کیس کی ہے؟" پریش کی گوٹ پیلے رنگ کی پکاؤلی پر آئی تھی اس کے اپنے پاس صرف چار زمین تھیں۔ قسمت اتنی خراب کہ ہر باری پر وہ افق یا نشاء کی کسی زمین پر چڑھ جاتی یا پھر سیدھی جیل جاتی۔

"میری ہے" نشاء نے مطلوبہ کرایہ بتایا۔ اس نے منہ بناتے ہوئے چند پادلوں کا نکال کر اسے تھمائے۔ افق نے نظر اٹھا کر اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا پھر دھیرے سے اسے کارڈز میں سے آکسفورڈ اسٹریٹ کا گرین کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں چھڑایا پریش نے چونک کر اسے دیکھا۔

"رکھ لو ابھی نشاء اس پر آئے گی تو تم اس سے کرایہ لے لینا۔" اس نے سرگوشی میں کہا پریش نے چور نظروں سے الاؤ کے اس پاس بیٹھی ارے اور نشاء کو دیکھا وہ اس جانب نہیں دیکھ رہی تھیں۔ "شکریہ" اس نے جھٹ کارڈ رکھ لیا۔

نشاء کی گوٹ ریجنٹ اسٹریٹ پر آئی ارے کی سے فیہر پھر نشاء کی کنگ کر اس اسٹیشن پر اور وہ تمام افق کی زمینیں تھیں مگر وہ بیٹے حق کے ساتھ کرایہ وصول کر رہی۔

"میرا خیال ہے یہاں کوئی بے ایمانی کر رہا ہے۔" آدھے گھنٹے بعد ارے کو تب احساس ہوا جب وہ دائرہ رگس پر آئی۔ اور پریش نے کرایہ مانگا۔

"یہ دائرہ رگس اور الیکٹرک کمپنی تو افق بھائی آپ کی تھیں مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بیٹھ رہی ہوں۔" پریش نے قدرے بوکھلا کر افق کو دیکھا۔

"اوہو ارے! میری کہاں تھیں؟ میری تو صرف الیکٹرک کمپنی تھی۔"

"میری آئی! ذرا کارڈ نکال کر دکھائیں دائرہ رگس کا۔" اس کا انداز غلط تھا پریش اب پھنس چکی تھی مگر کارڈ افق کے پاس تھا۔

"کیا آئی ہو ارے! میری جھوٹ تھوڑی بول رہی ہے۔"

میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے اسے یہ زمین خریدنے دیکھا ہے۔"

"گناہ گاروں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ پری آئی مجھے کارڈ دکھائیں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ارے! تمہاری گردن پر کوئی کیڑا چل رہا ہے۔" افق نے قلمی اور تھوڑا کلاس سٹ کا مڑوا کر آگیا، جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا، ارسہ اپنے کارڈ زچھوڑ کر گردن بھاڑنے لگی۔

"کیڑا؟ کدھر ہے؟"

"ابھی تک تمہاری گردن پر بیٹھا ہے۔ کتاخون لی چکا ہو گا اب تک تمہارا۔ ویسے تمہارا جلد گرہ پ کیا ہے؟" وہ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہا تھا، صرف پریشہ کو بچانے کے لیے۔ اس نے مسکویت سے افق کو دیکھا، اباؤ کی زبردستی اس کے چہرے کے نقوش کو مزید ٹھیکہ بنا رہی تھی۔

"اے پائٹنس۔ اور نہیں ہے کیڑا۔"

"اے پائٹنس؟ ہوں۔ میرا اونٹنیٹھ ہے۔" وہ بونٹی بولا تو محرموں کی طرح گردن جھکانے لگی، پریشہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ "سیف کا بھی اونٹنیٹھ ہے۔" اس نے سب اٹھارہ پاس انگلیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سیف کو کیا؟" افق نے غصے سے نہیں سمجھ سکی اور اس کی توجہ وائرورس کی ہالی بات سے ہٹانے کو پوچھا تھا۔ اب وہ پری کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی ڈانٹا ہاتھ میں لیے باری کرنے لگا تھا۔

مگر جواب تو پریشہ کو دینا ہی تھا۔ نشاء نے خاموش نگاہوں سے التجا کی تھی کہ وہ چپ رہے، مگر اس کو ہر صورت افق کو وہ بتانا تھا جو بتانے کا اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

"سیف میرا کزن ہے، پیچھو کا بیٹا اور میرا۔" وہ لمبے بھر کو رکی، افق کی ڈانٹ کی ڈنی کو روکی کرتی انگلیاں تھمیں، اس نے گردن اٹھا کر سواہ لگا ہوں سے پریشہ کو دیکھا۔

"اور میرا منگیتر بھی۔ تین ماہ بعد میری اس سے شادی ہے۔" بہت برا اعتماد اذہ میں اس نے کہہ ڈالا۔

وہ جو کچھ سمجھے لگا تھا، ایک دم رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت در آئی، پھر الجھن اور بالآخر واضح ہے ہوئی۔

میں بھر کو ماہوؤں جھنڈ کے کنارے اس وسیع و عریض بہرہ زار میں سکوت سا چھا گیا۔ اونچے الاؤ سے چنگاریاں نکل کر

فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

"آپ۔۔۔ انکیب جڈ ہیں؟" وائرورس کو بھول کر افق یقینی سے ارسہ سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، تین سال سے۔" اس کے دل سے کوئی لمحہ بوجھ ہٹ گیا تھا، مگر پھر افق کا زرد چہرہ دیکھ کر اسے اباؤل وقتا محسوس ہوا۔

"اوہ اچھا۔" وہ سنبھل گیا تھا، اور پھر اپنی نگاہیں ہاتھ میں پکڑی ڈیپارمر کوڑکے جیسے زبردستی مسکراتے کی گولگی کی۔ پھیل رگت اور پھیل مسکراہٹ۔

"مبارک ہو، تم نے۔۔۔ تم نے بھی بتایا نہیں۔۔۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ ہوں گد۔ تو کیا کرتا ہے وہ؟" وہ رک۔ "وہ۔۔۔ سیف؟" وہ اپنے لمبے میں ہنسنے کا کرب نہ چھپا سکا تھا۔

"پری اس؟"

"آہاں! اور پائٹنس۔" افق نے اشارہ کر دیا۔

شاید بھول چکا تھا کہ اس کی باری تھی۔ وہ اس کے اشارے سے اٹھ کر اس کے پیچھے چلی گئی۔ وہ اس کی بھی پیچھے چلی گئی تھی۔ مگر اس کو ہر صورت میں کسی بھی قسم کی غلط فہمی اگر تھی تو ختم کرنی تھی۔ لکڑیوں میں سے بار بار چننے کی آواز آ رہی تھی۔

"پائٹنس، گیم دوبارہ شروع کریں۔" ارسہ کا لہجہ بھجھا بھجا سا تھا۔

"جی سکیل میں کے ٹپ سوتے ہیں۔" نشاء نے افق کی مشکل آسان کر دی۔ وہ غالباً وہاں سے ہٹنا چاہ رہا تھا، نشاء کے کہنے پر کارڈ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وائرورس کا کارڈ مٹانے ہی تھا مگر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے گھاس پر رکھی اپنی انگلیاں روکاں بنا کر اپنے اشارے کی طرف اشارہ کیا۔

"صح ابشار پر میں نے۔۔۔ آئی ایم سوری پری آئی۔۔۔ وہ میرے من سے ہوئی، غلطی سے نکل گیا تھا، میں نے صرف مذاق کیا تھا، مجھے نہیں علم تھا کہ آپ انکیب جڈ ہیں۔"

اور۔۔۔ آئی ایم سوری! "تذذذب" اور شرمندگی اس کے لمبے سے نکلتی تھی۔

"اس لوکے ارسہ میں نے برا نہیں مانا، تم یہ گیم سمیٹ لو۔"

"سمیٹ کس؟" بے لبا سے گیم سمیٹ کر ارسہ اپنے نیچے کی طرف چلی گئی۔ پریشہ نے گردن موڑ کر اٹھ کر

دیکھا۔ وہ جھیل کے کنارے، سر جھکائے جھیلوں میں ہاتھ والے خاموشی سے بہت آہستہ چل رہا تھا۔

صبح وہ کتنا خوش تھا، اور اب بھی اس کے ساتھ مل کر لے ایٹلی کرتے ہوئے وہ کتنا فریش لگ رہا تھا، پھر ایک لفظ "منگیتر" سن کر یوں اس کے چہرے کی مسکراہٹ کیوں غائب ہو گئی تھی؟ پریشہ نے گہری سانس لے کر گردن سیدھی کی نشاء شائکی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات قطرہ قطرہ بھگ رہی تھی۔ اور تشریت آسنوالی چیز، سرد ہوا میں ان کے خیمے کے کپڑے کو پھڑپھڑا رہی تھیں۔ وہ اپنے سیلینگ بیگ میں جپٹ لپٹی خیمے کی چھت کر گھور رہی تھی۔

"کی؟" کیا ہرے کسی نے اسے پکارا تھا۔ وہ ایک لذت اٹھ گئی، پکارنے والا افق تھا۔ اس نے سیلینگ بیگ کا قریب دراپٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور نیچے کی زپ کھول کر باہر نکلی۔

کچھ کے اندر نہیں آ رہی تھی۔ سوچا کچھ دیر اگلے واک کرتے ہیں۔

وہ کچھ کے باغیچے کے ساتھ گھاس پر چلنے لگی۔ وہ دونوں ایک ہی گانہ میں سر جھکائے چل رہے تھے، پریشہ نے تھوہینے پر تھوہینے کے جبکہ اس کے ہاتھ جھیلوں میں

تھوہینے کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے بغیر تھید کے افق نے سوال کیا، اس کے منہ میں کچھ بولنے کی سی اور شکست خوردہ تھی۔ "کی؟"

"میرے عمر کو چاہا۔" البیر نے ہنسنے سے بے خبری میں اس کے ہاتھ سے بہت محبت کرتا ہے۔

وہ چلتے چلتے جھیل کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ رات کے اس پہر وہاں بچائی خاموشی کو دور پہاڑوں سے جنگلی جانوروں کے بولنے کی آواز چیر رہی تھی۔

"مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا تھا، وہ اچھا ہے؟" یہ لفظ "اچھا" بہت عجیب ہوتا ہے، افق ایک ظالم جابر بادشاہ رعایا کے لیے جتنا برا ہوتا ہے، اپنی اولاد کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے، پھر ہم اسے کیا کہیں؟ برا یا اچھا؟ یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے شاید میں نہیں یہ نہ بتا سکوں کہ وہ اچھا ہے یا نہیں، البتہ پسند اور ناپسند کی بات اور ہوتی ہے۔"

وہ جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ پریشہ بھی اس کے بائیں طرف، اس سے ذرا پیچھے گھاس پر ٹھکنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر ان پر تھوڑی ٹکائے بیٹھ گئی۔ برقی میز ہوا اس کا ہیٹ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم اسے پسند کرتی ہو؟" وہ سانسے چاندنی میں نہائی جھیل کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ میری پیچھو کا بیٹا ہے، کیا کو بہت پسند ہے، انہوں نے منگنی سے پہلے میری مرضی نہیں پوچھی تھی۔ پیچھو نے رشتہ مانگا، انہوں نے فوراً "ہاں" کر دی۔ تم تمہارے ہاں کی "رشتوں کی بلیک میلنگ" کو نہیں جانتے۔ پاکستان کے رسوم و رواج ترکی سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اگر رشتہ مانگنے پر کسی چھو بھئی پتچا یا ماموں کو انکار کر دیا جائے تو وہ انا میں اگر خون کے رشتے تک توڑ ڈالتے ہیں۔ پیچھو کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ لپٹا کی انکوئی کسٹن میں لپٹا کی واحد بلڈ ریلیف جو اس دنیا میں ہیں، میں اس وقت شاید انکار کر بھی دیتی، اگر مجھے سیف کا رشتہ آیا تھا تو وہ بالی طور پر اتنا مستحکم ہو چکا تھا کہ لپٹا سے تعلق توڑ لینا مالی مدد کے لحاظ سے کوئی گھٹانے کا سودا نہ ہوتا۔ پھر وہ لپٹا کو بہت پسند ہے۔ اور میں لپٹا کو دیکھ نہیں دیتا چاہتی تھی۔"

وہ گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ وہاں ہر سو جھلگاتے تارے بکھرے تھے۔

جہادی الثانی کی آخری مارتوں کا ہر بل ٹھٹھا چاند پوری جھیل کو چھو رہا تھا۔

"نہیں، کبھی نہیں لگا کہ تمہاری زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایسا آئے گا جو تم سے محبت کرے گا، جس کو دیکھ کر تمہیں یہ لگے گا کہ یہی ہے جس کا ساتھ تمہیں عمر بھر کے لیے چاہیے؟"

پریشہ نے مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی چوڑی پشت اور جھکے سر کو دیکھا۔

"بعض لوگ زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں، افق ارسلان! اتنی دیر سے کہ ہم چاہیں بھی تو انہیں اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا سکتے۔"

"تو جو لوگ زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں، ان کو آپ اپنی ترجیحات میں کس مقام پر رکھتی ہیں؟ ڈائریکٹ پریشہ جہاں زیب؟"

پری نے چونک کر اسے دیکھا، گردن اس کی طرف موڑے، خفی سے لب جھپٹے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ٹکڑہ کرتی

تھا آنکھیں ملنے لگیں۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"میرے نزدیک ہر فرد کی اہمیت ہے" تیز ہوا کا جھونکا اس کا ہیٹ اڑا کر لے گیا وہ اونست بات رک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میرا ہیٹ۔"

چند قدم دور جا کر اس نے گھاس پر پڑا ہیٹ اٹھایا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"چلو خیر جانے دو تم منگنی شدہ ہو تو کیا ہوا ہمارے درمیان ایک اور تعلق تو ہے ہی نا؟"

وہ چونکی۔ "وہ کیا؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"ہم اچھے دوست تو ہیں نا۔" وہ اٹھ کر پھر سے پرانا افق اور سلاخ لگے لگا تھا۔ وہی قرینٹیں نہیں کھڑی اور اپنا ساما۔

"ہاں تو ہیں۔" وہ کھل کر مسکرا دی۔

"تو پھر تم اس اچھے دوست کے ساتھ راگاپوشی آرہی ہونا؟" وہ پھر سے پرانے موڈ میں آ گیا تھا۔ وہ دونوں ماہو ڈھنڈ کے چمکتے پانیوں کے کنارے کھائے لگے۔

"یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے پایا کبھی اجازت نہیں دی گئی۔"

"وہ بہت کمزور ہیں کیا؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تو وہ بہت لبرل ہیں۔"

"اچھا۔ پھر؟"

"چار سال پہلے میں "اسپانک" کی ایک سینیڈیشن پر گئی تھی۔ بنیادی طور پر ملٹری اینکسپیڈیشن تھی پاکستان یونی کی میں ایک سینیڈیشن ڈاکٹر کے طور پر یوں ہی ساتھ فٹ ہو گئی تھی۔" وہ جیسے یاد کر کے ہنسی۔ "بہت مٹیں کی تھیں مذہب صابر کی انہوں نے ہی انڈجسٹ کر لیا تھا مجھے پاک خیر کے ساتھ۔ ہم نے بڑے کم وقت میں اسپانک کو سر بھی کر لیا مگر وہ بھی پریچوں سے چند فٹ دور نہیں بچے مگر گئی۔ میرا پایاں کندھا بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد پایا نے میری climbing (کوہ چالی) پر پابندی لگا دی۔ وہ میرا اسکرود سے آگے قراقرم کا پہلا تجربہ تھا۔ میں اور کرنا چاہتی تھی مگر پایا اجازت میں دیتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ میں گر کر پڑوں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا تو تم کیوں گرو گی؟" بہت اپنا ہیٹ سے افق نے کہا وہ ہنس دی۔

"یہ بات تم میرے پایا کو نہیں سمجھا سکتے۔"

"کو شش تو کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر تیزی سے بولی پھر فوراً اپنی کیلپت اچھا کر وضاحت کرنے والے انداز میں کہا۔ "وہ نہیں گے اس لیے کہ کو پھوڑو۔"

"اچھا۔ ٹھیک۔ اور اگر زیادہ پریش نہیں ہو رہا تو ایک بات پوچھوں؟"

"کو پھوڑو۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں۔ تم کہاں رہتی ہو مری میں؟"

"ہم نے شاید اپنے بارے میں ایک دوسرے کو کچھ بھی نہیں بتایا افق نا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"شاید۔ مگر تم کہاں رہتی ہو؟"

یہ وہ سوال تھا جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ برسوں شام وہ اپنی تمام کشتیاں چلا کر واپس آتی تھی مگر جلی ہوئی کشتیوں پر عوامی کر کے اس اور سلاخ اس تک نہیں آتی تھیں۔

"میں اس ملک اور ان ہی جگہوں میں رہتی ہوں۔"

"خیرم کے بنائے میرا نہیں۔" وہ کچھ لیا کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہی تھی مسکرا کر بولا۔

"ہاں میں نے سن رکھا تھا کہ قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔"

"اور تم نے اس روز یہ بات جینیٹک یقین سے بھی کہی کی نا؟"

"میں اس بات سے بے خبر تھا کہ تم بچھے بھی ہو۔"

"مگر میں پری نہیں ہوں۔" اس نے اداسی سے ہاتھ میں پکڑے ہیٹ پر کلمے سرخ گلاب کو دیکھا۔

"تم؟"

"نہیں۔ میں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

پری نہیں بن جانا۔ میرا صرف نام پری ہے۔"

"جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا تھا؟ یوں جیسے قراقرم کے پرتوں سے رستہ بھول کر مار گد کی اس پہاڑی پر برسی بارش میں بناہ لینے والی کوئی معصوم سی خوف زدہ پری ہو۔"

"میں نے عرصہ ہوا خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دیا ہے۔ تو نے خواب بہت اذیت دیتے ہیں افق نا۔"

وہ خاموش رہا پھر چند ثانیے بعد آسمان کو دیکھ کر بولا۔

"رات بہت گہری ہو چکی ہے۔ ہمیں سونا چاہیے۔"

"تم جاؤ میں ابھی جھیل کے کنارے بیٹھنا چاہتی

ہوں۔" وہ اس سے دور جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی کچھ تے اتار کر ایک طرف رکھے اور ماہو ڈھنڈ کے سیاہ نظر آنے والے پانی میں جس پر چاندنی کی تہہ چڑھی تھی پاؤں لٹکادیے۔

وہ اپنے جسم کی طرف بڑھ گیا اہستہ جسم کی زب کھولنے سے پہلے ایک لمحے کو اس نے گردن کو خم دے کر پیچھے ضرور دیکھا تھا خالص وہ پانی میں پاؤں لٹکائے چاند کی میٹھی چاندنی کا کوئی خاموش گیت سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بخت 30 جولائی 2005ء

گھوڑے کی تیر دوڑتی ٹاپوں کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دور ٹیمپوں کے قریب سے گھوڑا دوڑا آس کی طرف بھاگا تھا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی جہاں رات کو افق نے آخری بار دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چاندنی واپس چلی گئی تھی۔ اس کا چھت چکا تھا۔ نیلی روشنی ہر سو پھیلنے لگی تھی۔ وہ اس پر ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جھیل کا پانی مہر کی لال لگ رہا تھا ابھی تک سورج کی کرنوں نے اس پر انارقص نہیں شروع کیا تھا۔

"میرا ہیٹ آکر رہی ہو۔" گھوڑا اس کے قریب لے جا کر بے وقار ہو گیا۔

ان کی زندگی میں وہ دفعہ بارہ کی سزا پوری کر رہی ہوں۔

حکمران نے ڈھنڈ میں کھانا بکھیر دیا تھا۔ یہاں پھر میری قسمت تھا کہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک کچھ لیا کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہی تھی مسکرا کر بولا۔

"تم؟"

"نہیں۔ میں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

پری نہیں بن جانا۔ میرا صرف نام پری ہے۔"

"جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا تھا؟ یوں جیسے قراقرم کے پرتوں سے رستہ بھول کر مار گد کی اس پہاڑی پر برسی بارش میں بناہ لینے والی کوئی معصوم سی خوف زدہ پری ہو۔"

"میں نے عرصہ ہوا خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دیا ہے۔ تو نے خواب بہت اذیت دیتے ہیں افق نا۔"

وہ خاموش رہا پھر چند ثانیے بعد آسمان کو دیکھ کر بولا۔

"رات بہت گہری ہو چکی ہے۔ ہمیں سونا چاہیے۔"

"تم جاؤ میں ابھی جھیل کے کنارے بیٹھنا چاہتی

"بہتر اب تم ہی راؤ خریدنا۔" غصہ اتنا شدید چڑھا تھا کہ اس نے افق کی راؤ اٹھا کر جھیل کی طرف اچھال دی۔

راؤ نے ایک غوطہ کھایا اور پھر پانی میں ڈوب گئی۔

"میں یہ راؤ دیر سے تراوٹ کا شکار کرنے کے لیے لایا تھا مگر تم نے خود کو تراوٹ کھانے سے محروم کر لیا ہے۔"

"میں تراوٹ کھائے بغیر بھی ایک اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔" وہ ہیٹ سر پر رکھ کر آگے چل پڑی۔

"سنو قراقرم کی پری؟"

پریٹے کے قدم ڈبکھتے ہوئے تھے اس نے پلٹ کر گھوڑے پر بیٹھے افق کو دیکھا۔ "تمہارا ایک یادگار تصویر کھینچوانے کا دل چاہ رہا ہے؟"

"نہیں۔" وہ دو قدم مزید آگے چل دی۔

"مگر میرا چاہ رہا ہے۔" وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا اور بھاگ کر اس کی طرف آیا۔ پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کا ہیٹ اٹھ لیا۔

"کیا ہے؟" وہ اڑیوں کے بل گھومی۔ افق نے اپنی کیپ اس کے سر پر رکھی۔ "تم یہ نہو۔"

اپنی جینٹ گھڑی اور منظر اس نے پریٹے کو تھما دیے اور اس سے اس کی گھڑی لے لی۔

"تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"قل ایٹ میکنیل یونیورسٹی میں ہمارے آخری دن میں نے اور جینیٹک نے ایک دوسرے کی ٹوپیاں جکھیں ٹانیاں کھینچیں اور سن گلاسز پہن کر تصویر کھینچوائی تھی۔ بہت یادگار تھی وہ۔" اس نے افق کی پچیس پہن کر اس کو اپنا ہیٹ پہنے دیکھا اور بے اختیار ہنس دی۔

"ہم مضحکہ خیز لگ رہے ہیں افق؟"

"ہم نہیں صرف تم۔" مسکراتے ہوئے اسے چڑا کر اس نے دور کھڑے امیر حسن کو آواز دی۔ وہ پاس آیا تو اشاروں سے تصویر کھینچنا سکھا کر اپنا پولارائیڈ گیمز اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

تصویر کے لیے دونوں گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہو گئے افق نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

"تصویر بن کر آئے تو اوپر لکھ دینا کہ گھوڑا میرے دائیں طرف ہے۔" کھلی بات کا بدلہ اتار کر وہ خود ہی ہنس دی۔ اسی لمحے گھوڑے والے نے ٹپن دیا دیا۔ غلیش چکی اور چند ہی لمحوں بعد تصویر باہر نکل کر آئی۔

"ایک نوٹوگراف کی حیثیت سے تمہارا مستقبل بہت

روشن ہے۔ مسٹر اس کے یوں ریڈی نہ کہنے پر وہ تصویر جھاڑتے ہوئے بہت جلد کر بولا تھا۔ امیر حسن فکر کر اس کا چہرہ دیکھتے لگا۔

”یہ شکریہ کہہ رہا ہے۔“ اپنی ہنسی روک کر اس نے اسے بتایا۔

”خیر اس کا قصور نہیں، تم سارے پاکستانی ہی ریڈی کے بغیر تصویر کھینچتے ہو۔“ تصویر جھاڑتے ہوئے وہ مسکرایا۔

پریشے کو یاد آیا، مری میں اس نے بھی ریڈی کے بغیر تصویر کھینچی تھی۔

”ہم بہت سے کام ریڈی کے بغیر کرتے ہیں۔ خیر تصویر دکھاؤ۔“

اس نے تصویر افق کے ہاتھ سے لی۔ وہ ہنس رہی تھی، ہنسنے ہوئے وہ گردن کو قدرے پیچھے پھینک دیتی تھی۔ ہنسی روکنے کو اس نے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، کلائی میں موجود سیاہ کھڑی کے ڈائل کا اہرام چمک رہا تھا۔ افق گھوڑے کی نگام تھا، گردن موڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر موجود ہیٹ جس کا گلاب اب مڑھا سا گیا تھا اس کو بالکل کاڑوا لے کی طرح دکھا تھا۔

”اچھی ہے۔“ اس نے تصویر واپس کر دی۔

”تم رکھنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔“ وہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر جانا چاہتی تھی۔

”بہت اچھا۔“ افق نے تصویر اپنی سفید جیکٹ کی بیب میں ڈال لی، جو پریشے اسے اس کی دو مری چیزوں کے ساتھ واپس کر چکی تھی۔

”رائیڈنگ کرو گی؟“

”نہیں، مجھے گھوڑوں سے ڈر لگتا ہے۔“ وہ فوراً پیچھے ہٹی۔

”ایک بہادر کوہ رینا کو گھوڑے سے ڈر نہیں لگتا چاہیے۔“

”بالکل ایسے ہی، ایک بہادر کوہ رینا کو بہت خواب سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے۔“ وہ جواباً مسکرا کر بولی۔

”بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت اچھا گھوڑا ہے، خوب صورت عورتوں کا احترام کرتا ہے۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کر گیا۔

”شکریہ، مگر میں توڑکی ہوں۔“

”تو سہی۔“ اس کے اصرار پر قدرے ہچکچاتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور پاؤں رکاب میں ڈالا۔

”اوتھے اب دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھو، دایاں ہاتھ رہے۔“

”کس کی ہڈی پر؟“ وہ چڑھتے چڑھتے رکی۔

”گھوڑے کی پیٹھ، ناوام؟“ وہ محل سے مسکراہٹ دیا۔

”اچھا۔“ وہ شرمندہ سی ہنسی ہنسی پھر قدرے ڈرتے ہوئے اس کے کندھے کا سہارا لے کر گھوڑے پر بیٹھ گئی۔

”ڈرو نہیں، میں نے کہنا، یہ خوب صورت عورتوں کا احترام کرتا ہے۔“ اس کی خوف زدہ صورت دیکھ کر وہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے زمین پر پٹخا اس کے احترام کے بارے میں بتا ہے یا نہیں؟“ وہ اپنی تمام تر بہادری کو باوجود گھوڑے سے سخت خوف زدہ تھی۔

”یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا، خیر تم یہ باگ پکڑو، اس کی توجہ جان بڑے گا۔“

پریشے نے ہڑبوا کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟ تم نہیں بیٹھو گے؟“

”نہیں۔ فکر مت کرو، یہ تمہیں نہیں گرائے گا۔“

”نہیں نہیں، مجھے اتار دو۔“ مجھے نہیں بیٹھنا اس نے کہا۔

”مگر ان پریشے ڈیر یہ زیادہ سے زیادہ تمہیں ماہوڑھنڈ میں پھینک دے گا؟ تو پھینک دے۔ میں تمہارے پیچھے پانی میں چھلانگ لگاؤں گا۔“

”آئی۔“

”ہاں مگر مجھے ایک پری کے پیچھے جھیل میں ڈونا تو آتا ہے نا۔“ وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”پلیز مجھے نیچے اتار دو۔ یہ مجھے گراوے گا۔“ وہ روہینے کے قریب تھی۔

”یہ اچھا گھوڑا ہے، خوب صورت عورتوں کا۔“ عقلمند اس کے لبوں میں تھا جب بے حد کھیراہٹ میں پریشے نے گھوڑے سے اتارنا چاہا، گھوڑا ایک دم کسی گولی کی طرح تیز رفتاری سے آگے بھاگا تھا۔

”افق؟“ وہ چلائی تھی۔

”وہ گاڑ پریشے اسے روک۔ نیچے مت اترو۔“ وہ جھجکا۔

اتنی دیر سے مذاق کر رہا تھا، گھوڑے کو بھاگتے دیکھ کر بولا ”کیا مگر وہ اس سے زیادہ بول کھلائی ہوئی تھی، مولگام چھوڑ کر نیچے چھلانگ لگادی، اس کا بایاں پاؤں رکاب میں پھنس گیا“

اور وہ تورا کر گھاس پر گری۔ کھینچ کر پاؤں رکاب سے آزاد کرایا مگر اس کا بایاں ہاتھ ایک پتھر سے ٹکرا کر معمولی سا زخمی ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل سیدھی ہوئی۔ اس کا ہیٹ اڑتا ہوا دور ماہوڑھنڈ میں جا کر اٹھا اور اب نیلے، سبزی یا لال پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔

”پری۔“ تم ٹھیک ہو؟“ وہ بھاگتا ہوا اس تک آیا اور بچوں کے بل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ ”میں مذاق کر رہا تھا“

آلی ایم سوری۔ مگر تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم لگام کھینچو؟“

”تم نے ہی کہا تھا۔“ اس نے شکوہ کرتے ہوئے بڑی آنکھیں اٹھائیں جن میں آنسو تیر رہے تھے۔

”میں تو بس لڑکی۔“ وہ سخت شرمندہ تھا۔ ”اُدھر دکھاؤ“

”ہاں کو کھینچو؟“ افق نے فکر مندی سے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ اس میں انگلیوں کے نیچے، ہتھلی پر رگڑ گئے سے ایک معمولی سا لٹ لگ گیا تھا جس سے بمشکل دو تین یونٹیں ہی خون کی پمپ تھیں۔ مگر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

”کیا بڑے اور بڑے؟“ وہ جواب دے بنا سر جھکائے اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھتی تھی۔ آنسو اس کی ہاتھوں سے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

”کھو، درد، سخت، اسے لے کر آتا ہوں“

”ٹھیک؟“

وہ اسے کہے جاتی کہ اس معمولی زخاں پر اسے اتنے زخمی ہونے کا سبب کیا ہوگا؟ غبار کو کسی صورت تو راست ملنا ہی تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا، پریشے نے دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ ”بس سنی پلاسٹ لے آؤ۔“

وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ”کیا؟“

”پلاسٹک والا اینڈر؟“

”اچھا یو مین، سنا پلاسٹ؟“ ابھی لایا۔ ”وہ سمجھ کر اپنے نیچے میں چلا گیا۔ شاید ترکی میں سنی پلاسٹ کو سنا پلاسٹ کہتے ہوں گے۔“

وہ وہیں گھاس پر بیٹھی اپنی قسمت کی ٹیکوں کے درمیان لگے کٹ کو دیکھتی رہی، وہ جیڑت لے کر واپس بھی آگیا۔

”اب خواب روٹا نہیں ہے۔“ اس کے ہاتھ پر سنی پلاسٹ کی طرز کا بیڑا لگا کر وہ نری سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”اتنی پیاری آنکھوں کو رو رو کر سوج کر ڈالا ہے تم نے۔“

اس نے چونک کر غم آنکھوں سے اپنے ساتھ گھاس پر بیٹھے افق کو دیکھا، براہ راست پہلی دفعہ اس نے اسے خوب صورت کہا تھا، اس کے دل میں جیسے کوئی نرم احساس جاگا تھا۔

”اب درد ہو رہا ہے؟“ وہ نری سے پوچھ رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ہاں، درد تو ہو رہا ہے، بیٹھا بیٹھا سا کڑیت دیتا رہا اس کے دل میں ہو رہا ہے مگر اس نے گردن کو ہلکی میں جھنجھکی دی۔

”مگر۔“ اب اپنی آنکھیں صاف کر۔ اپنی جھنجھکی سے تم نے نشاء اور اس کو اٹھائی دیا ہوگا، وہ ابھی اگر پوچھیں گی کہ میں نے ایک منگنی شدہ لڑکی کو کیا کہہ ڈالا کہ وہ یوں روتی ہے۔“

وہ بھینکی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم نے تو کہا تھا یہ گھوڑا خوب صورت عورتوں کا احترام کرتا ہے؟“

”ہاں۔“ مگر تم تو لڑکی ہو نا، وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پریشے نے تاسف سے جھیل کو دیکھا، سبزی یا لال ٹیلے پانی پر اس کا ہیٹ تیر رہا تھا۔ افق نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

”جلنے دو۔ تم نیا لے سکتی ہو۔“

”اونٹنوں۔“ اس نے اداسی سے نفی میں گردن ہلائی۔

سے بہت پر ایسا باسی سوج گلاب نہیں لگا ہوگا جس کی پتیوں کنارے سے سیاہ ہو کر مر جھائی ہوں گی۔“

”صحیح کہہ رہی ہو۔ بعض چیزیں کھو جائیں تو پھر نہیں ملتیں، ان کا تم البدل بھی نہیں ملتا۔ اور بعض انسان بھی۔“

چلو خیموں کی طرف چلتے ہیں۔“

وہ ساتھ ساتھ گھاس پر چلتے گئے، وہ ٹکے پاؤں تھی جبکہ افق کے پاؤں میں جراثیم تھیں۔

”تمہارا ڈیر ابھی تک نامکمل ہے۔“

”جانتا ہوں“ اور میں تمہیں اب کوئی مشکل ڈیر دوں گا۔“

”مگر وہ راکا پوشی climb سے متعلق نہیں ہوگا۔“ اس نے متنبہ کیا۔

”جگ۔“

”مگر وہ راکا پوشی climb سے متعلق نہیں ہوگا۔“ اس نے متنبہ کیا۔

”جگ۔“

”جگ۔“

”اوکے“ اب سنبھلے کھڑے رہی تھی اس کے بھائی کے کسی دوست کا باپ تمہاری کسی اٹھنی جنس ایجنسی کا چیف ہے؟“

”ہاں ہے۔ پھر؟“
”تم اس سے کواپنے صدر سے کہہ کر مجھے گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے کوئی صدارتی ایوارڈ دلوا دے۔“ وہ بچوں کے سانداز میں غصہ کر رہا تھا۔
اس کو ہنسی آگئی۔ ”تمہیں تمہاری گورنمنٹ کی طرف سے ایوارڈ لینے کا شوق کیوں ہے؟“

”میں تیس سال بعد اپنے سفر نامے میں لکھنا چاہتا ہوں کہ جب میں اسلامی دنیا کے سب سے طاقت ور ملک میں گیا تو اس کے ”بادشاہ“ نے میری خوب کو بھگت کی وغیرہ سمجھا کر ناٹو آٹھا۔“

”خیر حبیب کے دوست کا باپ ایک سرکاری ملازم ہی ہے رچرڈ آرمینیج نہیں جو اس کی بات مان لی جائے گی۔“

افق ہنس پڑا ”تو خوب بات کہی۔ عراق امریکہ جنگ میں امریکہ کی فوجی قوتیں کرنا رہا تھا مگر ترکی نے اور طیب اردگان نے اپنی سر زمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔“ وہ دونوں گھاس پر چلتے ہوئے اردگان مشرف اور افغان جنگ کی باتیں کرتے رہے۔ نیچوں کے بجائے وہ جھیل کی طرف آگئے تھے سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا فجر کا وقت باقی تھا۔

”میں نے نماز نہیں پڑھی۔ تم غصہ میں وضو کرو۔“ وہ جھیل کے پانی کے قریب چلا گیا اور گھاس پر بچوں کے بل بیٹھ کر چلتے صاف پانی سے ہاتھ دھوئے لگا۔

وہ اس کے ساتھ کھڑی مسکراتے ہوئے اسے وضو کرتے دیکھنے لگی سبازد کتھیوں تک دھو کر اس نے کپ اتاری اور مسخ کیا پھر دونوں پاؤں کی جرابیں اتار کر انہیں پانی میں ڈبو کر دھوئے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی انگلیوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھی یک دم اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ جھگڑے سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”افق۔۔۔ یہ۔۔۔“ وہ بے یقینی سے اس کے پائیں پاؤں کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کوہ پناؤں کی زندگی ہے، مادام جہاں زیب۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔“ وہ بہت اطمینان

سے اپنا بایاں پاؤں دھو رہا تھا جس کی آخری دو انگلیاں انہیں نہیں تھیں۔
”مگر۔۔۔ کیسے۔۔۔ یہ کیسے ہوا؟“ اس سے الفاظ ارا نہیں ہو رہے تھے۔

افق نے اپروائی سے شانے اچکا دیے۔ ”فراسٹ پائٹ“ اب وہ جرابیں واپس پہن رہا تھا۔
”نماز قضا ہو گئی ہے شاید مجھے جانے کیوں دھیان ہی نہیں رہا۔“ وہ افسوس کرتا گھاس پر سے کپ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک ٹک سے دیکھ رہی تھی۔



”کتنی دیر رکتا پڑے گا اور؟“ پریشے نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔ یہ ماہوڑھنڈ سے واپسی کے لیے تیار تھا۔ بات بھی جو سوائے کسی بھی دورہ وہ انہیں ملے کل خاموش تری رہی تھی مگر اب جب کہ کوڑھنڈ کے میان میں رگ گئی تھی تو اسے ہنسائی پڑا۔
”جب تک پھر رہے کے نہیں بٹے گا ہم آگے نہیں آسکتے۔“

ابھی آدھا گھنڈ پہلے، محض پانچ منٹ کی بوند باندی ہوئی تھی جس سے سڑک کے بالکل بائیں طرف پہاڑ سے چپکا ایک دیو قامت پھر ذرا سا سرک کر دائیں طرف ہو گیا تھا۔ اور اس کے دائیں سرکے پر گاڑیوں کی ایک لمبی قطار دوسری جانب سے آ رہی تھی ٹرک گئی تھی۔ وہ جلد اپنی تنگ تھی کہ اگر پھر کے سائیڈ سے گاڑی نکالنے کی کوشش کی جاتی تو وہ سیدھا کھائی میں بیٹے اٹھو میں کرتی۔

یہ جگہ آٹھ اور آٹھ سو کے درمیان تھی۔ گاڑی کے سبب بشارت پڑی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر میں دوسری جانب سے بشارت برائے والی گاڑیوں کا قافلہ تھا۔ لوگ گاڑیوں سے نکل کر اس دہلی پھر کو دھکا لگانے لگے تھے ٹھکروہ بل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

”اس کو امریکہ سمجھ کر دکھا (دھکا) دکھاؤ۔“ ایک گاڑی کے پچھان ڈرائیور نے جوش سے کہا تو ماحول کشت ذعفران بن گیا۔ ”کو نیچے دریا پر اترتے ہیں۔“ وہ افق کے کہنے پر خاموشی سے اس کے پیچھے پہاڑ سے نیچے اترنے لگی۔

”اسی در سے کیا سوچ رہی ہو؟“ مسلسل خاموشی جس سے وہ جلد ہی ہی آگیا تھا۔

”یہی کہ ہم کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ ان حسین

داہیوں اور سرخز اردل کو چھوڑتے ہوئے میں بہت اداسی محسوس کر رہی ہوں۔“

”تم حسین یادیں ساتھ لے کر جا رہی ہو۔“
”پچھلے کا وہ حسین یادوں کو دل پر لگا کھاؤ بنا رہا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ناسور بن جاتا ہے اور ناسور کوئی سیجا نہیں بھر سکتا، وقت بھی نہیں۔“ وہ سر جھکائے احتیاط سے پتھروں پر پاؤں رکھ رہی تھی۔ چلتے چلتے اس نے بونٹے کی نوک سے ایک پتھر کو ہٹایا نیچے سے تھما شایہ موٹے موٹے کپڑے تھے اس نے فوراً ”پتھر واپس رکھ دیا۔ کپڑے دب گئے۔

”ہم پتھر نہیں رہے ہم پھر ملیں گے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔“
وہ چوٹی ”کہہ دے۔“

راکا پوشی میں کیمپ میں۔ کتاؤں کو پیس کیمپ میں انتظار کروا لگا۔

”کم آؤ۔“ اس نے سر جھکا۔ ایک ڈھکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر اُھر گئی۔ ”میں دہائی نہیں آؤں گی۔“
”تم دہائی ضرور آؤ گی۔“ وہ پر یقین تھا۔
”ہنڈہ کے پاس آؤ پوشی کو پیار سے دہائی کہتے تھے۔“
”نہیں کہتے آؤ ہے۔“

”ایسے کہیں سے آؤ ہے کہ میں تمہارا انتظار کروں۔“

وہ چلا اور آگے۔ اس نے خیر انہیں کی۔ چلو اوپر چلتے ہیں کیا یہ سڑک۔ پھر سڑک کے قریب ایک سرک چکا ہو۔ ”وہ واپس آؤ۔“ وہ نے والن سے کہا۔

”تم دوست کی ہو ہیں پری؟“
(ہم اچھے دوست ”بھی“ تو ہیں؟ ہم اور کیا ہیں؟) وہ پوچھنا چاہتی تھی اس کے جذبات کی شدت امن کے انتقال کی نوعیت ٹھکر ہوئی تو بس یہ کہ ”میری شادی ہے اور مجھے اس کی تیاری کرنی ہے میں نہیں آسکوں گی تمہیں میں کیمپ سے ہی آؤ کرتے بھی نہیں۔“
”مجھے بلاؤ گی اپنی شادی میں؟“

وہ ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی۔ وہ ہنس پڑا ”مذاق کر رہا تھا جانتا ہوں تم مجھے اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کرو گی۔“

”خوشیوں میں؟“ اس نے یاہیت سے سوچا۔ کتاؤ بنا

مذاق کیا تھا نا افق نے چھوڑنے لکھوں میں؟
”مگر اس نے کہا تھا وہ پتھر نہیں رہے اور اٹھلی شام“

”افق جلدی کو پتھر اور اٹھلی پورٹ پر نشاء اور اسے ہی آؤ کرتے ہوئے بھی اس نے ہی کہا تھا۔“

”میں تم سے دوبارہ ملنے کا منتظر ہوں۔“
”میرا خیال ہے میں تمہیں زندگی میں آخری دفعہ دیکھ رہی ہوں۔“

افق نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے کہا ہے ہم پتھر نہیں رہے۔ میں راکا پوشی میں کیمپ میں ایک بہت اچھی کوہ پنا کاشفتر رہوں گا۔“

اپنے بیگ کی ٹرائی دھکیل کر ڈیپارچر لائن کی طرف بڑھتے وقت پریشے نے ایک آخری اداس نظراں پڑوائی۔
”میں نہیں آؤں گی افق! کوہ پنا کو اب پری تو بھلا دینا چاہیے۔“

”وہ پنا اور پری کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔“
وہ مسکرایا شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو گئیں پھر اس کی مسکراہٹ دھندلا گئی اس کے چہرے کا ہر نقش پریشے کی آنکھوں میں بھائی دھند میں دھندلا ہوتا چلا گیا سو تیزی سے مڑی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اس سے پہلے کہ قدیم یونانی دیو مالا کے اس کردار کا کوئی لفظ روایات میں جکڑے اس کے قدموں کو نہ بچھ کر دے۔



منگل 2 اگست 2005

وہ ”میں کھانے کو دیکھ لوں“ کہہ کر لائن سے جا بیٹھی گلی تھی کہ پیانے روک کر قدرے آہستگی سے کہا۔ ”وجہ سے کو بازار سے چلی کباب ہوا لائے۔“

”جلیل کے؟“ وہ بے خیالی سے بولی۔
”کیا؟“ وہ سمجھ نہ پائے تھے۔

”نہیں نہیں۔“ کچھ نہیں۔ میں وجہ سے کہتی ہوں۔ ”وہ گڑبڑا کر سنبھلی۔ جلیل کہاں سے آ گیا درمیان میں؟“

”کتنی کمزور ہو گئی ہو پری۔“ خواہ مخواہ اتنی دور چلی کہیں۔ بھلا کیا رکھا ہے اور؟ ”پچھو پیانے کے سامنے چار جٹانی اسے بہت مصیبتی لگ رہی تھیں۔ اور کیا رکھا تھا؟ اور پری تو سب کچھ رکھا تھا۔“

"بس یو نہی۔" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی اور بچن میں آگئی۔ پچھو ٹھیک کہہ رہی تھیں اس نے بچن کے کیبنٹ کے شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر سوچا تو واقعی بہت کمزور اور الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ یہ اسے کیا ہو گیا تھا؟

"میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔" وہ آواز جو کسی نغمہ ساز کی دھن سے زیادہ خوب صورت تھی، پچھلے تین دن سے اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

وہ اس کا انتظار کرے گا اور اسے نہ پا کر واپس چلا جائے گا۔ قراقرم کی پری اور گوہ پیا کی کہانی کا یہی منطقی انجام تھا پھر وہ کس کے لیے اواس تھی؟ اس کے لیے جس نے ایک دفعہ بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے جس نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ اس کا گھر ترکی کے کس شہر میں ہے؟ پھر وہ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی؟

ان دو تین دنوں میں خوش گمانی کے سارے رنگ اس کی آنکھوں سے اتر چکے تھے۔ وہ بے شک اس سے محبت کرنے لگی تھی مگر وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے یہ اس نے کیسے اخذ کر لیا تھا۔ اب غیر حجاب واری سے معاملے کو دیکھتی تو اسے لگتا کہ وہ ایک طرفہ محبت کا شکار تھی۔

"پری کیسی ہو؟" وہ سادہ کٹ رہی تھی جب سیف بغیر کسی دستک کے اندر داخل ہوا اور بچن اس کے پیچھے آکر بولا۔ وہ چونک کر بیٹھی۔ سیف کو اسے قریب دیکھ کر ناواہی سے اس کی پیشانی پر ہل بڑھنے۔

"آپ اندر جا کر بیٹھیں میں کھانا لگانے ہی آئی ہوں۔" وہ واپس پلیٹ پر جھک گئی۔

"میں ادھر ٹھیک ہوں۔ تم نے فون ہی نہیں کیا وہاں سے؟"

"یہاں کو کتنی تھکی روزانہ یہ بہت تھا۔" اس کا انداز اتنا روکھا تھا کہ سیف چوٹے بغیر نہ رہ سکا۔

"پھر بھی۔۔۔ خیر گوار قسم کے پہاڑی لوگوں میں جا کر رہنا کیسا تجربہ تھا؟"

اس نے زور سے چھری رکھی۔ "پہاڑی لوگ گوار نہیں، مخلص اور بہادر ہوتے ہیں۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ حیات آباد کے دکان داروں سے زیادہ چرب زبان اور بے ایمان کوئی نہیں ہوتا۔"

"لوکان دار تو سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے حیات آباد کے ہوں یا اسلام آباد کے۔" وہ سلاطین کیوں

نچوڑنے لگی۔

"پریشہ! یہاں اسے آواز دی وہ "جی" کہہ کر سیف کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے باہر آگئی۔

"ایسے ماموں ممانی کو بلاؤ۔" وہاں اس کی شادی لی تاریخ رتھی جا رہی تھی اور ماموں ممانی کی موجودگی لازمی تھی۔

"ہاں ہاں ان کو بھی ہونا چاہیے۔ آخر کو اکلوتی بھانجی ہے۔" پچھو نے فوراً خوش دلی سے کہا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"جانی ہوں بابا۔" وہ راستہ لائن کے دروازے سے باہر آگئی نہ کہ بچن سے کیونکہ وہاں سیف تھا۔

اسے سیف اور پچھو جوتے برے اور ممانی آج لگ رہے تھے۔ اپنے پہلے بھی نہیں لگتے تھے۔ اس کو یہ اندیشہ نہیں کرتی تھی اب ناپسند کرنے لگی تھی۔ ان کے ساتھ اس کا رویہ اب اس کا اور یہ اس کا اور یہ کھانے کے لیے ہو تھا۔ پچھو نے اس کی اقتدار کے لیے کوشش کی۔ پچھو انھوں نے اس کی زندگی میں بدل دی تھی۔ ایک دفعہ انسان پہاڑوں پر چلا جائے تو پھر کونسی بھی پہلے جیسی نہیں رہتی۔

انہوں کے لائن میں آج پھر وہ لڑکا۔۔۔ حسیب کے ساتھ بیٹھا کانڈ پر کوئی لسٹ بنا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسلام آباد کیسی ہے؟"

"ڈونٹ کال می کیا۔" وہ ٹاک سکڑ کر کتنی اندر چلی آئی۔ وہ اسے بہت برا لگتا تھا۔

ماموں اور ممانی لوگ روم میں ہی تھے اس نے چہرے کے زاویے سے ان کی بات سن لی۔

"وہ اب تو یہاں رہتا ہے۔" اس نے پچھو کی ہولی وڈ ٹوپیا نے کہا کہ آپ لوگ بھی آجائیں۔

"اچھا ڈیٹ فیکس کرنے آئی ہوں گی۔ تم جاؤ پری بازم آرہے ہیں۔" ماموں نے کہا۔

"اور کھانا وغیرہ سب ٹھیک ہے نا کوئی سلسلہ چاہیے تو بناؤ۔" بیواؤں تمہارے ساتھ کچھ؟ "ممانی بالکل ماؤں والے انداز میں فکر مند ہو رہی تھیں وہ مسکرا دی۔

"مانی سب کچھ ریڈی ہے۔ بس آپ لوگ آجائیں۔" وہ وہاں سے جا رہی تھی جب ممانی نے دھیرے سے ماموں سے کہا۔

"میرا بیٹا بڑا ہوتا تو میں کبھی پریشہ کو ان ناقدوں میں نہ

جائے دیتی۔"

"کبھی میں سوچتا ہوں کہ جہاں زیب سے ایک دفعہ تو پوچھوں کہ سیف میں اچھی شکل اور پیسے کے علاوہ اسے کیا نظر آیا ہے جو اس نے۔" اس سے آگے وہ سن نہ سکی کہ باہر آگئی تھی۔

وہ دونوں لائن میں بیٹھے تھے اس کو دیکھ کر بولتے بولتے رک گئے۔

"ویسے نام کیا ہے تمہارا؟" وہ ان کے قریب سے گزر کر جانے ہی لگی تھی مگر کسی خیال کے تحت رک کر پوچھ لیا۔

وہ اس کا نام ہمیشہ بھول جایا کرتی تھی۔

"مصعب مصعب محمد۔" وہ کہتا ہو گیا۔

"تم وہی ہو نا تمہارے ابا شاید کو کمانڈر تھے اور پچھلے سال شاید ان کو ایک انجینیئر کا اعلا عمدہ دے دیا گیا ہے؟"

"بالکل ایجنڈی کو ان جیسا پیٹرم کور کمانڈر آج تک نہیں ملا۔" اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

"میں نے سنا ہے ان کو آگے بھی بہت زیادہ ترقی ملنے کے چانس ہیں اور یہ کہ وہ صدر کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔" اس نے اکھڑے اکھڑے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"میں نے ان سے کہا نہیں۔"

"کم آن۔" وہ پچھو سے کہے کہ چنڈی کا کور کمانڈر آری بہت کافی وقت سے۔

"فیورٹ کی بات نہیں ہے۔ بعض لوگوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ آپ کے لیے اسے نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے۔" وہ زیادہ نہیں پتا ہو نا کسی میں ادھر میں تھوڑا سی میں ہوتا ہے۔" اس نے لاپرواہی سے شانے اٹھائے۔

پریشہ نے کھڑے کھڑے اسے گھور کر دیکھا۔ "ویسے باجیوں کی عمر کی لڑکیوں کو دیکھ کر سینی بھانا بھی لارنس کالج میں سکھایا جاتا ہے؟"

"وہ پریشہ آئی ہیں۔"

"جسٹ ڈونٹ کال می تپ۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

"میں جتنے تک تمہیں یک کراؤں گا، ڈنر ساتھ کریں گے۔" سیف کا اس کے موبائل پر فون آیا تھا۔

"کدھر؟"

"کسی ریسٹورنٹ میں یا ر۔"

"نمبر ایک میں کوئی "یار" نہیں ہوں۔" وہ سری بات میں ابھی بہت بڑی ہوں، سو رہی۔" اس کا انداز کھردرا سا تھا۔

"تم اپنی مصروفیت ملتوی کر دو اور۔"

"سیف، میری کال آ رہی ہے، میں بعد میں بات کرتی ہوں۔" اس نے موبائل آف کر دیا۔

اسے یاد آیا "افق" نے گہری رات میں اسے جھیل کے کنارے واک کرنے کا کہا تھا تو وہ فوراً ساتھ چل پڑی تھی مگر سیف پر اسے ذرا بھر بھی اعتبار نہ تھا۔

"کیا وہ شخص اس کی قسمت میں نہیں ہو سکتا تھا؟ اگر ایسا تھا تو وہ دونوں برقی بارش میں مار گرنے کی پہاڑیوں پر ایک دوسرے سے کیوں ٹکرائے تھے؟" وہ ہمیشہ یہ بات سوچتی تھی۔

☆ ☆ ☆

چائے کا کک اس نے نرے میں رکھا اور پیپا کے کمرے کے قریب آگے دروازے پر دستک دی۔

"آؤ پریشہ۔" وہ بید گراؤنی سے ٹیک لگائے کوئی ہرنس میگزین دیکھ رہے تھے اسے دیکھ کر رکھ دیا۔

"کیا بڑھ رہے تھے آپ؟" ان کو چائے کا کک تمہا کوہ بید کی بات تھی پر تک گئی۔

"شوکت عزیز کی جانی گئی گردنہ دہشت میں اضافے کی فکر زکار ٹیل فکوز سے سواز نہ کر رہا تھا یہ آوی اسٹانگ مارکیٹ اسکیڈل کا ختم رہا ہے یہ تو اس ملک کی اکانومی تباہ کردے گا اور اوپر سے اتنا جھوٹ۔" وہ کہتے کہتے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر رک گئے۔ "تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"یہاں۔۔۔ دھم۔ اگر آپ اجازت دیں تو وہ البر تو ہے نا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا البر تو کی گیارہ افراد کی ایکسپنڈیشن ٹیم راکا پوٹی Summit کرنے جا رہی ہے۔ ایک ترک برٹش ایکسپنڈیشن اور بھی ہے۔ بالٹیکس دن کی کوہ پیما کی ہوگی اور۔"

"تم ان کے ساتھ آٹھ ہزار میٹر بلند پہاڑ پر جانا چاہتی

ہو؟" ان کے لیے میں سنجیدگی تھی۔

"آٹھ ہزار کھان راکا پوشی تو اس سہت ہزار اور چند میٹر بلند ہے۔" (اس نے میرے نہیں بتایا کہ یہ چند میٹر 788 میٹر تھا۔) اور اس کی Climb تو خاصی مختصر ہے۔" (اس نے دعا کی کہ ان کو علم نہ ہو کہ راکا پوشی کا شمار مغربی Ridge دنیا کا طویل ترین رینج ہے) اور موسم تو اوجھل تھا بھی غراب نہیں ہوتا۔" (اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ البرو تو اپنی ٹیم کے ساتھ کئی دن سے راکا پوشی میں کیمپ میں موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔) میں چلی جاؤں یا؟

"تم جانتی ہو میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔" ان کا لہجہ قطعی تھا۔ "جی" وہاں ہوں ہو کہ وہاں سے چلی آئی۔ باہر برآمدے میں آکر وہ ستون سے ٹیک لگا کر سیاہ آسمان کو دیکھنے لگی۔ تاریکی کے پردے کی اوٹ سے کمان سیاہ ریک چاند جھانک رہا تھا۔ ریٹے نے اداسی سے چاند کو دیکھا یہ چاند بنزہ کے آسمان پر بھی روشن ہو گا مگر کے دریا کے پانی پر بھی چاندی کی پریوں نے رقص کیا ہو گا ہو سکتا ہے اس وقت افق اور سلطان بھی اسے ہی دیکھ رہا ہو اس کے روشن وجود میں کسی اور کو تلاش کر رہا ہو۔

"میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔" یونانی دیوتا کا وہ کردار قراقرم کے تاج محل پر اس کا انتظار کر رہا تھا مگر وہاں نہیں جاسکتی تھی۔ پری کے پر کاٹ لیے گئے تھے۔

پھر رہا ہمیں اس کے دل میں کیا سہائی وہ اپنے کمرے میں آئی اور دیوار پر لگے پوسٹرز مارنے لگی۔ ان کو اتار کر وہ کچن میں آگئی اور چوہا بھلا دیا۔

مابہ ناز کوہ بیا اور دنیا کے بلند پہاڑ اس نے انگ میں ڈالنے شروع کر لیے "پورسٹ" کے ٹو ہراڈ پیک "مچھر برن Nuptse Annapurna II کی دیوار سب اس کے چوٹے میں جل رہے تھے زندگی میں ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں انسان کو اپنے تمام خوابوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

"پری یا" اس نے چونک کر بھیکے چہرے کے ساتھ بچھے دیکھا "پلیا دروازے میں حیران سے کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے آگے بڑھ کر چوہا بند کیا اور اس کے ہاتھ میں موجود آخری پوسٹر تھاما۔ تو مارہو

مرنا گار بہت کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہیں کیوں جلا رہی ہو؟ یہ تو تم نے بہت شوق سے خریدے تھے۔"

"بس پلیا اس شوق کا کیا فائدہ جو صرف خوابوں تک محدود رہے۔" زبردستی مسکرائے کی کوشش میں اس کی آنکھیں مزید بھیگی چلی گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ اس کو دیکھتے رہے وہ ان کی اتنی پیاری اور فرماں بردار بیویوں رو رہی تھی وہ بھی ایک چھوٹی سی خواتین کے پیچھے؟

"تم جاسکتی ہو پری یا؟" "جی میں سوئے جا رہی تھی۔" وہ سر جھکا کر ان کے سامنے سے بٹنے ہی لگی تھی کہ وہ بولے۔

"تم راکا پوشی جاسکتی ہو۔"

وہ جاتے جاتے تیزی سے ایزپوں کے بل پر اتر گئی اس نے بار غلط ثابت ہے۔ "آپ نے کیا کیا؟" "تم راکا پوشی Climb (کوہ رانی) کے لیے جاسکتی ہو مگر صرف اپنے دل کے لیے۔" "جیس؟" وہ ہلکے

ہلکا ہلکا ہی انہیں دیکھ رہی تھی۔ "میں۔۔۔ میں جاسکتی ہوں۔"

"ہاں۔ مجھے آج اندازہ ہوا ہے کہ اگر میں نے اپنی بیٹی کو اس کا سب سے برا خواب نہ دیا تو یہ اس کے ساتھ بہت برا عمل ہو گا۔" اس نے بولے اس کا سر جھکا کر قراقرم جاؤ کی جیسے "سیف نہیں پلیا؟" اس سے تو بہتر تھا وہ نہ ہی

جاتی۔ "نشا اور حبیب ساتھ ہوں گے نا؟" حبیب کے فریڈز کا گروپ دیکھ کر وہ ہلکا ہلکا سا ہنسا۔ "راکا پوشی میں کیمپ کیا ہے؟" اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پلیا اتنی جلدی اجازت دے دیں گے۔

"تم نے تو پوری ملا ٹھیک کر رکھی ہے۔" انہوں نے مشکوک انداز میں اسے گھور تو وہ ہنس دی۔ اچھا مجھے بتاؤ۔ کتنے پیسے چاہیے ہوں گے تمہاری ٹور کمپنی نے تو تیار ہزار لے لیے تھے نا؟ "انہوں نے وارث حبیب سے نکالا۔

"راکا پوشی کے لیے پلیا سات آٹھ۔۔۔" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"بس آٹھ ہزار؟" وہ ہزار ہزار کے نوٹ گنتے لگے۔

"آٹھ لاکھ پلیا۔" اس نے تھوک نگل کر کہا، پہلے پیشہ وہ اپنا نمبر اور فنڈز ایکسیڈیشن کے ساتھ جاتی تھی اب وہ دن میں وہ فنڈز ریڑ کرتے سے یا اپنا سر شپ حاصل کرنے سے تو رہی!

"پری، آریو میریس؟" وہ حیران ہوئے تھے "ان کا دل خشک تھا نہ ہاتھ دنگرا نہیں حیرانی ہوئی تھی۔

"بس پلیا تھوڑا سا شوق ہے نا۔" وہ حبیب کو ہنس دی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اتنا آسان ہو گا اگر ہوتا تو وہ تو کافی عرصہ پہلے ہی پوسٹرز چلانا شروع ہو جاتی۔ اسے تو مارہو مرگا وہ پوسٹر پہلے بھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا جتنا آج لگ رہا تھا۔



اگست 2005

"دھرم پھسایا ہے آپ نے ریٹے آپا؟ میں تو پتا نہیں آ رہا کہ سفر شروع کر گیا تھا کہ بنزہ پہنچ کر چارپانچ پورہ ہو کر آئے "اسمان گدھوں پر اور پھر آئے گا جگمگاتے دریا کے کنارے سفر کرنے کے بعد "تھوڑی گاڑی کیمپ خوب صورت دریا گھٹا جنگل مسبزہ ہی مسبزہ وہ جیسے غدار کے جیسا تھا "مگر بھلا کرے آپ کا آپ ہمیں دھانک کے راہ میں کے ویٹ قیس کے بجائے ہر ہر برف میں سے آتی ہیں؟ اتنی برف اور اتنے

انسان ہیں۔ "خیر تمہارے اسمان ہونے پر مجھے شک ہے۔" حبیب نے اس سے راکا پوشی کے شان مغربی سبزہ فاصلہ دو دن کی پیدل مسافت پر تھا اور پچھلے دو دن میں حبیب یہ بات کوئی چھ سو لکھ کہ چکا تھا سب سے حد تک آکر نشاء نے کہا۔

"یہ اتنا خطرناک علاقہ ہے اس ایکسیڈیشن ٹیم کی مت ماری گئی ہے بخوراکا پوشی نار تھ ویٹ سپر سے سر کرنا چاہتی ہے؟ اس راستے سے کوئی بھی چوٹی تک نہیں پہنچ سکا۔"

"وہ سب ایک گلیشیل وادی میں آگے پیچھے ایک قطار میں چل رہے تھے پریشہ نشاء اور حبیب سے پیچھے اس کے دوست اور ان سے پیچھے اٹھا نہیں پورہ تھے جو انہوں نے بنزہ سے ہی لیے تھے۔

"حبیب! تمہیں تکلیف کیا ہے؟ تمہارا "ہوجھ" تو پورہ بننے اٹھایا ہوا ہے۔" حبیب کی مسلسل چلتی زبان پر پریشہ نے بولے بولی تو دن پورہ بننے کے ساتھ وہ کروہ بھی سامان اور گدھے پر اٹھائے رک سیک کو "ہوجھ" بولنے لگی تھی۔

پورہ پاکستان میں وہی کام کرتے ہیں جو نیپال میں sherpas کرتے ہیں۔ سیزن میں جب سیاحوں کی آمد رفت عروج پر ہوتی ہے یہ پورہ ان کا سامان اٹھاتے ہیں اور ان کو ان کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔ نشاء نے اسے مارے پورہ لینے پر دو دن پہلے پریشہ سے حیرت سے کہا تھا۔

"ان پر اتنے پیسے خرچ کرنے کے بجائے ہم ان کے بغیر چلے جاتے ہیں۔ کیا فرق پڑے گا؟"

"فرق تو کوئی نہیں پڑے گا بس ہم دونوں تو کیا دو مہینوں میں بھی راکا پوشی نہیں پہنچ سکیں گے۔" پچھلے دو دن سے وہ پیدل ان برقی واپیوں میں سفر کر رہے تھے یہ وہ علاقے تھے جہاں آپ فاصلے کو کلومیٹر میٹر یا میل سے نہیں "دونوں ہفتوں اور مہینوں سے ناچتے ہیں۔

پریشہ نے دو دن پہلے جب پیدل سفر شروع کیا تھا تو اسے اسلام آباد گراچی ٹیکسٹ سٹرکٹ سب بھول گیا تھا "اوں لگا تھا جیسے وہ ٹیکسٹوں سال پہلے وقت میں پیچھے چلے گئے ہوں جب انسان پیدل پتھروں اور برف پر سفر کرنا تھا۔

"وہی مجھے لگتا ہے ہم سا پاگل کوئی نہیں ہو گا جو گھروں کا سکون چھوڑ کر پھاٹوں میں ٹریکینگ پر نکل جاتے ہیں اور آیا جیسا پاگل تو کوئی نہیں ہو گا جو پھاٹوں کو سر کرنا چاہتی ہیں۔"

"آپ کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟" وہ حبیب کے مذاق کو نظر انداز کر کے عقب میں اس خشک راستے پر چلتے پورہ بننے کے سردار سے پوچھنے لگی۔

"بس میڈم آدھا گھنٹہ اور!" پورہ بننے کے سردار نے پورہ بننے کے دستور کے مطابق بوجھ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

"پچھلے 12 گھنٹوں سے یہ بلڈی چپ "آدھا گھنٹہ اور" کہہ رہا ہے۔" عقب میں کوئی انگریزی میں بیروایا پریشہ نے گردن پھیر کر دیکھا۔ حبیب کا وہی دوست ایک برفانی تالے کے کنارے پر چلا ہوا بیڑا رہا تھا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی مگر سامنے سے آتے آسمان دیکھ

کران کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہاں گلیشٹر پر ان کے سامنے سے ایک ٹیم آ رہی تھی پریشے اپنی ٹریکنگ اسٹک کی مدد سے چلتی تھی قدری سے ان تک جا پہنچی۔ یوں لگتا تھا جیسے سالوں بعد ان تھنا سنسان وادیوں میں کسی انسان کو دیکھا ہو۔

”السلام علیکم پاکستانی؟“ ان کے چہرے سے ظاہر تھا پھر بھی قریب پہنچنے پر اس نے پوچھ لیا۔ وہ پانچ تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا ان سے کسی گڑبچھے ان کے پورٹرز کی فوج آ رہی تھی۔

”جی میڈم پاکستانی الحمد للہ!“ وہ خامسا تھکا ہوا لگ رہا تھا پھر بھی بہت رعب مگر شائستگی سے بولا۔ وہ اس کی گنگ سے ہی پہچان گئی تھی کہ فوجی تھا۔ باقی بھی آ رہی کے ہی تھے وہ چاروں خامسے تھکے تھکے لگ رہے تھے البتہ پانچواں بہت فٹنس اور روئیل کسڈ تھا اس کی کیپ گھاسز اور مفلکی وجہ سے وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی تھی۔

”میں کیپ سے آ رہے ہیں آپ؟ وہاں موسم کیا ہے؟“

”موسم؟“ تازہ دم پانچویں ساتھی نے ہنس کر سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔

لیڈر جس کا نام میجر اطہر تھا کہنے لگا۔ ”موسم کی مت پوچھیں ہمیں اہم پاکستان آ رہی کی ملٹری ایکسپڈیشن کر رہے تھے سات دن راکا پوشی کے اور پانچ ہزار میٹر کی بلندی پر ٹیموں میں قید ہو کر موسم کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ آٹھویں دن پار مان کر بچے اتر آئے۔ جس دن میں کیپ پہنچے موسم بالکل ٹھیک ہو گیا۔“ اس کی بات پر پریشے ہنس پڑی۔

”اب کون کون ہے میں کیپ میں؟“ اس نے میجر اطہر سے پوچھا۔

”البرٹو کی ٹیم ہے مگر وہ بھی ہمت ہار کر جانے لگے ہیں اس کے علاوہ وہاں گل اور بھی موجود ہیں۔“

”افق ارسلان کی ٹیم؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے ایک نظر میجر اطہر کی پشت پر سیاہ قراقرم کے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکتے ”بگ وائٹ ماؤنٹین“ راکا پوشی پر ڈالی۔ ”وہ قریب ہی تھا۔“

”جی وی ایہ میجر عاصم جو ابھی آگے گیا ہے افق ارسلان کا دوست بھی ہے اور لیزان آفیسر بھی۔ ارسلان کو

کچھ چاہیے تھا“ اس کے لیے ہی منہ جابجا رہا۔ ”ہم نے پلٹ کر دیکھا میجر عاصم خاصا دور جا چکا تھا۔“

وہ پاک آ رہی کی ملٹری ایکسپڈیشن ٹیم کو خدا عارف کہہ کر اپنی ٹیم کے ساتھ چلنے لگی۔ مگر اور ہنزہ کے دریاؤں کو کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے ہنزہ کے دریا کے پانی سے اس نے سونے کے ذرات ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سکندر اعظم کی فوج کی نسل جس وادی میں آباد ہے (ہنزہ کی وادی) وہاں کے دریا ہنزہ سے سونا نکلتا ہے۔

”اف کتنا سہارا ہے ہٹا حکومت کو چاہیے راکا پوشی تک سڑک بنانے ہنزہ آرام سے پہنچ تو جائے۔“ حسیب کا دوست جس کا نام وہ میجر محمول چکی تھی کہہ رہا تھا۔

”ہاں تاکہ مری کی طرح ہر بندہ منہ سامنے اوجھلا آئے؟ نہیں سنا راکا پوشی کا حسن غرض مانتا ہے جس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پیدل ملے۔“ اس سافٹنیں چکی تھی۔

”کایت دوا کہ بندہ“ پرتوں کی دیوی ”راکا پوشی کو دیکھ کر کل منہ ہو جاتا ہے مثلاً“ حسیب جس نے زندگی بھر کوئی عقل مندی کی بات نہیں کی مگر میں کیپ تک پہنچے ہی۔“

وہ آگے بڑھ سکی کیونکہ میں کیپ کے قریب پہنچ کر اس نے پارک سیک ہٹ پر پھینکا اور اپنی ٹیم سے کہنے لگا ہٹا پڑی۔

اس کے سامنے پرتوں کی دیوی اپنے تمام تر حسن کے ساتھ کھڑی تھی مگر اسے اس کی تلاش تھی جس کے لیے وہ وہاں آئی تھی۔

برف کے دھکے راکا پوشی۔ یہ وہاں ہیں پتھروں کے ”Moraine“ ہر ایک عمودی بالکونی کی صورت میں کیپ تھا۔ ہر طرف نیلے پیلے اور سرخ خیمے لگے تھے۔ میں کیپ سے 100 میٹر نیچے ایک دیو قامت بے ترتیب گلیشٹر تھا۔ یہ تمام ”ہیڈ“ کا گلیشٹر تھا اور برف گلیشٹر پر افق ارسلان اور البرٹو کی ٹیم نے میں کیپ ٹھیک اس جگہ لگایا تھا جہاں 1979 میں ایک پوشی پاکستانی ٹیم نے نصب کیا تھا جس پر اگلے دن ہی راکا پوشی سے برف کی ایک دیوار ٹوٹ کر گری تھی اور ابوالاچ سے پیدا ہونے والی ہوائوں سے ہی تمام ٹیموں کی ٹیمیں اکٹری تھیں مگر پریشے کو برو کے خطرناک گلیشٹر پر اپنے

بلکے واٹر پروف ٹریکنگ بوٹس کی مدد سے بھاگتی ہوئی ٹیموں کی طرف آئی۔ وہاں درجنوں خیمے نصب تھے۔

”افق ارسلان کہاں ہے؟“ دھڑکتے دل سے اس نے سامنے سے آتے اٹالوی لڑکے سے پوچھا۔

”ان وی میس ٹینٹ۔“ دی لاسٹ دن! ”وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتا کر ٹینٹ میں آگے نکل گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آخری نیلے خیمے کے قریب آئی باہر رک کر شخص دوست کیا۔ سر پر سے اونٹنی اتار کر پانی ٹھیک سے باندھی پھر اونٹنی پسٹن من گلاسز اتار کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے اور خود کو پارل کر لینے اور اندرونی خوشی کو چھپاتے ہوئے خیمے کی کھلی زپ سے اندر بھاٹکا۔

وہ میس ٹینٹ کے اندر کرسی پر بیٹھا تھا اس کی پشت پر بٹے کی جانب تھی نہانی سے آنے والی سرد ہوا کے پرتوں کے باعث خیمے کا کپڑا پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ اندر آگئی۔ ”کیسے ہے افق؟“ اس کے عقب میں بانڈ سے پر ہوا ہوا نے مسکرا کر پوچھا۔ اس نے پتھک کر گردن ہموار کر کے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایم فائن۔“ اس کی توقع کے برعکس وہ حیران نہیں ہوا تھا اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ کسی گہری سوچ سے نکلنا تھا اور وہاں اس میں کھو گیا تھا۔

وہ اس کے پوچھنے سے تھی کہ وہ کیسا ہے اس نے نئے دن اپنے کارے کے کا انتظار کیا یا نہیں اور اسے اس کا سواڑہ بھگت چکی تھی جس سے پہلے اس کی نظر افق کے ہاتھ کے موجود ہونے کی صورت ساز تصور پڑی۔

”جیسے دو دن سے اس نے اپنا اور افق کی جو اکتو تصور کی تھی وہ بالکل بھی ایسی نہیں تھی وہ جو بہت سی باتیں بتاتا اور پوچھنا چاہتی تھی اب اچھپے سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔“

”یہ؟“ افق نے گردن جھکا کر تصویر کو دیکھا ہولے سے مسکرایا اور تصویر اس کی جانب بڑھا دی۔ ”یہ خندا ہے۔“

”کون خندا ہے؟“ اس نے تصویر کے لیے ہاتھ بڑھایا جس میں ایک سنہری بالوں اور خوب صورت آنکھوں والی لڑکی مسکرا رہی تھی۔

”خندا ہے۔ میری بیوی۔“ تصویر تھانے کو بڑھا پریشے کا ہاتھ نیچے گر گیا۔ وہ بے

پیشی سے اسے دیکھتی وہ قدم پیچھے ہٹی تھی۔ ”بیوی؟“

تالیہ اور قراقرم کے سارے پہاڑ اس کے سر پر گرے تھے۔

دوسری اور آخری قسط (ایڈم مہار)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	موضوع	قیمت
زندگی اک روشنی	رخصانہ گارعدان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخصانہ گارعدان	150/-
شہرول کے دروازے	شازبہ چودھری	300/-
تیرے نام کی شہریت	شازبہ چودھری	200/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	400/-
آنکھوں کا شہر	فاخرہ الفجار	450/-
بچاؤ دے رنگ گائے	فاخرہ الفجار	200/-
تین سے مورت	قراقرم علی	150/-
دل اسے دھڑلایا	آسیہ مرزا	300/-
کھربا جائیں خواب	آسیہ مرزا	150/-
خواب درتے	سعدیہ ال کاشف	150/-
امری کا چال	بشری سمیر	150/-
رنگ خوشبو کا دلد	افکار انفریدی	400/-
درد کے واسطے	دعیمہ نیل	400/-

لاہور، منگلوار کے لیے کتاب ایک خرچ 30/- روپے
منگلوار کے لیے
کتاب محمد مرزا ڈائجسٹ 37 اور پہاڑوں کرانچہ
فون نمبر 2215381

مال روٹی پر پریشے اور نشاء کی ملاقات ایک ترک انجینئر افق ارسلان سے ہوتی ہے جو راکا پوشی سر کرنے پاکستان آیا ہے۔ اس کی ساجرانہ اور براسرار شخصیت پر پریشے ٹھک سی جاتی ہے۔ بظاہر وہ سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے بعد میں پتا چلتا ہے کہ افق بھی پریشے اور نشاء کے ساتھ ہی اور کمپنی کے تحت نادران اس پر جا رہا ہے۔ نور کے دور ان کی ملاقات ایک اہلی ارد سے ہوتی ہے جو ادیبہ بھی ہے۔ پریشے اور افق ارسلان کی ٹوک جھوٹک غیر محسوس انداز میں دونوں کو ان کے خوب صورت جذبے میں جکڑ دیتی ہے۔ افق کا خصوصی لگاؤ دیکھتے ہوئے پریشے اسے اپنی منگنی کا تیار ہوتی ہے جس پر وہ سائل ہو جاتا ہے۔

واپس آکر بھی پریشے اپنے آپ کو ایک سحر گر فتار میں محسوس کرتی ہے۔ وہ جہانزیب صاحب سے راکا پوشی کی انجینئریشن پر جانے کی اجازت مانگتی ہے، ہجرت انگیز طور پر اسے اجازت مل جاتی ہے۔ نشاء عجیب (نشاء کا بھائی) کے دوستوں کے گروپ کے ساتھ پریشے محض افق ارسلان سے ملنے راکا پوشی آتی ہے۔ افق بے حد نادران انداز میں اس سے ملتا ہے۔ اس ملاقات میں افق ارسلان پریشے کو ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر دکھاتا ہے۔ پریشے کے استفسار پر افق بتاتا ہے کہ اس کی بیوی حنا ہے۔ پریشے اس خبر پر کم صدم ہو جاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

دوسری قسط

دل و جان کا جھگڑا

یہ کہانی ڈاکٹر پریشے جہانزیب کی ہے جو خوابوں کے حقیقت بننے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ طبعاً "مشکل پسند" ہے اور ہرچ میں خوب صورتی تلاش کرتی ہے۔ پریشے والدین کی اکھوتی اولاد ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ پریشے کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن کوئی شہزادہ اس کے خوابوں کو تعبیر کا روپ دے گا۔ اسے جہاں کا اس وقت لگتا ہے جب اس کے والد اس کی منگنی پھولی زاد سیف سے کر دیتے ہیں۔ سیف اور پھولی کی فیملی کی طبیعت جاگمگانہ ہے، مگر والد کے فیصلے پریشے سر جہاں دیتی ہے۔ ماسوں زاد کو زن نشاء سے اس کی گاڑی چھنتی ہے۔ ماسوں کی پوری فیملی بھی پریشے کے رشتے پر خوش ہیں۔ چھوٹے کو ہر وقت پریشے کا رشتہ ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس لیے والد شادی پر زور دیتی ہیں۔ شادی ہونے پر طے پاتی ہے۔ کچھ دن آزاد زندگی گزارنے کے لیے وہ نشاء کے ساتھ نادران کے لیے جانے کا بیان دیتی ہے۔ جس پر ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔



تیسویں

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی حیرت، صدمہ، کچھ بھی پتھپانے کی سعی نہیں کی تھی۔ کسی نے جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین پھینچ لی تھی اور وہ بچھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”ہاں، یہ اس کی کچھ بونہی نکال لی تھی۔ خیر تم کب آئیں؟“ تصویر واپس وارٹ میں رکھ کر شیب میں ڈالتے ہوئے افق کا انداز بہت نارمل تھا۔

”ابھی۔“ اس کا لہجہ ایک دم روکھا سا ہو گیا تھا۔
اس نے گردن اور سر کی جانب پھیر لی۔
”مجھے علم تھا تم ضرور آؤ گی۔ میں نے تمہارا انتظار
کیا اور دیکھ لو، بے جا انتظار نہیں کیا۔“ وہ مسکرایا۔
”کوئی دھوکا کھا جائے تو دھوکا دینے والا ایسے ہی
مسکراتا ہے پریشے کا نسوانی وقار بری طرح مجروح
تھا۔“

”ٹھہرو میں اپنی باتی ٹیم کو رکھ کر آؤں۔“ افق نے اس کا شنگ اور رکھائی بھرا انداز ٹوٹ نہیں کیا۔ وہ اسے چھوڑ کر قدرے بدلے سے باہر آگئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے آگیا۔

”یہ تمہاری سپورٹ ٹیم ہے، ٹریکرز ہیں یا یہ بھی
کلائمب کر رہے ہیں؟“

”نریکڑ ہیں۔“ وہ اس سے دور ہٹ کر پتھروں پر
 چلے ہوئے پیچھے کی سمت سے آنے والی اپنی ٹیم کے
 افراد تک آئی۔ وہ سب پر جوش سے ہو کر اپنے رک
 سبک اتار کر نیچے برف پر پھینک رہے تھے اور رانا
 پوتھی کی حسین چوٹی کو غوم پھر کر دیکھ رہے تھے۔
 صرف وہ تھی جس کی دلچسپی وہاں موجود ہر شے سے ختم
 ہو گئی تھی۔

دور ایک پتھر پر ارسہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر کاغذ رکھے تھے اور ان پر کچھ لکھ رہی تھی۔ شور، ہچکل اور ٹریڈز کی آوازیں سن کر اس نے سر اٹھایا۔ پریشے کو سامنے دیکھ کر وہ سارے کاغذ وہاں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اس کی جانب آئی۔ ”پریشے آئی آپ اور؟“ ”لوہ گاڑ“ مجھے یقین نہیں

آ رہا۔ ”وہ خوشی کے مارے اس سے لپٹا گئی۔“
 ہو کر اسے نگدھوں سے تھام کر خوشی سے لپٹا
 میں بولا۔ ”یقین کریں‘ آج صبح سے میں
 متعلق سوچ رہی تھی۔ بہت اچھا کیا جو آپ
 ویسے اپنی جلدی کا انعام پر مٹ جیسے نا آپ
 ”کم آنا میں پاکستانی ہوں مجھے کا انعام پر
 ضرورت نہیں ہے۔“ اپنی آواز میں پشامی
 کرنے کا ناکام کو شش کرنے ہوئے وہ چھکی مسکرا
 کے ساتھ بولی۔

میں کیمپ کے ہنگامے ٹریکرو کی آمد کے بعد
جاگ اٹھے تھے۔ چند پورٹرز تھے لگا رہے تھے ان کے
ان کی مدد کرتے تھے پریشے اپنے ایک ایک
الٹھالی پہنچائی لائی تھی جو چوہا لٹا کر چھاپا کرتے تھے
تھا۔ شفا کے قریب بیٹھے ہوئے چالی میں سے کچھ
لی رہے تھے

Paradise Alberto (یا البورتو) کی اطالوی فلم
 میں ان کے قریب آنے لگی تھی۔ البورتو انگریزی سے تعلق
 تھا یا تو اطالویوں میں سے ایک کو تھوڑی سی انگریزی
 آتی تھی۔ وہ سب کو بتا رہا تھا کہ کل صبح اس کی
 والدین اس سے اور دور اٹھ گئی تھیں کہ وہ اس کی
 چوٹی کو سر کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

پیشے نے پورٹریٹ کی مڑا رہی کی تمام رقم "سروار"
پورٹریٹ کے ہاتھ میں رکھ دی اور اپنے خیمے میں چلی آئی۔
یہ لوگ کھاتہ تھے۔ یہ رقم سارا کھاتہ تھا۔
PHOTO
اپنے خیمے میں آکر اس نے میٹ بچھایا اور
سیلنگ بیگ ڈالا اور اس میں لیٹ کر آنکھیں بند
کر لیں۔ اس کی سماعتوں سے باہر ہونے والا شور و غل
اور تمبھوں کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں مگر اس کا ذہن
کہیں اور تھا۔

حنا بے افتخار کی بیوی وہ شادی شدہ تھا۔ کسی اور کے ساتھ کھٹہ تھا تو پھر اسے کیوں قراقرم کے تاج محل پر بلایا تھا؟ وہ غلط کبھی تھی اسے؟ اس نے دھم کا کھایا تھا؟ جانے کب اسے تین دنے آن کھیرا۔ افتخار

اسات رات کے کھانے پر بلائے آیا مگر سوتا خیال کر کے
واپس چلا گیا۔

9 اگست 2005ء

[illegible]

ایک جھگڑے کے بعد اس کا سانس تیز تیز
 ہل رہا تھا۔ وہ دیکھ کر سوچا کہ اس نے بے
 اختیار اپنے چہرے کو پتھر اور غیر متعلقہ
 چیزوں کے ساتھ مل کر دیکھا ہے۔ وہ بھانک
 کر دیکھا کہ اس نے اس کے سامنے کئی
 سوالات پوچھے ہیں۔ اس نے اس کے سامنے
 اس کے زور سے اس کے حیمے کا گور ٹیکس پھر پھر رہا
 تھا۔ وہ تیزی سے زپ کھول کر باہر آئی۔

ہنزدہ اور گلگت کے درمیان واضح کریم آباد گاؤں پر
 حج طلوع ہو رہی تھی۔ بلاہٹ مائل شہری روشنی
 سے راکا پوشی کا لودھ کی طرح سفید اور اطراف کے
 ماہر یوہکل پہاڑ جھک اٹھے تھے۔

بریتیش نے ارد گرد دیکھا۔ سامنے ہی خالی قلعے پر
 لستان آرمی کا ستر پہلی کاپٹر لینڈ کر رہا تھا۔ اس کے
 کھومتے پروں کی تیز ہوا سے اطراف کے تمام غیموں
 کے گور ٹیکس پھڑپھڑا رہے تھے۔

دور نصب غیلے خیمے کے سامنے کھڑے افق
اور سلمان نے شہساز انداز میں پہلی کاپڑ کی جانب ہاتھ
ہلایا۔ وہ سیاہ فلیس جیکٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس گھرے
اونی ٹوپی سے سر ڈھکے مسکراتے ہوئے پانکٹ کو دیکھ
رہا تھا۔

بیلی کا پٹر کے پرست ہو چکے تھے۔ کھلے دروازے سے پرستہ قد چھکے نقوش کے حامل ٹورسٹ اتر رہے تھے۔ بیلی کا پٹر کے بالٹ کا چہرہ اسے دور سے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیا تھا۔ نہ اسے دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے کھلے بالی انگلیوں سے سنواری "آکھیں ملتی ان سے دور ہتی تھی۔ اس کا ذہن حنا کے اور اپنے خواب کے درمیان پھنسا تھا۔

یہاں نرم گدلی برف کے درمیان ایک برفانی نالہ
 بہہ رہا تھا۔ سورج کے چمکنے کے باعث نالے کا آؤھایانی
 پھل چمکا تھا، اور اس میں برف کے بڑے بڑے
 ٹکڑے تیر رہے تھے۔ نالے کے اس طرف حسیب کا
 دوست بیٹھا تھا۔

”یہ جیسی پرکون آیا ہے بری آیا؟“
وہ اپنے خیالات سے چونکی، پھر ناگوار شکنیں مارتے
برا بھڑکے۔ ”بسٹ ڈونٹ کل می آئیڈ۔“ ہلے آیا اور
نہن جیسے رشتوں کی تمیز سیکھو اور پھر یہ لفظ کہو۔ ”آپ نے
نئے ٹراؤزر اور جیکٹ کی پروان کرتے ہوئے وہ وہیں
گھٹا برف پر بیٹھ گئی۔

”آپ مجھ سے ہر وقت غفاریوں رہتی ہیں۔“
 ”مجھے زہر لگتے ہیں تمہارے جیسے لا ابالی لسم کے
 جوان جولو کیوں کو دیکھ کر سٹی بجاتے ہوئے۔“ وہ
 سرخ پھیر کر پیازوں پر بنی قدرتی چراگاہوں کو دیکھنے لگی
 تھیں جانور چرتے پھرتے تھے البرتو کے نیم ممبرز اور
 اس کے پورٹرز سلمان کندھوں پر اٹھائے، جونیئوں کی
 طرح سپدھی قطار میں چلتے ہوئے بیس کیپ سے
 الپس نیچے جارہے تھے۔

”یہ عمر ایسی ہوتی ہے۔ سب اس عمر میں ایسے ہی
وتے ہیں۔“

”نسب نہیں ہوتے۔ محمد بن قاسم نے اس عمر میں

سندھ فتح کیا تھا۔

”وہ تو میں نے بھی کر لینا تھا اگر یہ تلواروں کا دور ہوتا“ وہ لا پرواہی سے کہتا۔

”سٹت آپ!“ اس نے اسے جھاڑ دیا۔ ”اور آئندہ مجھے آیامت کہنا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے ناشتہ بھی کرنا تھا بال بھی باندھ کر کان بھی ڈھکنے تھے۔ کیونکہ ہلکی ہلکی چلتی بستی ہوا اس کے کانوں میں گھس رہی تھی۔ وہ جانے کے لیے مڑی، تب اسے خیال آیا۔

”سنو تمہارا نام کیا ہے؟“

نالے کے اس پار برف پر بیٹھا لڑکا مسکرایا۔

”فائن۔“ وہ سر جھٹک کر بیس کیمپ کی جانب بڑھ گئی۔

بیس کیمپ جاگ رہا تھا۔ ناشتے کی ٹوشیو، چل پیل، پورٹریز کی واپسی، پست قد نور سٹش کی آمد۔ وہ کچن ٹنٹ کی طرف جاتے جاتے رک کر افق کو دیکھنے لگی جو ہلکی کاپڑ کے دروازے کے قریب کھڑا بیس کیمپ کراندر بیٹھے پاکٹ سے بات کر رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ ان کے قریب چلی آئی۔

”ایکسکیموزی آفیسر! یہ کون لوگ ہیں؟“ افق کو یکسر نظر انداز کر کے اس نے پاکٹ سے سوال کیا۔

”یہ کچھ امیرو کبیر جلالی سیاح ہیں جو راکا پوشی کے N W Supr (شمال مغربی راج) کی ٹوٹو کرانی کرنے کے لیے دو دن پیدل چل کر بیس کیمپ آنے کے بجائے پاکستان آرمی کا ہیلی کاپٹر اوزار کر سکتے ہیں۔“ مسکراتے ہوئے افق نے جواب دیا۔

”کیا واقعی توماز ہو کر کوٹاگا ریت سے ابھی آپ لوگوں نے ہی نکالا ہے؟“ دوبارہ پاکٹ کو مخاطب کیے اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

”بچے میں آفیسر نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سیاہ گلاسٹا کیپ کے باعث واضح نہ تھا۔

”فری! یہ میرا دوست ہے۔ میجر عاصم اور عاصم! میری سہیلی کا بھروسہ ڈاکٹر پریشے جہاں رہتا ہے۔“

”ہائس ٹو بیٹ یو ڈاکٹر! آپ کو کل بیس کیمپ کے راستے میں دیکھا تھا۔“

”جی، مگر میں کیمپ تو ہنزہ سے دو دن دور ہے۔ آپ اتنی جلدی واپس جا کر ادھر کیسے پہنچ گئے؟ اور میجر اطہر کمر رہے تھے آپ ترک نیم کے لیزان آفیسر ہیں۔ حالانکہ لیزان آفیسر کا قانون تو پچھلے سال لومبر میں ختم ہو گیا تھا۔ سوائے بلتورہ کے۔“

”یعنی پہلی سے پہنچ گیا تھا اور اس میں خالی ان آفیسر دو سال پہلے بلتورہ میں تھا۔ اب یہاں کولانا ساتھ اور سلمان کی۔“

”جی! وہ افق کو بغیر لٹ کر اسے وہاں سے ہٹ گئی۔“

”اچھا! وہ افق کو بغیر لٹ کر اسے وہاں سے ہٹ گئی۔“

”تم نے آج اور کل ٹھیک سے ریسٹ کیا؟“ وہ اپنا بیت اور فکر مندی سے کہتا اس کے ساتھ پتھروں پر بیٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

”ہولہ۔“ اس نے نظر بھی اس کی جانب نہ اٹھائی۔ ”ابھی لٹنے تک میں اور فرید (پورٹ) کیمپ دن 4800 میٹر تک جا میں گئے۔ راکا کا موسم آن

بہتر ہو رہا ہے۔ تمہیں اپنی Acclimatization شروع کروانی چاہیے۔“

”بہتر۔“

”تم اپنی فکر مند تمہیں کہ تمہیں اجازت نہیں ملے گی اور دیکھو، ذرا لگن سے تم نے ریگونسٹ کی اور تمہارے پیالے فوراً“ تمہیں۔“

”میں چلیج کر لوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بولتے، لٹے رک گیا، پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

(نوٹ۔ انتظار تو میں نے کیا تھا۔) وہ اسے نظر انداز کیے اپنے اور نچ خیمے میں چلی آئی۔

گھنٹے بعد وہ فرید اور افق کے ہمراہ ہاتھ میں آبی ایکس اور کمر پر بیس کلو وزن کی ”یو جھ“ اٹھائے راکا پوشی کے قدموں پر چڑھتے۔

اگلی رات سے acclimatization کی شدید ضرورت تھی۔ اس کو اپنے جسم اور پیچھے پتھروں کو کم آکسیجن اور ہائی اینٹی یوڈ کا عادی بنانا تھا مگر ابھی تک تو اس کا ذہن نئی حقیقتوں کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ سارا راستہ خاموش رہی۔ افق بولتا رہا، اس کو ڈھلوان پر چڑھاتا رہا۔

راکا پوشی کے سلسلے میں رات کو تھکے ہوئے تھے، جنوب مشرقی فیس ہو، ”کلت گوہ“ کے گلیشیر سے ہو کر جاتا تھا، طویل ٹکڑا آسان ترین تھا۔ دو سرا مغربی فیس (پسان گلیشیر) اور تار تھ فیس اور پھر تھا ”تار تھ ویسٹ ج“ W T Range، ٹوٹا کا طویل ترین راج جو تک گونی نہیں تھا۔ افق اور سلمان کی ٹیم نے اسے ادھر پہنچا دیا۔

دو پہر تک کیمپ دن 4800 میٹر اور فرید نے تمام سلمان خیموں میں بڑا شروع کر دیا، اس کے ایک نظر پر افق کی استعداد سے سلمان نکل رہا تھا اس کے سر پر کھڑے اولی ٹوٹی پر سفید پٹائی سے ”Hakaposhi 2005“ لکھا تھا۔

وہ رخ پھیر کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

وہ صبح بریلا میدان، تین شوخ رنگوں کے خیمے اور گردنیں نہیں سے گدلی برف جو انگریزی فٹوں کی طرح صاف ستھری نہیں تھی۔ بیس کیمپ سے کیمپ دن تک برف کم تھی، کیمپ دن سے اوپر راکا پوشی کی بلندیاں برف سے ڈھکی تھیں۔

پریشے نے گلیشیر گلاسٹا آنکھوں پر چڑھائے اور گردن پوری طرح اٹھا کر چوٹی کو دیکھا۔

پہاڑ کی ”گردن“ سے اوپر برف سے ڈھکی چوٹی کے گرد یادوں کا ہالہ تھا، ایسے کہ چوٹی دھند اور بادلوں میں گم ہو جاتی تھی اوپر آسمان نیلا اور صاف تھا، مگر چوٹی دھند میں لٹی تھی اور یہی راکا پوشی کی سب سے بڑی خوب صورتی تھی جس کے باعث اسے دنیا بھر کے پہاڑوں میں خوب صورت ترین پہاڑ کہا جاتا تھا۔ چوٹی سے نیچے پہاڑ کی ہزار میٹر تک ایک خاص زاویے سے نیچے آتا تھا جیسے کسی نے سانچے میں ڈھال کر مہارت سے بنایا ہو۔ دنیا کا کوئی پہاڑ ایسی اونگھی اور منفرد ساخت نہیں رکھتا۔ یہ خصوصیت صرف رومانی سکاس ہے۔ راکا پوشی کا مطلب ہنزہ و کٹر زبان میں چمکتی دیوار ہے، اور رومانی ”دھند کی ماں“

The Mother Of Mist کو کہتے ہیں۔ وہ واقعی دھند کی ماں تھی۔

واپسی کا سفر کمر پر خالی روک سیک کے باعث آسان تھا۔ وہ افق کے آگے آگے اتر رہی تھی۔ اس کا جو تا کٹ رہا تھا، جس کے باعث اسے چلنے میں دقت کا سامنا تھا۔

”جس طرح پیپر کبھی نئے پین سے حل نہیں کرتے، اسی طرح کوہ چٹائی یا کوہ تور دی (رہکنگ) کا تھانہ نئے جوتے سے کبھی نہیں کرتے۔“ اس کی دہنی دوسرے بے خبر وہ اس کے عقب میں کہہ رہا تھا، ”تم نے غالباً“ نئے راکا پوشی لے لیے ہیں اور۔“

”مجھے پتا ہے۔“ اس نے اتنی درشتی سے اس کی بات کالی کہ وہ خاموش ہو گیا۔ پریشے نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ افق نے اس کے روئے کو ماحول کی تبدیلی پر محسوس کیا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ بیس کیمپ کے رنگ پر تھے خیموں میں واضح کی آنکھی تھی۔ اٹالوی جاتے جاتے اپنا کچھ بھی سمیٹ کر نہیں گئے تھے، خالی بوتلیں، کین، بے کار سلمان ان کے خیموں کی جگہ کھرا بڑا تھا۔ سرسئی اندھرا پہاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ خیموں کے اندر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ وہ تیز قدموں سے کچن نینٹ میں آئی۔

”الغیر! مجھے واقعی نہیں پتا تھا۔ میں اتنا کچھ کہتی رہی اور یہ ”وہ“ رو دینے کے قریب تھی۔ وہ جھنجھلا گیا۔“

”ایک تو تم پاکستانیوں میں یہ بڑی خرابی ہے بات کو چباتے رہتے ہو۔ پلیز باتوں کو نگل لیا کرو، ہضم کر لیا کرو۔ جو بوجھل جاؤ پلیز“

وہ اسی طرح بیٹھتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔
 ”ویسے مجھے اگر علم ہوتا کہ تم جنازے سے اتنی
 جلد ملے ہوگی تو اس کا ذکر بہت پہلے کرتا۔ ویسے۔“
 وہ شرارت سے تھوڑا سا جھکا۔ ”میں شہسباز اچھا
 لگتا ہوں کیا؟“ مسکراٹھ دبا کے، بمشکل خود پر سنجیدگی
 طاری کیے وہ مصنوعی معصومیت سے پوچھتا اچھا
 لگ رہا تھا۔

انہاں لگتے ہو یا! مختلف بھیرے انداز میں کہہ کر وہ
 عیسویوں کو دیکھنے لگی۔ افق کی طرح اس کی ٹانگ بھی
 سرخ ہو رہی تھی اور منہ سے دعواں نکل رہا تھا۔
 وہ گفتی ہی دیر اسے دیکھتا رہا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی
 معصومانہ شرارت پر اسے پیار سے دیکھتا ہے مگر کہتا
 کچھ نہیں ہے۔

”پری! آج تک یہ ہوتا آیا ہے کہ کوہِ بیتا خوب
جسمانی مشقیں جھیل کر خود کو ان خوب صورت
پھاڑوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آج رات یہ پہلی
دفعہ ہو گا کہ میرے عقب میں موجود یہ پہاڑ خود کو ایک
بہت خوب صورت کوہِ بیتا کے لیے تیار کرے گا۔“

پریش نے نگاہوں کا زاویہ اس کی جانب واپس
 موڑا۔ قدرے اترا ہٹ قدرے معصومیت سے وہ
 بولی: "کون تم ہیں؟"

”نہیں یار! اپنی بات کو رہا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگے۔

”اچھا اٹھو۔ تمہارا چیک اپ کراتے ہیں احمد سے۔ سارا دن روتی رہی ہو۔ اب تک تمہاری انگلی ٹیو رسک ہنسی عروج کر ہوگی۔“

کھڑے کھڑے اتفاق نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔
وہ نالے کے دوسری طرف تھا۔ پریشے نے پہلے حقیقی
سے اسے دیکھا، مگر وہ اس سے زیادہ درختا نہیں رہ سکتی

تھی۔ اس نے افق کا ہاتھ تھام لیا اور کھڑی ہو گئی۔
اس کا ہاتھ تھامے، نالہ کر اس گیا۔ دوسری جانب افق
افق نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ دونوں ساتھ
ہوئے مٹیوں کے قریب آئے۔

کریم آباد کے رہنما اب اٹھ کر جا رہے تھے۔
احمت پھر بھی بیٹھا کوئی ٹانگہ ستارہ تھا۔ پریشے کو اٹھ کر
کر جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

افس نے اس سے ترک میں کچھ کہا۔ وہ سر ہلا کر
کھڑا ہوا اور ان کو اپنے ساتھ لیے ایک خیمے میں آ گیا۔
”تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ یہ دوست ہے۔“

و اگر اہل حق و ایمان، جیسے کہ اہل حق و ایمان،

احمت کے خیمے میں کرسی سنبھالے ہوئے اٹھ کر کہا۔ وہاں بڑی سی میز رکھی تھی۔ پریش

مقابلہ کریں۔ اہمیت کی گنجائش اس کے واسطے ہے۔

ترک زبان میں افق کو کچھ جاتا رہا۔
”یہ کہہ رہا ہے تم صبح تک بالکل ٹھیک ہو گی اور
تمہارا رکھنا کوئی تباہی سے بچے گا۔“

رہی۔ وہ افق کا ہم عمر تھا مگر بے حد دبلا پتلا اور چہرہ لالہ لڑکوں جیسا تھا۔ بال شہریہ بال بال بھورے تھے۔

جیسے کوئی بچہ غلط کام کرتا پکڑا جائے تو گھبراتے کے
بجائے جھنجھٹ کر مسکرا دے۔ وہ اپنا معصوم لہجہ رانہ

جائے، پھر پھر کر کے وہ اس کو سمجھا دیا۔
 کہ پریشے کے بغیر نہ ہو سکی۔
 ”تمہارا دوست بہت کیوت ہے۔“
 اپنے ذہن ایک نظر پر لٹھ کو، کھڑا ہو کر، اس نے کہا۔

برڈالی جو جھینب کرٹنس دیا تھا اور پھر دوبارہ برٹنس
دیکھا۔ "میرے گیٹ دوست کو بہت اچھی انگلی

”اومس“ اب بوکھلانے کی باری پرانے کی تھی۔
میں سمجھی اسے انگریزی شمس آئی اور اگر ایسا نہیں
ہو تو تم دونوں ترک میں کیوں بات کر رہے تھے؟“

طلب ترک ہو کر ہم فریج میں قیادت کرنے سے
 رہے۔ ویسے یہ اندر سے اچھا خاصا ہے، مادامہ کسی
 حالت میں امت اور مت (رائٹر) بننے کے خواب دیکھا

”اور تم تصور محروکی کے “کمٹ سے اہمیت کی
”جواب آیا۔ “صاحب کہا شاعر ہیں؟“

”الٹا بڑا ترک کلا بکسر ہے تمہیں نہیں علم؟ خیر جتنا
 کی ہوا ہو جائے آفاق ارسلان جیسا نہیں ہو سکتا۔ وہ
 کوئی تقاضا کر رہا ہے۔ مگر رشتے نے سر کو اشارت نہیں

جنگ کہتے ہو۔ چوتھوں افق (مسلان نہیں ہو سکتا۔)

میں نے کہا: "اے اللہ! میری دعا ہے کہ اس نے کہا اور 'دلیل' لے کر شہر آئے۔"

شہزادہ کریم نے مجھے پہلی بار میبل کھائی تھی۔ چڑی

خون پسینے کی گمالی ہے جسے ہم یوں جہالیہ کہیں

اور اس کے بعد اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اس نے ایک اور شخص کو ملایا ہے جس کا نام ہے "اسٹریٹ"۔ اس نے اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کو بھی ملایا ہے۔ اس نے اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کو بھی ملایا ہے۔

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ پورنرز اوہر اوہر پھرتے
کاموں میں مصروف تھے۔ لاؤ سے چند گز کے

میں اس نیلے ٹینٹ میں چلی جاؤ۔ وہ کیونیکیشن

میں ذرا یہ صاف کر دوں۔ "وہ زمین پر بیٹھ کر اپنا چرخہ لگا۔

”خود کیوں ہلاک ہوتے ہو؟ پورٹرز سے کہہ دو۔“
 ”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بے چارے تھکے ہوئے
 ہوں گے میں خود کراؤں گا یہ سب۔“ وہ خالی کیمن
 بوتلیں اور یورینیم پرو سیسڈ فوڈ کے خالی ڈبے سمیٹتے
 لگا۔

وہ کیونیکیشن ٹینٹ میں چلی آئی۔ احمٹ نے اسے
نہایت انداز میں ترشپ دے رکھا تھا۔ سیدھا ٹھٹ
فون ایسٹ ٹاب کیسپورڈ جرنلر کیلک کے لیے سوار

میں نے کہا کہ میں نے اس کے لیے کچھ کام کیا ہے۔ وہ ایک سٹائشنگ گارڈ اس کے پاس لے گیا۔ اس کے پاس ایک کرسی کے قریب تھی جس پر اس نے بیٹھی تھی۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“
 ”فین ٹیل چیک کر رہی ہوں۔ اب تو ایک ہی قسم
 کی ڈی مینڈ سے پورے ملک نے لگا رہا ہے۔“

کیوں کہتے ہیں؟ خود کیا وہ اس عمر میں فیڈر پیتے اور روٹی کھا جاتے تھے؟ مہر، اعم کے بارے میں اسے

[illegible]

نہیں؟ خدا ایسا عیسٰی نے فلمی دوستی کا اشتہار تو نہیں دیا تھا جو
میں نے ہر ہفت روزہ کی کتاب ہے اور میرے پاکستانی بھائی کی دوست
چھوڑ کر جو فلم میں اچھے ہیں ان سے محبت کرنا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر وہ فری ہوئے لگتے ہیں۔ پتہ
میں لوگوں کو اسے ارد گرد فریڈز نہیں ملتے۔

”بیٹھ جائیں اور کبھی لطفے بڑھنے کا شوق ہو تو میری
میلنگھا کہ روتی رہنا“۔

پریٹے نے میل کھولی۔ سیف کی تین ای میلز
س جو اس نے پڑھے بغیر مٹا دیں۔ سیف کی ایک ہی

۱۔ وہ چھ واہوں کے لیے کام سے ہر سبز جا رہے تھے۔
 لہذا کام تھا۔ شکر تھا کہ وہ بڑی تھے۔
 ”بیٹھے جاؤں مادام؟ اگر کچھ پر سئل نہیں ہے تو؟“

”میں بھی چاہتا چلا جاتا ہے۔ تم اس سے اس کی بات
اور آنکھوں کا رنگ پر چھو۔“ اب وہ اشق کے ہاتھوں کی
حرکت کو دیکھ رہی تھی۔

”سکس دن ہائٹ اور ہنی کلرڈ آئرز۔“ پیٹر کا جواب آیا۔

”بس میں سمجھ گئی یہ کس کی بات کر رہا ہے۔
 سکس دن اسٹاپ ہوئی ٹکڑا آنز اور ”K“ پر نام ختم
 ہوتا ہے بالکل ٹھیک۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”اچھا۔“ وہ ہونے سے مسکرایا۔ ”پھر کون ہے؟“
 ”سیف الملوک اور کون۔“

افق کے لبوں سے مسکراہٹ عائب ہو گئی۔ اس نے قدرے الجھ کر اسکرین پر اور پھر پریشے کو دیکھا۔
 ”نہیں۔ سیف نہیں۔ یہ تو۔“

”سید ہی ہے مجھے پتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مگر اتنی زیادہ کرتا ہے یہ نہیں علم تھا۔ اور میں کبھی لکھی ہوں نا افسوس“

”نہیں نا۔“ قد جھنجھلایا۔ ”ضروری تو نہیں یہ سیف کی بات کر رہا ہو۔ کسی اور کا نام بھی تو“ کے ”پر ختم ہو سکتا ہے۔“

”اور کسی کا نہیں ہوتا۔“

۲۴ "موتے" سے "آس" نے جھٹلا کر کہا "بڑے باتھیہ مارا۔"
۲۵ "کس" سے "کس"۔

”حمیرا! اور یہ سب میں لکھ رہا تھا۔“ تجھیں تم! وہ
 تجھ سے بولا۔

”اچھا مجھے تو نہیں پتا تھا۔“ پریشے نے ٹھوڑی سی
منہلی جھرا کر مصوویت سے اسے دکھا۔ ”اگر مجھے پتا
ہو تا کہ تم سیف کے نام سے اتنے جھلیس ہو گے تو
بہت پہلے اس کا نام لے دیتی۔ ویسے میں سمجھتی تھی
اچھی لگتی ہوں کیا؟“

اس کا انداز اہل کو بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ تمام
ڈرامہ جان گئی تھی سو ناراضی سے کھڑا ہوا اور کرسی
کے پیچھے سے نکل کر خیمے کے دروازے کی جانب پرہیز
پھرلیٹ کر ایک خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”ہاں۔ لگتی ہو نا۔“ کچھ نروٹھے ہیں کچھ محبت سے

اس نے جیسے بہت ناراضی سے اعتراف کیا۔ وہ بھڑکی۔

”میں اس ناعم اتنے کیوں لگ رہے ہو،“

وہ اسی طرح برا سا منہ بنا کر سر جھٹکتے ہوئے جا رہا تھا۔

”وہ نہیں، یہ تو ابھی احمیت ہے۔“ بے اختیار اس نے زبان و انتوں تلے والی۔

”نوٹ؟ احمیت نے بتایا ہے؟ میں آج اسے رات
 نہیں چھوڑوں گا۔ اس گدھے نے پہلے بھی بچے
 ڈاکٹروں اور نرسوں سے یوایا تھا۔ کہ ”بابے“

وہ غصے سے ہوتا ہے جسے باپ کی ایک روپوش
احتیاط نے انتہا ترس تھی تو اسے ہستی جا رہی تھی۔

33 34 35

11 اگست 2005ء

کے لئے Crampons چڑھانے کا آلہ

جہاں سے اوس نے کمر باندھ کر لڑیاں اور گلا سر پہنے چار
گھر سے

شدائوں کے مطابق کعبہ فرنگیوں اور زرتشتیوں

نظر کے وقت بغیر گلاسز لگائے راکا بوشی کا نظارہ کیا
تھا اور اب وہ سنو بلا سنڈ ہو کر اپنے گھر چلا تھا۔

ہوں کی طرح سردی کے لیے بہت کچھ محفوظ کرتا
 ہے جس کے باعث یہ نہ چاہتے ہوئے بھی کوہ

سب ان چاروں نے میں کیمپ کو الوداع کہا تو افسانہ لکھنے سے ہٹ گئے، مگر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے،

انہی سببوں کی وجہ سے اپنی زبان میں کچھ سمجھا نہ رہا۔ احمیت
اور تعجباً "تین سو میٹر تک ان کے ہمراہ آیا تھا۔ اس
زمانہ میں مسلسل اسے کسی لینڈر کی طرف ہدایات دیتا

اور اس کے اپنے انہی معصوم انداز میں باعقاری

کراست چلا گیا تاخیر اسے نیچے اترنے دیکھا گیا۔
لکھا تھا کہ وہاں ہوں سے اور جھل نہ ہو گیا۔ برائے

ایک آنکھ سے دوسری آنکھ کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی کہ: "اچھا، اب تو تم کو دیکھ کر معلوم ہو گیا ہے کہ میں کتنی بڑی لڑکی ہوں۔"

ہوا کے پیر کی طرح ہر طرف پھیلا ہوا ہے کہ

لے کر اپنے گھر کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہاں پر اس کی بیوی نے اسے دیکھا تو اس نے اسے گھر کے اندر بلایا اور اسے گھر کے اندر لے گیا۔ وہاں پر اس نے اس کی بیوی سے کہا کہ اسے گھر کے اندر لے کر جاتا ہوں۔

کی کہ خدا کرے پروا نہ ہو کہ کیا ہے نہ کیا
آرام حاصل ہے اور آخر میں کیا ہو

اسلامتہ السلام۔ آج کل

اس کی ہر اسان صورت دیکھ کر وہ مسکرایا۔

ہمیں گریٹو عورتیں تھیں۔“

چیسے کے ایک ٹھکڑے میں پیوست نوکدار
پلی سے کرپھنز کو دکھا جو اس کے جوتوں کے نیچے
تھیں۔

مجھے اور جس سے دو برف پر پھسل نہیں سکتی تھی
سرجھٹ کر مسکرائی۔ خوفِ قدرے کم ہوا۔

پیشہ پر ایک ٹی ٹون ٹھونکا پھر رتی کو اس سے استکر کیا۔ یہ تمام کارروائی دیکھنا خاصا غیر دلچسپ تھا سو وہ واپس خیمے میں آکر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

پیشے کو اپنی کھینک پر باز تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈالٹھ بھی بہت تھا سو ان تمام چیزوں سے جو وہ بطور خاص برائی بنانے کے لیے لائی تھی اس نے ہرے پیار اور محنت سے سندھی برائی بنائی۔ شام تک وہ اس کام سے فارغ ہوئی آگے تمام دن

پورچین چیزیں ہی کھاتی تھیں سو آج برائی کھا کر یقیناً اپنی کو اچھا لگے گا یہی سوچ کر اس نے یہ بتائی تھی۔

کھانا ڈھک کر وہ باہر چلی آئی۔ وہاں ہر طرف سخت برف کے اوپر پاؤں سنو کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ دو تین دن سے نئی برف نہیں گری تھی اس لیے یہ برف پختی ہی تھی۔ وہاں خیموں سے قدرے دور ایک پرے گرنٹ کے پتھر پر بیٹھ کر وہ اس بے حد خوش گووار موسم کو انجوائے کرنے لگی۔

را کا پوٹی پر شام اتر رہی تھی۔ ہر سو ٹھنڈی ٹھنڈی سی چھایا تھی۔ وہ پہاڑ کی جانب بیٹھ کر کے غارتا کہناں گھٹنوں پر جمائے پھیلی تھوڑی تلے رکھے خاموشی سے ان خوب صورت مناظر کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے ڈھلتی شام کے سحر میں ڈوبنے لگی۔

خیموں کے باہر اس بے حد تما اور خاموش بریلے میدان میں اس حد تک خاموشی تھی کہ سوئی گرنے سے بھی گونج پیدا ہوتی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ارد گرد موجود تمام دیوینکل سیاہ و سفید پہاڑ بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شام کے اس پر وہ دنیا کا حسین ترین پہاڑ اس کی راجدھانی تھا۔ سارا اکا سارا مانی اس کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پایا پھوپھو مسیف، منشاء سب کسی دوسری دنیا میں رہتے تھے جہاں بلند و بانگ عمارتیں تھیں، جہاں ٹرنک کا شور اور موسیقی کی بے ہنگم آواز گونجتی تھی۔ یہ کوئی اور دنیا تھی۔ جب اس دوسری دنیا کی رات شروع نہیں ہوئی تھی اس دنیا کی صبح ہو جاتی

تھی۔ منہ اندھیرے کوہ پیا ہرف پر اسے کھڑے مارتے ہوئے آٹھ کلو میٹر کا سفر شروع کر دیا جس کی بلندیوں تک جانے کو ان کی رو میں پہاڑ تھیں۔ وہ آٹھ کلو میٹر جو دوسری دنیا میں گاڑی کی منٹ میں طے ہو جاتے تھے پہاڑوں پر پہنچنے میں ہونٹے تھے۔ جستجو انسان کی فطرت ہے اور یہ انسان کو ان آٹھ کلو میٹر کا سفر کرنے پر اکساتی ہے۔ وہ اسی طرح پتھر پر بیٹھی کتنی ہی دیر سوچی رہی۔ وہ سیف جیسے شخص کے ساتھ رہ سکتی تھی یا نہیں ایک اسناک ایچینج تھا؟ جس کے دل کی جگہ میں کینکریٹر نصب تھا۔ بغاوت پرست کی سرکھ میں نہیں تھی مگر صرف ایک دفعہ سیف کے سامنے اسے تمام غفلت مایا کے سامنے کھڑے کی ضرورت تھی۔ کو آتی تھی۔ اسے کتنی ہی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہی سب کی پنی اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ بدل رہی تھی۔ پہاڑ اسے تبدیل کر رہے تھے۔ خود کشی نہیں کرنا چاہتی تھی سو سیف سے ملتی تھی۔ کتنے کا قہر اس نے کر لیا تھا۔ وہ انجینئر کے سرے مل کر کے ان کو سلجھانے میں لگی تھی۔ اور اپنی جس کی طرف سے اسے پہلے بے نیکی تھی اب ملل نہیں تو کسی حد تک اطمینان تھا۔ ہر آنے کہلاتے کھاتے سے ذرا عواذ کیا تھا۔ ”میں عیش و عشرت سے اور پرستش سے مراد اسرار ہر اس ہونا۔“ وہ ایک فقیر اس کے اوپر نرم پھوار برسائے لگا کتھان اپنا بیت اور محبت تھی اس ایک فقیر سے۔ ہاں ایک بے نیکی بھی تھی۔ کہ وہ براہ راست ان کی کیوں نہیں کر آتا تھا۔ تین لفظ کیوں نہیں کہہ سکتا تھا شاید کبھی اس نے حناوے کو یہ بات کہی ہو یا نہیں کی محبت کی شادی تھی بھی یا۔ یہ بات وہ اپنی نہیں پوچھ سکتی تھی پھر۔

اسے ایک دم ایک خیال آیا۔ اس نے جھٹکا پاکٹ سے ٹرانسیور نکالا۔ اس کا میکزم بس دو ٹرنک تھا۔ اس نے ٹرانسمیٹ مین دیا۔ تھوڑی دیر

است لائن پر تھا۔

”گڈ آفٹر نوون فرام بیس کیمپ ڈاکٹر! کیسی ہو؟“

است اس کی آواز سن کر خوش ہوا تھا۔

”کیمپ وان کے باہر ہرف پر بیٹھی ہوں۔ باقی سب ڈالٹھ لکھیں کرتے گئے ہیں۔ میں نے چاول بنائے ہیں۔ تم سناؤ بیس کیمپ کیسا ہے؟“

”تمہیں یاد کر رہا ہے اور خلاصا اس ہے۔ سب لکچرز اور پورٹرز سوائے شفا کی کے جا چکے ہیں۔ میں پورہ رہا تھا۔ اچھا کیا کل کر لیا۔ تمہاری ای میلز آئی ہوئی ہیں۔ تم نے اپنا ای میل اور پاس ورڈ میرے پورہ میل پر محفوظ کر دیا تھا۔ مگر تم نے لوہیں نے کوئی ای میل نہیں کھولی۔“

”لوہ کروچیک اور میری طرف سے جواب لکھ لو۔ اسے ای میل کے جواب لکھوانے لگی۔ پھر قدرے سوچ کر بولی۔ ”احمت! ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں پوچھو ڈاکٹر تمہاری بیماری۔“

”لوہو۔“

”تو میں تم سے میڈیکل کے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ میں کیمپ میں پوچھنا چاہ رہی تھی۔ مگر قدرے خوف سے بولی۔ ”تمہیں حناوے یاد ہے؟“

”اپنی کی بیوی حناوے۔“

”اچھا میں سمجھا تم ”حوا“ کی بات کر رہی ہو۔ حضرت حوا کی جن کو انگلش میں Eve اور ترک میں حناوے کہتے ہیں۔“

پیشے کا دل سر پیٹ لینے کو چاہا۔ اپنا نہیں ”احمت کا۔“

”ہاں وہی تمہیں یاد ہے کیسی تھی وہ؟“

”خوب صورت تھی۔“

”اور۔۔۔؟“

”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

پیشے سٹیپ ہوئی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

”وہ یونہی اپنی اس کو یاد کر کے اداس ہو جاتا ہے نا۔“

”یہ تم سے کس نے کہا؟“

”احمت کے بچے میں حیرت تھی۔“

”اپنی نے۔“

”وہ اپنی کر رہا ہو گا۔ وہ تو اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”مگر کیوں؟“ اسے کرید ہوئی۔

”ات کسی اور سے محبت تھی۔“

پیشے کا دل ڈوب کر ابھرا کس سے؟

”کیا واقعی فراقم اور ہالیہ کے پہاڑوں پہ پریاں اترتی ہیں؟“

اپنی کو جانے کتنے برسوں سے ان پریوں کی تلاش تھی۔ وہ کے نو کے روپل فیس کی بیس کیمپ کا ٹریک بہت بار کیا کرتا تھا۔

”کے نو کا نہیں نا ڈاکٹر بت کاروبل فیس ہو گا۔“

اس نے بمشکل اسٹوپڈ۔ ”کہنے سے خود کو روکا۔“

”ہاں وہی وہاں ہمال کیمپ میں فیوری میڈوز کے درمیان اس نے من رکھا تھا کہ پریاں اترتی ہیں اور رات کو سیاہوں کے پاس آکر انہیں گیت سناتی ہیں۔ وہ ہر دفعہ پاکستان آنے پر روپل فیس کا ٹریک ضرور کرتا تھا۔ حالانکہ میں نے کہا بھی تھا کہ اسٹوپڈ آدمی یہ پریاں دیکھو کچھ نہیں ہوتیں۔ ایویں سیاہوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ مگر اپنی اور جینک تو پاگل ہیں۔ اپنی پریوں کو ڈھونڈنے پر گرما میں پہاڑوں میں نکل جاتا تھا اور اپنی جینک کے بغیر کہیں جائے یہ تو ہو نہیں سکتا۔“

”پھر اب جینک کیوں نہیں آیا؟“

”اس کو Tumaa کے پاس نے کالم میں پھنسا رکھا ہے جینک برا غیبت آدمی ہے کہہ رہا تھا احمت دعا کرو کہیں زلزلہ طوفان یا سیلاب آجائے میں ریلیف ایکشنی کے بہانے ہی انقرہ سے لکھوں۔“

”احمت نور

سے ہوا۔

”اور وہ حنا رہے۔ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو اب اس کے بارے میں اتنا حساس کیوں ہے؟“

اس کے ذہن کی سوئی دوپٹے میں تھی۔ ”اس کی بیوی بھی نہ تھی جیسی بھی تھی، مرے ہوں کو کچھ نہیں کما کرتے۔ ویسے بڑی عجیب سا ٹیکو کیس بھی۔ بہت سبک اپ کرتی تھی۔ سلٹی کتنی تھی“ افق نے لگتا ہے کسی پیمٹری سے شادی کی ہے۔

”اچھا۔“ کچھ سوچتے ہوئے اس نے ریڈیو کو دیکھا پھر الوداعی کلمات کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور اہمت کی باتوں پر اذ سر لو غور کرنے لگی۔

اس کے سامنے آسمان پر سرخ و سرمئی بادلوں کے درمیان خالی جگہوں سے ڈھلتے سورج کی آخری نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔ دور ناگاپربت کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور وہ پادل اب یقیناً ”قراقرم کی جانب بڑھنے لگے تھے۔“

”خدا کرے یہ ہمیں بالی پاس کر کے گزر جائیں اور موسم نہ خراب ہو۔“ وہ دعا کرتے ہوئے اور یو پور پہاڑ پر بار بار نگاہیں دوڑاتی ان تینوں کا انتظار کر رہی تھی۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ درجہ حرارت گرا رہا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو اسے جھکے جھکے قدموں کی آہٹ اور باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ تینوں آگے پیچھے برف پر چلتے اس کی جانب آ رہے تھے۔ افق کے کانپھٹے پر رستیوں کا آخری گچھا اور ہاتھ میں اسٹواٹک تھی۔ ”کہہ رہے گئے تھے؟ اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔“ اس کے غصے کے جواب میں وہ تھکن زدہ سا مسکرا دیا۔

”اچھی لگ رہی ہو اتنی فکر کرتے ہوئے۔ اور بھی اچھی لگو گی اگر جلدی کھانا کھا دو تو۔“ وہ اس کے پاس سے گزر کر خیمے میں چلا گیا۔ ارسہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں خامسے تھک چکے تھے۔

”میں نے بریائی پکائی ہے۔“ ان کے پاس اندر آکر اس نے ویسے دہے جوش سے بتایا۔

”لا میں آپ کی ہلپ کرواؤں۔“ ارسہ اس کے ساتھ کھانا نکالتے گئی۔ پریشے نے بریائی والا برتن کھانا افق نے جھک کر چادروں کی شکل دیکھی اور ایک پکائی چپ سا ہو گیا۔

”چلو ذائقہ اچھا ہو گا۔“ افق کا مطلب تھا کہ ”اچھی نہیں ہے۔“

”میری بریائی اور کلنگ پوری فیملی میں مشہور ہے۔“ شام سے پوچھ لو۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہمارے ہاں یہ اعزاز اہمت کی بیوی ملنے پر حاصل ہے۔“ افق نے بریائی اپنے برتن میں نکال کر پھل چھینے میں ڈالا پھر اسے چا کر کھانے کے بعد مرغی کی آٹا توڑنے کی کوشش کی جو ٹھیک سے نکل نہیں رہی تھی۔ کچھ سردی کا اثر بھی تھا۔ اس نے کھانا توڑ کر کھانے لگا۔ اور کسی جیو ٹیم کی طرح چھپا۔ ارسہ سے بھی نہیں بولی نہیں چپائی جا رہی تھی۔ پریشے نے غور و غور دونوں کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں پتا ہے پری اتر کی یورپ میں ہے۔“

”اور میں بھی یورپ سے آئی ہوں۔“ ارسہ نے پتہ نہ دیا۔

”مطلب؟“ پریشے نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ یورپ سے آئے ہیں“ افریقہ سے نہیں لیا۔“ ارسہ نے جواب دیا۔

”افق بھائی کا مطلب ہے کہ۔“ پچھلی بڑی ہے؟“ ارسہ نے اس کے چہرے کو دیکھ کر بوکھا کر وضاحت کی۔

”ہاں بڑی ہے، تمہارے پیچھے سیرینہ ہوٹل کے شیٹ وے کر گئے تھے نا۔“ وہ اپنے جیسے کی بریائی لے کر وہاں سے چلی آئی تھی۔ مطلب تھا کہ ”خود پکا لو مچھلی۔“

گوشت کھا جاتا۔“ اسے سچ سچ رونا آیا تھا۔ ”ٹھیک ہے، سالے تیز ہلکے اچھے خامے تیز اور گوشت ٹھیک ہے کھانا تھا، مگر چپ کر کے کھاتے رہتے میرا دل کتنے کو۔ اتنی اسٹریٹ فارورڈ ٹیس کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی پورٹر تو نہیں ہوں جو کھانے پکائوں۔ ایک ہے اب نہیں پکائوں گی۔“

رات وہ اپنے خیمے سے باہر اسی پتھر پر بیٹھی اپنے گرد کے نیچے گرہ چڑھ کر برف پر لکیریں سی بنا رہی تھی۔ گردن اس نے اٹھا رکھی تھی اور نگاہیں اوپر ستاروں کے چاند پر تھیں جس کی چاندنی سے بد گنا گلیشٹو چمک اٹھا تھا۔ راکا پوٹھی پر چاند خاصا بڑا اور واضح دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے بھی دھند سے ڈھکی اس سیرینہ کی سے عشق ہو گیا تھا اور وہ اس کو دیکھنے بہت تر آیا تھا۔

”اے اے“ اس نے افق کو اپنے خیمے سے نکلتے دیکھا تو حیرت سے اس کے منہ سے سوال نکلا۔ چند لمحوں کے بعد اسے کسی کے اپنے ساتھ پتھر پر بیٹھنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔

”اے اے“ اچھے جھوٹے لگ رہی ہے۔ بریائی پڑی ہے۔“

”خدا کرے۔“ ارسہ نے جواب دیا۔

”یقیناً کر رہی ہو بریائی۔“ ارسہ نے جواب دیا۔

”اچھا پلیر! دیکھو ناراض تو مت ہو۔ میں نے تو طرف کی ہے۔“

پریشے نے گردن گھما کر قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”نہیں، تم تو افریقہ سے نہیں آئے“ اور تم تو کچا گوشت نہیں کھاتے۔“

”اب کچے گوشت کو میں پکا گوشت کہنے سے تو

رہا۔“

”ہاں خود تو اوپر چلے گئے تھے۔ میں نے سارا دن اتنی محنت سے بریائی تیار کی اور پھر اتنی دیر تمہارا اتنی پریشانی سے انتظار کیا۔ اور تم؟“

”کاش قراقرم کی پری۔ تم نے اتنی دیر گوشت کھانے پر لگائی ہوئی تھی۔“

”افق۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اچھا پلیر رونا مت۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ دیکھو تمہارے لیے اتنا گرم سیلینک بیک چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”تو نہ آتے۔“

”کیوں نہ آتا؟ مجھے پتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔ میں تمہارے لیے خود پکا کر مچھلی لایا ہوں۔“ افق نے چمک اسے تھمایا۔ پریشے نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہیں کیسے پتا میں نے بریائی نہیں کھائی؟“

”لو۔ کوئی کھانے والی چیز تھی؟“ وہ ہنسا۔

پریشے نے روٹا سی ہو کر وہ چمک اذہر سے اس کے کندھے پر مارا۔

”ویسے پری! شام کہہ رہی تھی تم سیف سے منگنی سے انکار نہیں کر سکتیں۔ تم وہاں جا کر ایک کام کرنا۔ سیف کو اپنی بنائی گئی بریائی کھا دینا۔ وہ خرواہی رشتہ توڑ جائے گا“ لکھ کر رکھ لو۔“ وہ ہنسنے جا رہا تھا۔

”میری بریائی کے بارے میں تم نے ایک لفظ اور کہا تو میں تمہیں یہاں سے دھکا دے دوں گی۔ اور رہا منگنی کا سوال تو وہ میں ویسے ہی ختم کروں گی۔“

وہ ہنسنے ہنسنے رگ گیا اور خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہ کیوں؟“

”مجھے نام کر دینے پر پوز کیا ہے اس لیے۔“ وہ جل کر بولی۔

وہ پھر سے ہنس دیا۔ ”ہاں“ اچھا آری ہے کر لو شادی۔“

”ہاں، تمہیں قتل کر کے اس سے ہی شادی کروں گی۔“ وہ غصے سے کہہ کر تیزی سے اپنے خیمے میں چلی گئی۔

کردار کو دکھا جو جانے اس کی قسمت میں لکھا بھی تھا یا نہیں۔

”یہاں سے جا کر تمہیں یقین ہے ہم یہاں سے زندہ واپس جائیں گے؟“ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر لبوں سے یہی پھسل پڑا۔

افتق نے شانے اچکا دیے۔ ”راکا پوشی بہت خوبصورت ہے اور جو خوبصورت ہوتے ہیں ان سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں ہوتا۔“

”مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ اب اب زندہ رہنے کو مل کر رہا ہے افتق! زندگی اب بہت حسین لگتی ہے۔“ وہ کہیں کھوسی گئی۔ افتق اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

”تم فکر کیوں کرتی ہو پری! تم اپنی نہیں ہو میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“

پری نے ممتون نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”میں تمہیں پہلے تک تمہیں جانتی بھی نہیں تھی اور یوں لگتا ہے کہ جیسے تم سے پہلے کراہنا اور کوئی نہیں ہے۔ جانے کیوں اب یقین سنا ہے کہ اگر میں گری تو تم مجھے ختام لو گے۔“

افتق نے بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اور اگر میں گرا تو؟ تو تم بھی منارے کی طرح مجھے چھوڑ جاؤ گی؟“

وہ شانے میں رہ گئی۔ وہ اس بل اتنا اجنبی اور سرد مہر لگا تھا کہ وہ چند لمحوں تک تو کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔ پھر افتق اس کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے خیمے سے نکل گیا، مگر وہ اسی طرح اسی جگہ کو دیکھتی رہی جہاں تصویر پر قبل وہ بیٹھا تھا۔

کھڑکی پر برف ابھی تک گر رہی تھی۔

14 اگست 2005ء

پریش نے آہستگی سے خیمے کا پردہ سرکایا اور اندر بھاٹکا۔ وہ اپنے سیلنگ بیگ میں سو رہا تھا۔ وہ دیے قدموں اندر آگئی۔ خیمے کے فرش پر اس کے قدموں

سے آہٹ ہوئی مگر وہ بے سدھ سوتا رہا۔

رات ارسہ نے اسے بتایا تھا کہ افتق نے صبح وہاں اٹھانے کی تاکید کی تھی۔ پریشے روپے کا الارم لگا کر اٹھ گئی تھی۔ غنیمت بھٹکل ہی آئی تھی۔ ساری رات اس کی کھانسی سننے گزری تھی۔ اب وہ بجتے میں دس منٹ پہلے ہی وہ اسے جگائے آئی تھی مگر وہ سوتے ہوئے اسے اچھا لگ رہا تھا کہ وہ خاموشی سے اس کے سرہانے دوڑا تو بیٹھ گئی۔ ”راکا پوشی 2005ء“ کی گرت ٹوٹی تے اس کے بھورے بالوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اب اس کی ٹیل ٹوٹی ب اور گان والی کیپ اسے نظر نہیں آئی تھی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی اس میں اس کی ٹیٹھ میں غلغل ڈالنے کی کوشش نہیں تھی، سو اسے بیدار کیے بغیر خاموشی سے اس کے خیمے میں آئی۔

باہر آسمان سیاہ مگر صاف تھا۔ برف باری کھیل رہی تھی۔ رک چکی تھی۔ خیمے کے گور ٹیکس پر چند ان برف جمی تھی۔ دور سیاہ آسمان پر تھوڑا سا بھلاسا تے مارے پھرے تھے جو ایک صاف اور کھلے کھلے دن کی پیشکش تھی۔ یہ تھا ہمالیہ کا آسمان بل بل کر بدلتا تھا۔

اپنے خیمے میں آکر وہ افتق کی جگہ خود ناشتہ بنانے لگی۔ یوں لگتا تھا اس گہرے اندھیرے میں وہ کھری کی تیاری کر رہی ہو اور وہ مضافات کے رہنے والا ہو۔

دور پر پہاڑوں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ان کی طرف دیکھا۔ وہ جلالت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور پو پھل سی تھیں۔

”مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟“ اس کے قریب آگئے

ہوئے افتق نے ماہ جس اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پریش نے بغور اسے دیکھا۔ اب وہ شناسا لگ رہا تھا۔ (کسی کبھی اتنے اجنبی کیوں ہو جاتے ہو افتق؟ کیوں اس کو بھلا نہیں دیتے؟ کیوں وہ ہر بل میرے اور تمہارے درمیان کسی دیوار کی طرح آجاتی ہے؟ کیوں وہ اب میں آکر بھی ستاتی ہے حالانکہ وہ تو تمہارے خوابوں میں بھی نہیں تھی۔) اسے افتق سے چھٹی لگ

کے متعلق کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اس سے کبھی یہ بات نہیں پوچھے گی۔ ایک دن افتق خود بتائے گا۔

وہ اب چوہے کی گیس کھول کر بڑی لاہروائی سے تیلی جلا کر چوہے میں جھونک رہا تھا۔ آگ تیزی سے بجھ چکی تھی۔

”اتنی بے احتیاطی سے کیوں چولہا جلا رہے ہو؟“

اس کی بے احتیاطی دیکھ کر پریشے کو ٹوٹنا ہی پڑا۔

”چوہے کو چھوڑو۔ رسیوں کی فکر کرو۔ خدا کرے وہ برف میں دب کر گم نہ ہو گئی ہوں۔“

رسیوں کی خبر ہو گئی۔ ان پر برف گری ضرور تھی مگر وہ جلد ہی نکل آئیں۔ رات کے اس پھر راکا پوشی بہت خاموش تھا۔ وہ آگے پیچھے فکسڈ روپ کی طرف

دب رہے تھے۔ پریشے اپنے جو گرز کو دیکھ رہی تھی۔ یہی وہ ان کا تمام برف پر رکھتی برف کی تہہ ایک انچ دب جاتی۔ ایک لمحے کو اس کا سانس رک جاتا مگر یہ احساس کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین ہے اور وہ کسی

”مگر یہ“ کے لیے نہیں گھڑی بہت فرحت بخش ہوتا تھا۔

اوپر برف اور نیچے زمین کی جگہ دراڑیں بن گئی ہیں جو اس کی فٹ گھسی ہوئی ہیں۔ بعض جگہوں پر اس کے ہاتھوں پر عموماً؟

ان کے ہاتھ پر برف جاتی ہے۔ یہ کچھ چننا ہے۔ برف کی تہہ پر یہ برف جاتی ہے۔ برف کے نقاب پر پاؤں بڑنے کی صورت میں برف فوراً پگھلتی ہے اور کچھ

نیچا اندر گر جاتا ہے۔ ان دراڑوں کا کالاف یا گریوس سے عموماً لاشیں بھی نہیں نکالی جاسکتیں۔

اس وقت بھی فکسڈ روپ پر خود کو ”ہومر“ (ایک ایلی مینیم کا بیٹا) آلہ جس کو فکسڈ روپ اور گمر کے گرد بند لگی کلائنگ ہارنس سے باندھا جاتا ہے۔) کی مدد سے رسی پر کھپ آن کرتے وقت اسے اس

پاس سرخ برف میں ہلکی ہلکی آکریز سے واضح ہوتے گریوس نظر آرہے تھے۔ وہ جو مرکب اوپر چڑھاتے ہوئے

اس روز ساری چڑھائی میں گنگنا تی رہی تھی۔ ”تو بچو! سیر گراؤں تم کو پاکستان کی جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی پاکستان زندہ باد۔“

افتق نے مطلب پوچھا تو اس نے کندھے اچکا کر کہہ دیا۔ ”آج ہمارا انٹرنیشنل ڈے ہے۔ میں اس منارہی ہوں۔ اس لیے تم اپنا منہ بند رکھو۔“ وہ پانے والے انداز میں مسکرایا۔

”ٹھیک ہے مگر اب تو سنا ہے بھارت سے دوستی ہو رہی ہے۔ امن معاہدے کیے جا رہے ہیں۔“

”سناہوں سے امن معاہدے نہیں کیے جاتے۔“ اس کی جب الوطنی ابھی خاصی جاگ اٹھی تھی۔ کیپ ٹوٹک وہ نظریہ پاکستان کے متعلق اس طرح کے

کئی ارشادات سنائی آئی۔ آج چڑھائی خاصی مشکل اور بے حد vertical تھی۔ برف کی کنڈیشن خراب تھی۔ وہ بے حد نرم اور پکڑنے پر پکھلتے اور پکھلتے لگتی تھی۔

کیپ ٹو پر برف کھود کر خیمے نصب کرنے کا سارا کام فرید اور افتق نے کیا تھا۔ پریشے نے خیمے لگ جانے کے بعد ان تمام کے اندر چند جھڑیاں لگائی تھیں۔ جو وہ

اسلام آباد سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ تو بڑا جھنڈا بھی لگانا چاہتی تھی مگر شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ اس چیز کی آگئی تھی۔ گرم گور ٹیکس کے ہیٹ لائنوز نے

خیموں کے اندر روٹی ماحول کو خاصا وارم رکھا ہوا تھا اس کے باوجود وہ چیز جاتی رہی ہو اتنی سرد تھی کہ خون ٹھمدہ ہونے لگا تھا۔ اوپر ویسے بھی آسکتی بے حد کم

تھی۔ کیپ ٹو تقریباً 6200 میٹر نصب تھا اور اس بلندی اور موسم میں وہ باہر جا کر بڑا جھنڈا لگانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔ سو رات کا کھانا کھانے

بغیر بس چاہئے پی کر سو گئی۔ اس لاشی ٹیوڈ پرویسے بھی بھوک مر جاتی ہے۔

15 اگست 2005ء

وہ دونوں لاؤنج میں آنے سے بیٹھے تھے۔ سیف

کچھ دیر خاموش رہا پھر بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا۔
 ”میری! میں جانتا ہوں تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا مگر
 میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دوست کی
 بہن کو پسند کرتا ہوں اور یہ منگنی میں نے اپنی ماں کی
 خواہش پر کی تھی۔ اب بہت ہو چکا میں یہ منگنی توڑنا
 چاہتا ہوں۔ تم تباہی مچا کر رہی ہو؟“
 اور وہ کیا کہتی؟ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا
 تھا۔

”تباہی! میں ناموں سے بات کروں؟“ وہ اس
 کے جواب کا انتظار تھا۔ ریشے کی آنکھیں چمک پڑیں۔
 ”سیف تم پلیز یہ منگنی توڑ دو۔ تمہارا مجھ پر بہت برا
 احسان ہو گا۔“ وہ کہنا چاہتی تھی مگر جانے کیوں حلق
 سے آواز نہیں نکال رہی تھی۔
 ”تھو بھی جائیں میری آئی! کب تک سوئی رہیں
 گی؟“ کسی نے اسے جھنجھوڑا۔ وہ ہڑپڑا کر اٹھ بیٹھی اور
 ارد گرد دیکھا۔

اس کا لاونچ اور سیف سب کچھ ہوا میں تحلیل
 ہو گیا تھا۔ وہ ان سے ہزاروں میل دور راکا پوشی کے
 ہریلے میدان میں نصب ایک خیمے کے اندر لیٹی تھی۔
 ”خدا یا!“ اس نے اپنی کپٹی سہلائی۔ خواہشات
 اب خواب بن کر مٹانے لگی تھیں۔

پھر وہ خاموشی سے تیار ہونے لگی۔ تیار ہو کر اس
 نے ناشتہ کیا اور پھر آخر میں اپنے بونص کے نیچے
 کرہ پنز چڑھائے اور گلہ نشو کا گلز لگائیں۔ ارسہ
 قریب ہی کٹھنیوں کا پلندہ اپنے رک سیک میں
 ٹھونسنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”میرے بیک میں رسی ہے۔ اس لیے یہ پورے
 نہیں آ رہے۔ آپ یہ اپنے والے میں ڈال لیں۔“
 اس نے ارسہ کے ہاتھ سے کٹھنڈے لیے۔ سلمان
 سیٹ کر کھڑی ہوئی تو گود سے ٹرانسیور کی دو بیٹریاں
 گریں۔ وہ انہیں منگنی میں دوپچے باہر نکل آئی۔
 آسمان ابھی تک سیاہ تھا۔ رات تمام نہیں ہوئی
 تھی۔ پچھلی پوری شام سونے کے باعث وہ خاصی
 فریش تھی آسمان بھی صاف اور تارے دور دور تک

جھگڑا رہے تھے۔ آج بھی یقیناً ”ایک صاف دن“
 تھا۔
 خیمے کے باہر برف پراقت اور فرید تیار کھڑے تھے۔
 بس اتنی جھک کر جوتوں کے نیچے بند کر رہا تھا۔ وہ اس
 کے عقب میں آئی اور اس کی پشت پر بندھے رک
 سیک کے ایک خانے میں دونوں بیٹریاں ڈال کر وہ
 بند کر دی۔ صرف بیٹری پرکھنے کو اس میں دوبارہ اپنا
 بیک کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔

”جناب! ایک بات کہوں؟“ سر پر ٹوپی درست
 کرتے ہوئے فرید نے اتنی کو مخاطب کیا۔ ”جناب
 میری بات مانو تو آگے نہ جاؤ۔ یہ شمال مغربی رخ آن
 تک کوئی سر نہیں کر سکا۔“
 ”فرید! سلمان کر لے گا۔ تم تو مست کر گئے ہو؟“ اس
 نے لا پرواہی سے شانے اپکا۔ ”پریشے نے چوڑے کر
 لے دیے۔ دیکھا وہ صاف سے یہ خود اعتماد اور ہٹ دم

”جناب موسم خراب ہو جائے گا۔“
 ”آسمان تو صاف ہے۔“

”جناب وہ شمال میں ستاروں کا جھنڈو کھڑے ہوئے
 یہ ستارے اس کے بھی اس مہینے میں دھلی کے آسمان
 پر نہیں دیکھے یہ اچھی پیش گوئی نہیں کرتے۔ آپ
 دھلی کو ہم پنڈو کٹرے زیادہ نہیں جانتے۔“

”ہمارے پاس اتنا فیول اور گیس نہیں ہے کہ ہم پنڈو
 کر لیں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 سیدھا ہو لیا۔ فرید ہی چپ ہو گیا۔

وہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔
 اچانک اس کے سر کے پیچھے کوئی ٹوکدار چیز زور سے
 لگی وہ گھبرا کر پلٹی تین پانچ کوکے۔ (raven)
 نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے زور سے سر ہاتھ
 مارا۔ وہ اڑ گئے۔ اس نے ان کو دیکھتے ہوئے سر کا ہچکا
 حصہ سہلایا جہاں انہوں نے جو تھیں ماری تھیں۔

”کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟“ اتنی قدرے فکر مندی
 سے اس کے قریب آیا۔ وہ اسی طرح عجیب نگاہوں
 سے اس پر سیاہ آسمان پر اڑتے کوکوں کو دیکھتی رہی۔

”پریشے! کیا ہوا؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔
 ”چوکی پھر سر جھکا۔“ کچھ نہیں۔ یونہی کچھ یاد
 آتا تھا۔
 اس نے دوبارہ سر جھکا اور پھلانے کی کوشش کی جو
 آیا تھا۔ ٹھیک چھ سال پہلے جس دن اس کی ماما کی
 تدفین ہوئی تھی اس روز بھی یہی جگہ انک کے دوران اس
 یونہی کوکوں نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی ریون
 تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے
 لگی۔

ارسہ کلن پر فون لگائے بولتے ہوئے خیمے سے باہر
 گئی۔ ”جی جی یا کلن میں کیمپ تھری پہنچ کر پاپا سے
 بات کر لوں گی۔ جی شیور۔ اوکے ٹیک کیئر۔ لو لو مام۔“
 اس نے سیٹلائٹ فون بند کر کے پری کو
 یا اور خود سر پر ہیلٹ جوڑنے لگی۔ اس وقت
 پریشے والے گھر سے وہ بھی پاپا سے بات کر لے مگر اس
 کے پاس ان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے
 بیک میں رکھ دیا۔

”ہمیں جلد از جلد کیمپ تھری پہنچنا ہے۔ آج
 اس آکس نہیں ہو سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ ایسے
 مقامات پر جاکے پلوٹا پری نام کیا سوچ
 میں آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہیلٹ انڈ میں پکڑے کم
 کھڑے دیکھ کر وہ جانتے جانتے اس کے قدموں
 کی منڈیوں پر لگا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”فرید! کیا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”آسمان پر ستاروں
 کا جھنڈو اور یہ کوکوں کا حملہ یہ بری علامتیں ہیں۔“
 کیا ہیری پوٹر بہت پڑھنے لگی ہو؟ وہ مسکرایا۔

”اتنی میں سیریس ہوں۔ یہ ان کا نصب راج ہے۔
 کم کو دیکھو چند گھنٹوں تک برف باری شروع ہو گئی
 ہے۔“

”میں انقرہ سے پنڈو اس لیے نہیں آیا تھا کہ برف
 پڑے اور کریم کیمپ میں پھپھ جاؤں۔“
 ”پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میری چھٹی
 ہے یا کچھ اور میرا خیال ہے ہمیں آج سفر نہیں
 اچالہ ہے۔ آج کے دن کا آغاز ہی بد شکولی سے ہوا

ہے۔“ جانے کیوں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔
 وہ چند لمحے بے حد سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔
 پھر بولا۔

”بدھ مت کے بھکشو عیال آنے والے سیاحوں
 کے مشعل کہا کرتے تھے۔ سیاحوں کو جانے دو جہاں
 ان کا دل کرے مگر جوٹیاں نہیں کہ وہ بدھا کا مسکن
 ہوتی ہیں۔ بدھا کے چہرہ کار ایورسٹ کو
 (chomolungma) چومولنگما۔

یعنی Mother goddess of the world
 اور ”ساگر ماتا“ کہا کرتے تھے اور آج بھی
 یہی کہتے ہیں۔ چھ لسلوں پہلے کے شہزاد ساگر ماتا کی چوٹی
 پر قدم رکھنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیالات تب
 بدلے جب قہنہ نگ نے سرائے منڈیٹری کے ساتھ
 ایورسٹ سر کیا۔ یقین کرو اس وقت اتنی تو ہم پرست
 باتیں کرتی تھیں بدھ مت کی کسی مٹھ میں رہنے والی
 راجہ لگ رہی ہو۔“ اس کا انداز اتنا قطعی اور منطقی تھا
 کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ حالانکہ کہنا چاہتی تھی کہ
 مجھے تو ہم پرست کہو یا جو بھی میں اور آگے نہیں جانا
 چاہتی۔

”میری آئی! اگر ہم یہ راج سر لیں تو ہزار نام گنیز
 بک آف ورلڈ ریکارڈز میں لکھا جائے گا۔“
 ان دونوں نے کسی بات کی گنجائش نہیں بھروڑی
 تھی۔ اب اگر وہ ان کے ساتھ نہ چلتی تو وہ اسے اس کی
 پہلی شمار کرتے۔ وہ کسی ریکارڈ بک میں نام نہیں
 لکھوانا چاہتی تھی وہ ادھر راکا پوشی سیر کرنے بھی نہیں
 آئی تھی وہ تو خود تسخیر ہو کر اپنے فلاح کو لینے آئی تھی
 اور اس وقت جس طرح اس کا دل کسی ارسوی کے
 باعث گھبرا رہا تھا وہ بالکل بھی جانتا نہیں چاہتی تھی
 ٹمک ٹھہرا اس کی انا کے خلاف تھا۔

وہ ان کے آگے چل رہا تھا۔ اس کے قدموں سے
 پٹنے والے نشانات پر قدم رکھتی وہ سر جھکائے خاموشی
 سے اس کے پیچھے آرہی تھی۔ اس کا نفس تیز تیز چل
 رہا تھا اور قدموں کے نیچے موجود گلہ نشو کے اندر
 سے سلائڈنگ کی آوازیں بھولتی سنائی دے رہی

تھیں۔
اس کی مسلسل خاموشی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔
”ارے! تمہارے ناول کا نام کیا ہوگا؟ دی راکا پوشی
کلائمب؟ یا پھر ”راکا پوشی دی ان کلا ٹیڈ رن جیا پھر
ان ٹو تھن ام آف راکا پوشی۔“
وہ مشہور کتابوں کے نام بگاڑ رہا تھا۔ ارے ہنس
دی۔
”خیر میرے ناول کا نام خاصا مختلف ہے۔“
”کیا ہے؟“

”جب چھپ جائے تو ریڈ لیجے گا۔“ ارے اپنے
ناولز کے متعلق خاصی شرمیلی تھی۔
وہ ہنوز خاموشی سے جھک کر برف پر آٹس ایکس
مارتے ہوئے چل رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے پری
کی بات نہیں مانی سو اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو پوچھنے
لگا۔
”کھانسی ٹھیک ہے تمہاری؟ تم کل شام ٹیڈ میں
کھائیں رہی تھیں۔“
”ہاں۔ اب ٹھیک ہے۔“ وہ مختصر ”کہہ کر چپ
ہو گئی۔
”موسم صاف ہو تو راکا پوشی کی چوٹی سے میلوں
دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے نظر آتے ہیں۔“ وہ اپنے
تئیں سے Summit کرنے کی ترغیب دلا رہا
تھا۔

”اچھا۔“
”میں تو یہاں اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا
اور بلتور کی چوٹیاں دیکھنے ہی آیا ہوں۔“
وہ اسے کیا بتاتی کہ جس پہاڑ کے حسن کی وہ دیوانی
تھی، آج پہلی بار اسے اس سے خوف محسوس ہو رہا
تھا۔ (خدا کرے ”مید“ سوتا رہے اور اسے علم نہ ہو کہ
کوئی بے قدموں اس کی اقلیم میں داخل ہو رہا ہے۔)
وہ نیچے برف کو بغور دیکھتی احتیاط سے قدم رکھ رہی
تھی۔ برف کے ایک قطعے پر وہ پاؤں رکھتے ہی والی تھی
کہ ایک دم اس نے قدم چند فٹ آگے رکھتے ہوئے
اس ٹکڑے کو پھلانگا پھر مڑ کر بغور اس جگہ کو دیکھا۔

یونہی اسے شک سا ہوا تھا کہ اس کے اندر کچھ
تھا۔
”کیا ہوا؟“ وہ اس سے چند قدم آگے تھا
رکتے دیکھ کر خود بھی رک گیا۔
”کچھ نہیں۔ تم ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ سر جھکا
دوبارہ چلنے لگی۔ ہوا قدرے تیز ہو گئی تھی اور اٹلی
برف گرنے لگی تھی۔ اس نے ہیڈ لیمپ آن کر لیا
”راکا پوشی کی چوٹی سے کون کون سے پہاڑ نظر
آتے ہیں؟“
”بہت سے۔“
”مثلاً؟“

”مثلاً“ کے ٹوپا جھکوری۔“ جھکوری
زبان میں پہاڑوں کے بارشاد کو کہتے ہیں۔“
”اور مشرق اور گربوم کی چوٹیاں۔“
”اور؟“
”اور براڈ پیک اور کنکورڈیا کے دوسرے پہاڑ۔“
”اور؟“
”راکا پوشی سلسلے کے دوسرے پہاڑ ہر اموش اور
دہانی۔“
”اور ناگا پربت۔“
”اور؟“
”فکر نہیں کرو۔ تمہارا گھر نہیں نظر آتا۔“ اس کی
میں سے وہ بڑھ کر نکلا۔

وہ بد مزہ سی ہو گئی۔ ”ہر نام سڑے رہا کرو تم۔“
”اچھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے پلٹا پھر دستاویز
ہاتھ اس کی جانب بڑھایا جسے پریشے نے آگے بڑھا
تھام لیا۔ افق نے اس کا ہاتھ قدرے کھینچ کر اسے
قریب کیا۔ ”یہ اس لیے کہ اگر گریں تو اکٹھے کر لیں۔“
وہ اتنی شجیدگی سے بولا کہ پریشے کی ہنسی چھوٹ گئی۔
جستے جستے اس نے سر کو پیچھے جھینٹ دی۔ ”قریب“
میٹر کے فاصلے پر ارے آ رہی تھی۔ اس کا ہیڈ لیمپ
آف تھا۔ اس کے عقب میں فرید تھا۔ اس نے گہرا

اس موڑی سڑے اور افق ہاتھ تھامے چاندنی میں نہائے
افق کی بر قدم بڑھانے لگا۔
اسی اثناء میں اس کے عقب میں دھماکہ ہوا۔ وہ
میں گھبرا کر بیٹھے پیچھے میلوں دور تک چاندنی سے
آئی برف پھلتی تھی اور چند میٹر دور ایک لہسا سا گڑھا
دیکھتے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک لمحے میں کیا
ہوا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو۔

”اوہ میرے خدا۔“ ارے کریوس میں گر گئی
”وہ بوکھلا کر واپس بھاگی۔“
”ارے۔ ارے۔“ وہ دوڑتے ہوئے گڑھے کے
کے آگے آئی۔ گڑھے کے اندر گہرا اندھیرا تھا۔
”ارے۔ تم ٹھیک ہو؟“ گڑھے کے قریب دو زنانہ
گہرائی نے اندر جھانکا۔ وہاں صیب سناٹا اور تاریکی
ہوئی۔ ان کو اپنا دل ہوتا محسوس ہوا۔
افق بھاگتا ہوا اس تک آیا۔ فرید چند قدم دور تھا۔
”افق کچھ کہو۔ پلیز افق۔ وہ گر گئی ہے۔ اسے باہر
لاؤ۔“ افق کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے اس کے لیوں سے
بھاگنے لگا۔

”کرنا ہوں کچھ۔“ اس نے اپنی ہیلرٹ پر لگی
دھند سے گڑھے میں روشنی ڈالی۔ فرید بھی اندر
دھنسی کر کے آیا۔ وہ اس کے پاس دے
پڑے تھے۔ ”ارے۔ تم اور کون؟ ارے۔ اب دو۔“
”ایک۔“ فرید نے اپنے ہاتھ کی روشنی کریوس میں
ڈالنے پر اسے سڑا دیا۔ برف کے علاوہ کچھ نظر نہ
آتا تھا۔ پریشے کے جسم سے جان نکل رہی تھی۔ وہ
دوب کیوں نہیں دے رہی۔ وہ بولتی کیوں نہیں ہے؟
فرید اس سے بولنا نہ جا رہا ہو۔ وہ ٹھیک ہوگی۔ اسے کچھ
پیس ہوا ہو گا۔ ابھی افق اسے باہر نکال لائے گا۔ وہ خود
تسلیم دے رہی تھی مگر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

”ارے پلیز جواب دو۔ تم ٹھیک ہو؟“ وہ کتنی ہی دیر
سے آوازیں دیتا رہا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز پھٹ
ہی تھی ”مگر تاریک، عمیق کریوس بالکل خاموش تھا۔
اس کی گراہ کنزوری کھانسی زندگی کی کوئی رمت اس
کریوس میں نہیں تھی۔

برف گرنے لگی۔ ہوا کا زور زیادہ ہو گیا۔ افق اور
فرید جھک کر ارے کو آوازیں دیتے رہے۔ دونوں کے
ہیلرٹ اور چروں پر برف کے ذرات لگے تھے مگر
کریوس سے کوئی جواب نہ آیا۔ پریشے کا دل ڈوب رہا
تھا۔

”افق کچھ کرو پلیز۔“ اس کا جیسے سانس رک رہا
تھا۔ ارے کتنی دیر سے اس عمیق کریوس میں منوں
برف تلے دبی ہوگی اس کا سانس بھی ایسے ہی بند ہو رہا
ہو گا۔ اس تصور سے ہی اس کی روح تک کلب گئی۔
افق اور فرید تھک ہار کر خاموشی سے گڑھے کے
کنارے بیٹھ گئے۔ ان کی خاموش صورتیں پریشے کو
ہولنا رہی تھیں۔

”تم دونوں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ اسے نکالنے کیوں
نہیں ہو؟ افق جواب دو میں تم سے کچھ پوچھ رہی
ہوں۔“ اس نے اس کا کندھا زور سے ہلایا۔
افق نے سر اٹھایا۔ گلیشیر کا گلزار مار چکا تھا۔
بے حد سرخ ناک و آنکھیں چھوٹی چھوٹی بڑھی شیو میں
پھنسے برف کے ذرات اس نے دھیرے سے نفی
میں گردن ہلائی۔ ”میرا نہیں خیال۔ اب کوئی امید
ہے۔ اب تک مر چکی ہوگی۔“
”کرنٹ کھا کر پریشے نے اس کے کندھے سے ہاتھ
ہٹایا۔

”نہیں۔ تم۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہ کیسے؟“
نہیں۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
”تم۔ تم دیکھو تو سہی افق! وہ اندر ہی ہوگی۔ اس کا
سانس گھٹ رہا ہو گا۔ وہ مدد کے لیے ہکا رہی ہوگی۔
ہواؤں کے شور سے اس کی آواز یہاں تک نہیں پہنچ
رہی ہوگی۔ تم۔ تم دیکھو تو سہی۔“ کسی موہوم امید
کے تحت اس نے کہا۔

”وہ نہیں ہے پریشے۔“ کسی جھٹکے ہارے شکست
خورہ سپاہی کی مانند اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”وہ
ہوئی تو جواب دیتی۔ اوہ خدا یا۔“ وہ سر دونوں ہاتھوں
میں لیے خود بھی بے یقین سا تھا۔
پریشے نے استعجاب اور خوف سے نفی میں گردن کو

چندین روز

”نہیں افق۔ تم۔“ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔
 افق کیا کہہ رہا تھا؟ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا
 ذہن ماؤنٹ ہوڈ کا تھا۔ بھلا اسے کیسے مر سکتی تھی؟
 ”اچھی تو وہ تمہارے ساتھ چل رہی تھی۔“
 بالکل ابھی میں نے اسے برف پر کھڑے دیکھا تھا۔ وہ
 بالکل ٹھیک تھی۔ تم۔ تم ایسے کیوں؟ وہ۔
 نہیں۔“ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ چاندنی میں نہائی
 ہراموش اور دوبانی کی چوٹیاں اسے گھومتی دکھائی دے
 رہی تھیں۔ اسے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ سب
 کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

پھر اس نے افق کو اٹھتے دیکھا۔ فرید اسے متع کر رہا تھا، مگر وہ پھر بھی اپنی بارش کے گرد کچھ باندھ کر اس گہرے کریوس میں جا رہا تھا۔ رستی کا ایک سوا فرید کے ہاتھ میں تھا وہ آہستہ آہستہ رستی چھوڑ رہا تھا۔ شاید رستی کہیں سے اہنکو بھی کر رکھی تھی سو اب نیچے اتر چکا تھا۔

”پانچ میٹر کھودا ہے۔ وہ نہیں ہے۔“ گڑھے میں سے آواز آئی۔ وہ آواز اسے بہت اجنبی لگی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر مضبوط ہو چکا تھا۔

بھلا ارسہ کیسے مر سکتی تھی؟ ابھی ایک منٹ پہلے تو اس نے ارسہ کو اپنے عقب میں آتے دیکھا تھا۔ بس ایک لمحے میں اس کا پاؤں کرپوس کے اوپر برف کی تہ پر پڑا گلیشیئر پھٹا۔ وہ پیچھے گزری ہزاروں من برف اس کے اوپر گر گئی جلی گئی اس کا سانس رگ گیا اور وہ دم گھٹنے سے زندہ برف میں دفن ہونے سے مر گئی۔ بس ایک لمحے کا عمل تھا اس کے دل کے اندر کہیں بہت زور سے درد ہوا تھا۔ درد کی شدت بڑھی تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان مسلسل برف کے ننھے ننھے گالے برس رہا تھا۔

چوٹی اس جگہ سے نظر نہیں آتی تھی، مگر یقیناً وہ بادلوں کے بالے میں چمک رہی ہوگی۔ رات کے اس پیر "برو" جاگ اٹھا تھا اور اسے علم ہو چکا تھا کہ کوئی وسیع قندروں اس کی راجدھانی میں داخل ہو رہا تھا۔

افق واپس آچکا تھا۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے
 ہوئے وہ سروی میں نقشہ رہا تھا، تیز تیز سانسوں کے
 درمیان وہ سمجھ کہہ بھی رہا تھا۔

”تم۔۔۔ تم افق!“ وہ ٹٹکے سے کھڑی ہوئی اور اس کی جیکٹ کا کالر زور سے پکڑ کر کھینچا۔ ”میں نے کہا تھا تم سے کہ واپس چلے ہیں مگر تم نہیں مانے۔ تمہیں اوپر جانا تھا ہر قیمت پر اور اب وہ مرگئی افق۔ ارے مرگئی۔ اگر تم نے Summit؟ بتالیا تم نے ورلڈ ریکارڈ کیا؟ بولفس بالکل ابھی تو اس نے اپنی بات سے بات کی تھی۔ باپ سے اس نے کمپ تھری جا کر بات کرنی تھی۔ اس کا باپ اس کی بکلا کا انتظار کر رہا ہو گا۔ اسے نکالو افق اسے باہر نکالو۔ میں اللہ کا واسطہ تھا! اس کا باپ اس کی بات کا انتظار کر رہا ہو گا۔ اس کا گریبان پکڑ کر بھڑکتے ہوئے غم و غصے سے اس پر آواز دے گا اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر بد دی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اتنا بھی نہیں کہا کہ ارے خود اوپر جانا چاہتی تھی۔

”وہ میری چھوٹی بہن تھی۔ اُنکی ٹیبلٹ“
 اُنکی زبان پر فوراً اس عالم پہاڑ نے اس پر
 چھین لیا؟“ وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی
 طرح ہلکے ہلکے کر رہی تھی۔ اُن نے اس کے
 شانوں کے گرد بازو رکھ کر ہلے سے اس کا سر تھکا۔

مگر وہ ریلیکس نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے ڈھل
 میں پہلی دفعہ ایک دوست کو اپنے سامنے براڈ میں
 ہونے دیکھا تھا۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔
 ان دونوں پر گر رہی تھی۔ فرید کچھ ہی دور خاموشی سے
 گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

”افق! اسے باہر نکالو! مجھے اس کو دیکھنا ہے۔ خدا کے لیے افق! ہم اوس کے ساتھ آئے تھے، ہمیں اس کے ساتھ ہی واپس جانا ہے۔“

”ریلیکس بری۔ اب کچھ نہیں جو سکتا ہے۔“
اس کی پاؤں لٹنے گیا تھا ابھی، مگر وہ کہیں بہت

ہے۔ ”وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر
نورین ایکسٹ نہیں تھا۔ اس کا اپنا الجھن ٹوٹا ہوا تھا، مگر
ہائے وہ کیسے ضبط کر رہا تھا۔

”نکمہ ان بیس یکمپ“ اپنے کندھے کے پیچھے ہاتھ بٹھا کر اس نے ریڈیو نکالا اور ٹرانسمیٹ مین دیا۔
 وہ سزا باز ابھی تک پریشے کے شانوں کے گرو تھا۔
 ریڈیو میں شور مچا سنا دیا پھر ترک میں کچھ
 اکٹھا ہٹ بھر کے الفاظ۔

”ہیری ہاٹ غور سے ستواحتہ! ارسہ بخاری از
ڈیڈ۔ میں دھرتا ہوں“ ارسہ بخاری از ڈیڈ۔ وہ ایک
کریوں میں گرنی ہے۔ اس کی ڈیڈ کنفرم ہے، مگر
ہائی ریکارڈ کرنا بہت مشکل ہے۔ اب ہمیں جلد از جلد
نکلیں۔ ہماری تاک جانا ہے۔ یہاں برف پڑ رہی ہے، اہم
اس میں سے لو کالی!“
”اس میں سے لو کالی!“

افنی بے ٹرانسپیرینڈنسی کے پیک میں رکھ دیا۔
 پر ایسے ابھی تک اسی طرح رو رہی تھی۔ اس نے اس کا
 اذیت بخشی۔ وہ پکڑ رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ بھرے
 گیس میں گم ہوئے کے۔ اس کی انگلی پکڑنا ہے۔
 خوف رہ گیا۔ افنی نے آہستگی سے اس کا سر

”شش۔ اب رہا میں۔ اب آپ تیرا کو
 شش۔ جس کو تجھے ہے۔“

”پڑیے پاگل مت بنو۔ ہم یہاں نہیں ٹھہرے۔“

”نگراس کی ڈیڈ پاڈی۔“ یہ لفظ کہنا بھی دشوار تھا۔
 ”وہ ری کور کرنا مشکل ہے۔ زیادہ رستی بھی نہیں
 ہے میرے پاس۔ ساری رستی تو اس کے پاس تھی۔
 مئی ہم واپسی پر ری کور کر لیں گے۔“ اس نے اپنے
 ری دستانے والے ہاتھ سے پریشے کے چہرے پر
 تے آنسو اور برف صاف کئے۔

”تمہے تم بعد میں نکالو گے تا اسے؟“ اس کی بھیگی

آنکھوں میں موہوم سی امید چمکی۔
 ”ہاں۔۔۔ واپسی پر۔۔۔ ٹھیک؟ اب چلو۔“
 ”مجھ میں ہمت نہیں ہے۔“ اس کی ٹانگیں
 بے جان ہو رہی تھیں۔

”ہمت کرو پری! بہادر بنو۔ اپنے لیے نہیں تو میرے لیے۔“ افق نے اسے سہارا دیتے ہوئے دو ٹوٹ کنڈھوں سے ابھی تک تمام رکھا تھا۔ پریشے نے بھی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اپنا وزن افق پر ڈال رکھا تھا اور پھر بہت تڑھال ہی وہ اس کے ہمراہ قدم بڑھانے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گردن پر لڑھک رہے تھے۔

اس نے زندگی میں کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ ایک لمحہ ایسا بھی آئے گا جب اسے اپنی بہت اچھی دوست کو برف میں چھوڑ کر چلنا پڑے گا۔ اس گڑھے کے وہاں سے چلنا اور آہستہ آہستہ برستی برف باری میں کیمپ تھری کی طرف قدم بڑھانا بہت مشکل تھا اس کے قدم اڑکھڑاہے تھے۔ افق نے اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید وہ اسی کریوس کے آس پاس راستہ ہلک کر برف پر ڈھے چکی ہوتی یا شاید کسی کریوس میں گر کر مر چکی ہوتی۔

اس رات کیمپ تھری میں وہ دونوں گھنٹوں خاموشی سے بیٹھے رہے اور پھر جب رات تاریک ہوتی چلی گئی تو وہ باتیں کرنے لگے۔ طیب اردگان کی باتیں عراقی جنگ کی باتیں، ترک ٹھری کی باتیں، نیٹو اور SCo جلاکس کی باتیں، انہوں نے بلا تکان صرف ایک ”بات“ سے سمجھنے کو دنیا کا ہر ٹاپک ڈسکیس کر ڈالا کہ شاید وہ کم ہو شاید ڈپریشن اور نفسیاتی اثر قدرے زائل ہو مگر سب کچھ ویسا ہی تھا۔

احصت کی ہوئی سہیلی نے ارسہ کے والدین کو انگلیٹنڈ میں اطلاع کر دی تھی۔ پریشہ رات بھر ان دونوں کے متعلق سوچتی آئی تھی، چاہئے کیا گزری ہوگی ان پر؟ کیسے سنا ہو گا انہوں نے اس خبر کو؟

رات کو اس کے سلیپنگ بیگ کے قریب جگہ بہت خالی تھی۔ افق اپنے تختے میں سونے جا چکا تھا۔ وہ ارمہ اور ارمہ کی باتوں کو یاد کر کے پھر سے رونے لگی۔ وہ کتنی اکیلی رہ گئی تھی اور شاید اس اندھے کریوس میں مگر ارمہ اس سے زیادہ اکیلی ہوگی۔ وہ محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

تب اس نے اپنے بیگ سے ارمہ کا کانڈ نکالے اور انہیں ترتیب سے جوڑا۔ سیاہ روشنائی سے انگریزی میں صفحے بھرے ہوئے تھے۔ لکھائی خاصی رف تھی اور جگہ جگہ سے کاٹا بھی ہوا تھا مگر وہ پڑھ سکتی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ کہانی ادھوری تھی۔

اس نے پہلے صفحے پر نگاہ ڈالی۔ ”قراقرم کا تاج محل“ ”سوئے مار گریس“ انگریزی میں لکھا تھا۔

ہنزدہ کے پاس راکا پوشی کو ”ہنزدہ و کثر تاج محل“ یا ”قراقرم کا تاج محل“ کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برف سے ڈھلی راکا پوشی کی ”چمکتی دیوار“ آگرہ کے تاج محل جیسی سفید اور حسین دکھتی تھی۔ پریشے کو ان سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا ”راکا پوشی کی چمکتی دیوار آگرہ کے تاج محل سے زیادہ سفید اور حسین دکھتی تھی۔

اس نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ اس ادھورے ٹول کے رف لکھے گئے مسودے کو بغیر کسی دقت کے پڑھ سکتی تھی۔



16 اگست 2005ء

”صاحب اوپر سارا سٹوفیلڈ ہے۔“ وہ دونوں خاموشی سے ٹیموں کے آگے بیٹھے تھے جب فرید ان کی طرف آیا۔ وہ آج کلائب کے لیے نہیں گئے تھے ان کے ذہنوں کو کل کے واقعے کو وقتی طور پر بھلانا تھا جس کے لیے انہیں ایک دن کارلسٹ چاہیے تھا۔ فرید البتہ کچھ مخصوص مقامات پر رسیاں لگا آیا تھا۔

”پھر؟“ افق نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”تم مانویا نہ مانو اوپر سارا سٹوفیلڈ ہے“ اور فہم مگر یہ ہے۔ اس کا گلہ سنو کسی بھی ناظم پھٹ گیا۔ اور جب برف گرے گی تو تم بھی مرے گا اور ہم بھی سو ہم تم کو ابھی سے بتا رہا ہے ہم سویرے والے ہیں۔“

”مگر فرید تم نے تو کمپ فور تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔“

”صاحب تم کل خود کمپ فور تک چلے جانا۔ تم نہیں جائے گا۔ کس ہم نے تم کو بتا دیا ہے۔“ وہ کسی اڑیل ٹھونڈے کی طرح خمد پراڑ چکا تھا۔

”فرید دیکھو ہم بھی تو اوپر جا رہے ہیں۔“ ”پہلے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ تم کوئی کدو نہیں ہو؟“

”بلدی آؤ اور سو ہم ابھی چل نہیں ہوا۔ تمہارا ٹول کے پاپ کے پاس بہت پیسہ ہے تم اور مری جاؤ تو تمہارا بچہ بھوکا نہیں مرے گا۔“ ”بلکہ اور ہمارا لپہ کریم آباد میں ایک فٹ زمین بھی نہیں چھوڑ کر نکالے ہمارے لیے۔ ہمارے حال پر رحم کرو بلدی! تمہیں ان جا کر کوئی خراب نہیں ملے گا۔ میری مانو تو تم بھی نہیں چلو۔“ ”پریشے اور افق نے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ پھر ان نے شانے اچکا دیے۔

”تمہاری مرضی!“ وہ سر جھٹک کر وہ سری جانب دیکھنے لگا۔ ”اگر وہ ہے تو اسے لکھیں۔“ ”اگر وہ ہے تو اسے لکھیں۔“ ”اگر وہ ہے تو اسے لکھیں۔“ ”اگر وہ ہے تو اسے لکھیں۔“ ”اگر وہ ہے تو اسے لکھیں۔“

”صاحب وہ عورت جھوٹ کہتی تھی۔“ ”پھر پریشے کی کنڈیوز شکل دیکھ کر بولا ”بلدی ادھر ایک گورنر عورت گھیشو بروم نو سر کرے آئی تھی۔ ہمارے ماسوں کا لڑکا ادھر ہلستہاں میں رہتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ پورٹرن کر اس اکیلی کو گھیشو بروم نو کی چوٹی تک لے کر گیا تھا۔ بعد میں جب وہ نیچے آئی تو اخبار والوں کو بولی کہ میں نے سولو کلا ٹیب کیا۔ میرا پورٹرن تو کچھ

کمپ ٹو میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میرے ماسوں کا لڑکا“ ”بے چارہ غریب آدمی ہے“ ”چپ کر کے بیٹھ گیا۔“ ”پر صاب وہ عورت جھوٹ بولتی تھی اس کو سچا خیال مت کرنا۔ اس کا فیصلہ گھیشو بروم نو نے کیا تھا۔“ ”پہاڑوں کا اپنا عدالت ہوتا ہے۔ وہ عورت اگلے سال پھر گھیشو بروم نو سر کرنے آئی۔“ ”پہاڑے والے جاتے نہیں دیا۔ اس کی تو لاش بھی نہیں ملی۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ پھر۔“ ”افق اپنے سابقہ لیے میں بولا۔

”صاحب ہم نے کمپ فور پہنچانے کے لیے لیے تھے۔ رسیاں و سیاں سب لگا دیا ہے۔ آگے تم جاؤ تمہارا کام۔“

افق اباب میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا وجہ یہ تھی کہ وہ صرف خاخہ سا تھا۔ شاہد سے زیادہ ڈر سٹ۔



17 اگست 2005ء

آج رات سے موسم طویل خراب تھا اور موسم سے افق کا دل اب تو کتنی دیر سے پریشے کے میٹ پر لیٹا ایک دوا تھے پر رتھے خیمے کی جھٹ رہا تھا۔ شاول کے مطابق آج انہیں کمپ فور میں ہونا تھا۔ وہ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ”بے چارے طوفانی موسم میں رہے۔“ ”جن کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ ”اس کی کھلی جھٹوں سے سر ہو اندر داخل ہو کر ان کو ٹھنڈا رہی تھی۔ برف کی مسلسل اوپر سے نیچے ملائی ٹنگ سے جیسے کی دیواریں کھجوریں ہو رہی تھیں۔

”فرید صبح منہ اندھیرے ہی بغیر بتائے چلا گیا۔“ ”اس نے یونہی بولنے کی غرض سے کہا۔

”جنا بھی دیتا تو میں نہ روکتا۔“ ”وہ اسی طرح لینا اوپر رکھتا رہا۔

”وہ ٹھیک کہتا تھا افق! ہم دونوں پاگل ہیں۔ سب کو دیا پاگل ہوتے ہیں۔ گھروں کا سکون چھوڑ کر برفانی

واپسوں میں نکل جاتے ہیں اور آخر میں مرجاتے ہیں۔“

”ایسے بھی تو مرجاتے ہیں۔“ ”وہ ایک سیلنٹ میں“ ”لفٹ میں پھنس کر دم گھٹنے سے کسی انٹر کریش یا بم بلاسٹ میں۔ تم مسلمان نہیں ہو؟ تمہارا ایمان نہیں ہے کہ جہاں موت آتی ہے وہاں آجائے گی کبھی موت بھی ملی ہے کیا؟“

پریشے نے ایک اچھٹی نظر اس پر ڈالی جو بغیر پلکیں جھپکائے چھت کو گھور رہا تھا اور پھر تھک کر خیمے کی دیوار سے سر ٹکا دیا۔ سامنے والی دیوار کے دوسری طرف برف اکٹھی ہو رہی تھی۔

”پھر بھی افق! کیا مل جاتا ہے پہاڑوں پر جا کر؟ اتنی مشقت کر کے؟“

”یہ بات ہمیشہ وہ کال ترین لوگ کہا کرتے ہیں جن سے روز ایک گھنٹہ لان میں واک بھی نہیں ہوتی۔“ ”بھلا کیا رکھا ہے پہاڑوں میں“ ”والا فقرہ ان لوگوں کے منہ سے نکلتا ہے جن کے لیے انگور ہمیشہ کھٹے ہوتے ہیں۔“ ”وہ تلخی سے بولا۔

”پھر بھی۔ زندگی نارمل طریقے سے بھی گزاری جاسکتی ہے۔“ ”وہ شاید بحث کے موڈ میں تھی۔

”نارمل طریقہ کیا ہے؟ گھنٹوں فون پر رشتے داروں کی برائیاں کرنا سمیت ملے بے ہودہ فیشن اپنانا غیر حقیقی فلموں کے غیر حقیقی ہیروز کو پوتا تسلیم کر کے ان کی پرستش کرنا راتوں کو جاگ جاگ کر گھٹیا قسم کے عشقیہ ٹیبل پڑھنا یا اس سے کوئی ٹیکنی چھلیاں کھانا اگر یہ نارمل لائف ہے تو پھر کوہ پیماؤں کی ایبارل لائف اس سے بہت بہتر ہے مادام!“

”جانتے ہو افق! مجھے نہیں پتا لوگ پہاڑ کیوں سر کرتے ہیں مگر میں پہاڑوں میں خوش رہتی ہوں۔ مجھے ادھر سکون ملتا ہے۔ لیکن نشاء پاپا سیف ان سب کو بہت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ پہاڑ کیوں سر کرتے ہیں۔“ ”برف قطروں کی شکل میں برہ رہی تھی اور قطرے راستے میں آئے والے ہر ذرے کے ساتھ مل کر بڑے ہوتے جا رہے تھے۔

”تو وہی بات ہے کہ ”لوگ کتابیں کھول پڑھتے ہیں؟ علم حاصل کرنے کے لیے؟ تو بتانا علم اپنے اور پتھر کے بارے میں پہاڑوں میں جا کر ملتا ہے وہ دنیا کی کسی درس گاہ میں نہیں ملتا۔ آپ پہاڑ کو ایک سپر ہسپتال کرتے ہو اور یقین کرو کہ ان کا ہمز جیران ہوتے ہیں جب وہ سنتے ہیں کہ ہم کو یہاں پر تھوکان کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی جانب تمیز اور ادب سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ ان پر قدم بھی احترام سے رکھتے ہیں۔ پہاڑ عظیم ہوتے ہیں۔“

”اور ظالم بھی! پریشہ نے اسٹریپ انداز میں سر جھٹکا۔ وہ دیوار کے اس پار نظر کئے والے قطروں کو دیکھ رہی تھی جو دیوار کے نیچے خالی درز سے ہر ممکن طور پر جیسے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا تمام سامان گبلا ہو چکا تھا۔“

”بے شک ظالم ہوں مگر میں انالیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں انفرہ اور اپنے گھر سے نہیں ان پہاڑوں سے تعلق رکھتا ہوں پر۔“

”تمہیں لگتا ہے ہم بچ کر چلے جائیں گے؟“

”کوہ پیالی تو نام ہی بلند یوں سے زندہ واپس بچ کر آنے کا ہے۔ یہ summit تو محض ایک بولس ہوتی ہے۔“

”پھر بھی تم واپس نہیں ملنا چاہتے؟“

”نہیں جانا ہے تو جاؤ میں چوٹی فتح کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ برف کے قطرے اب چھوٹی چھوٹی گیندیں بن کر دیوار کے اس پار اٹھتے ہوئے تھے۔

”افق پلینڈ واپس چلو اس سچ کو ان کا نعل ہی رہنے دو۔“

”میں ڈر برف صاف کر لوں۔“ وہ چھوٹا سا بیچلہ اٹھا کر ہر نکل گیا۔

وہ چوٹی پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور پلٹورو کے پرست دیکھے بغیر واپس نہیں ملے گا وہ جانتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ وہاں تک نہیں جانا چاہتی تھی اسے چھوڑ کر نیچے اترنا چاہتی تھی۔ دنیا میں کوئی بھی انسان ”مکمل طور پر بہترین“ نہیں ہوتا۔ افق ارسلان میں بھی ایک

خالی تھی۔ ہٹ دھرمی ”ضد“ حد سے بڑھی اور اعتمادی۔

کوہ پیالوں کی اکثریت انہی خصوصیات کا شکار ہوتی ہے۔ وہ عملاً ”موسم کی خرابی کے باوجود اپنے ٹارگٹ کے بہت قریب پہنچ کر واپس نہیں ملنا چاہتے۔“

کچھ صرف کر کے ان بلند یوں تک پہنچے ہوتے ہیں کہ واپس پلٹ جانا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ابھی سچ ہی توافق نے کیمپ تھری سے واپس جانے کے متعلق کہا تھا یہ تو ایسے ہے کہ تم ہنڈرو میٹر ریس کے ایک ایڈیٹ کو نوٹس میٹر پر رک کر مڑ جانے کو کہو۔“

افق کی سب سے بڑی خالی جگہ تھی کہ اسے بھول گیا تھا کہ سو میٹر ڈاؤر کوہ پیالی میں فٹن ہوتا ہے۔

18 اگست 2005ء

کیمپ 7500 میٹر پر تھا کیمپ تھری سے تقریباً ”سات سو میٹر اوپر۔“ آج برفانی جھٹکڑ نہیں مل رہے تھے ”موسم ٹھیک تھا مگر برف باری ہنوز جاری تھی۔ وہ اتنی ہلکی اور نرم تھی کہ visibility خاصی بہتر تھی۔ اس کے پاس اتنا گیس اور فیول نہیں تھا کہ بیچ کر ایک دن بھی مزید انتظار کرتے۔“

گزشتہ روز کے سخت طوفان کے باعث رسیاں اور کورڈز ہری طرح الجھ چکی تھیں۔ ان کو سلجھانے میں خاصا وقت ضائع ہوا۔ رسیاں ویسے بھی کیمپ تھری سے کچھ دور تھیں۔ رسیوں کے اتناڑ تک کا سفر انہوں نے خاموشی سے کیا۔ پھر ان کو سلجھا کر جب پریشہ نے ہمارے کرنے کے بعد رسی کھینچی تو وہ جام ہو گئی۔ اس نے جھنلا کر اسے دوبارہ کھینچا مگر وہ جام رہی۔ اس نے کلیمشور کو گھڑا مار کر ہیلڈ پر چڑھائے ”نیچے اترنا وہ گرہ ڈھونڈی جو رسی میں بن کر اسے جام کیے گی۔“

کریک میں پھنسی تھی اس نے گرہ کھولی اور دوبارہ جام چڑھنے لگی۔ اس کی ایک غلطی کی وجہ سے پورے دن منٹ ضائع ہوئے مگر افق نے کچھ نہ کہا۔ وہ خاموشی

سے تمام کارروائی دیکھتا رہا۔

وہ دونوں اس وقت ڈنٹھ زون میں تھے۔ پھر ہزار میٹر سے اوپر اپنی ہیڈ ”ڈنٹھ زون“ یا ”ڈرنگل لٹ“ کہلاتا ہے۔ اس بلندی پر ہوا بے حد تلی اور آکسیجن ان کے جسموں کے لیے ناکافی تھی۔ سانس لینے کے لیے پریشہ کے پیچھےڑوں کو پورا زور لگانا پڑتا تھا اور وہ اس وقت پورا منہ کھول کر سانس لے رہی تھی۔

وہ کیمپ فور سے قدرے نیچے تھے۔ ان سے تقریباً تین سو میٹر اوپر پہاڑ کی ڈھلوان تھے ہوئے ندی والوں سے مزین تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے چوٹی اتنی سامنے دکھائی دیتی کہ یوں لگتا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لے گی مگر اس کے لیے بہت لمبا ہاتھ چاہیے تھا۔

وہ رک کر اس آئیں برف میں مار کر آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اس کی انرجی اتنی کم رہ گئی تھی کہ اس لگتا تھا کسی کسی وقت تھک کر نیچے لڑھک جائے گی۔ وہ ”سرا“ کہہ کر اسٹائن کو ایک serac کے پیچھے کھڑی ہوئی اور اپنا تنفس درست کرنے لگی۔ seracs جب گرتے ہیں تو خوب تباہی مچاتے ہیں۔ مگر اس وقت خود کو پہنچا کر وہ serac جس کے سامنے میں وہ غلطی کی تھی کھڑی تھی اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس سے اس کی رائیں جانب تھا۔

دفعۃً اس برف کے ٹکڑے اور ٹکڑے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

اس کے سامنے کوہ پیالی پر قدرے دائیں طرف برف میں ایک لمبا سا صفت پیدا ہو رہا تھا۔ یوں جیسے ڈگر سے اٹکے سفید پکڑے کو اوپر سے فینچی سے کاٹ دیا جائے۔ برف کی بلٹیوں میں نمودار ہونا وہ کریک کے لیے حد خوب صورت اور بے حد مملکت ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے ہی پل اس کریک سے نیچے کی برف کے نیچے بڑے ٹکڑے نیچے گرتے اور سفید بے حد گھنی ہوئی پیدا کرتے نشیب میں گرتے آ رہے تھے۔

برف کے سانس رک گیا۔ ابولائی نیچے کی طرف ہاتھ بڑھا کر وہ ایک serac کے پیچھے محفوظ تھی لیکن

”افق! وہ بے اختیار چلائی ”ابولائی“ آ رہا ہے۔ خود کو سیف کرو۔“

افق نے بوکھلا کر اوپر دیکھا جہاں تیزی سے گرتی برف اس کی جانب بڑھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ خود کو سیکور کر لیا برف کی سفید دھول ہر طرف پھیل گئی اور اس گھنی دھول کے پیچھے وہ غائب ہو گیا۔

اپنی آئیں کو برف میں گاڑے خوف کے مارے اسے مضبوطی سے پکڑے وہ آنکھیں بند کیے دیوار سے چبکی کھڑی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پھر دھول آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر سر اٹھا لیا۔

وہ دھیما سفید برف کا پوٹھی کے جسم سے بالکل ایسے چمکی تھی جیسے چند لمحوں پہلے تک تھی۔ اس نے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیڈلوپیڈیا

تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

خوبصورت سرورق

مضبوط جلد

آئینہ چھائی

قیمت: 750/- روپے

ڈاک خرچ: 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ

37 اور بازار بلاک

دلہن کا دل

یہ کہانی ڈاکٹر پریشہ جہانزیب کی ہے جو خوابوں کے حقیقت بننے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ طبیعتاً مشکل پسند ہے اور اس کی زندگی خوب صوری تھی۔ پریشہ والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے پریشہ کو یقین ہے کہ اس کا دل ایک دن کوئی شہزادہ اس کے خوابوں کو تعبیر کا روپ دے گا۔ اسے جھکا اس وقت لگتا ہے جب اس کے والد اس کی پھولی زاد سیف سے کہتے ہیں۔ سیف اور پھولی بھوکی قبیل کی طبیعت کا کانا ہے، مگر والد کے فیصلے سے یہ شہزادہ بن گیا ہے۔ ماموں زاد کنز انشاء سے اس کی گاڑی چھٹی ہے۔ ماموں کی پوری قبیلہ اس پریشہ کے رشتے پر تکیا ہے۔

مسکھلا تاؤ



گو ہر وقت پریشے کا رشتہ ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس لیے وہ جلد شادی پر زور دیتی ہیں۔ شادی ہونے پر بانی ہے۔ کچھ دن آزاد زندگی گزارنے کے لیے وہ انشاء کے ساتھ نادرن ایریا ز جانے کا پلان بناتی ہے۔ بس ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔

مال روڈ پر پریشے اور انشاء کی ملاقات ایک ترک انجینئر افق ارسلان سے ہوتی ہے جو راکا پوشی پٹاڑی پر کر رہا ہے۔ اس کی ساحرائے اور پراسرار شخصیت پر پریشے ٹھک سی جاتی ہے۔ بظاہر وہ سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ چلتا ہے کہ افق بھی پریشے اور انشاء کے ساتھ ہی ٹور گینچی کے تحت نادرن ایریا جارہا ہے۔ ٹور کے دوران ان کی ملاقات لڑکی ارسلان سے ہوتی ہے جو ادیبہ بھی ہے۔ پریشے اور افق ارسلان کی نوک جھونک غیر محسوس انداز میں دونوں کو ایک خوب صورت جذبے میں جکڑ دیتی ہے۔ افق کا خصوصی لگاؤ دیکھتے ہوئے پریشے اسے اپنی منگنی کا بتا دیتی ہے جس پر وہ رونا رہ جاتا ہے۔

واپس آکر بھی پریشے اپنے آپ کو ایک سحر گر فائر میں محسوس کرتی ہے۔ وہ جہاز سب صاحب سے راکا پوشی ایکسیڈنٹیشن پر جانے کی اجازت مانگتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسے اجازت مل جاتی ہے۔ انشاء (نشاء کا بھائی) دوستوں کے گروپ کے ساتھ پریشے محض افق ارسلان سے ملنے راکا پوشی آتی ہے۔ افق بے حد غلغلہ انداز میں اسے ملتا ہے۔ اس ملاقات میں افق ارسلان پریشے کو ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر دکھاتا ہے۔ پریشے کے دل پر اس کی بے کہ پیاس کی بیوی خنارے ہے۔ پریشے اس خبر پر غمگین ہو جاتی ہے۔ پریشے واپس جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے جس پر افق کی سناپی حیرت ہو جاتی ہے۔ خنارے میں وہ خنارے ٹویر ہے۔ نوازی ہے تو افق اسے بتاتا ہے کہ خنارے مریضی ہے۔ پریشے کو اپنے سینے کی بد سوزی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تو افق معافی مانگ لیتی ہے۔

راکا پوشی ایکسیڈنٹیشن پر ان کا گروپ روانہ ہوتا ہے تو راستے میں موسم خراب ہے۔ ایک گروپ اس میں اس وقت جاتی ہے۔ یہ حادثہ افق اور پریشے کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ان کا ساتھی پورٹر بھی موسم کی خرابی کے باعث انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ پریشے افق کے ساتھ اس مہم کی جانب رواں ہوتی ہے کہ اجاگ ایک ایوا لاج افق کو گہری کھائی میں دھکے دے۔ صورت حال پریشے کے حواس محل کر دیتی ہے۔ وہ رسی کے درمیان میں کھینچنے لگتی ہے۔

PHOTO

”نہیں“ وہ ادھر ہی ہو گا۔ میں ڈھونڈتی ہوں اسے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔“ وہ خود کو دبا رہ رسی پر Clip on کر کے بوڑھاتے ہوئے نیچے اترنے لگی۔

ہمالیہ کے عظیم پہاڑوں نے اس کی ہڈیا ہٹ سن لی تھی اور وہ استہزائیہ ہنسنے لگی تھی۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم دیکھتے رہنا ظالم پہاڑ! میں اسے برف میں دفن نہیں ہونے دوں گی“ میں اسے قراقرم کے قائل ایما ڈوں اور ہمالیہ کے ظالم

آسمان سے دور لے جاؤں گی۔ تم دیکھتے رہنا۔“ وہ زور زور سے روتے اور چلاتے ہوئے پہاڑوں کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ان بلند چوٹیوں نے پھر سے وحشیانہ انداز میں تہقہ لگایا تھا مگر اب وہ انہیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ افق کو تلاش کر رہی تھی۔ اسے ہر حال میں افق برف سے باہر نکالنا تھا۔

تقریباً چالیس میٹر نیچے اتر کر اس نے ٹور سے آزاد کیا۔ چالیس میٹر اوپر اور سو میٹر اونچے طرف افق چند لمحوں پہلے موجود تھا۔ وہ یقیناً وہیں گرا ہو گا۔ اسے اب سو میٹر اونچے طرف جانا تھا۔

گھٹنوں تک برف میں دھنسی خود کو گھسیٹتی ہوئی اس طرف جانے لگی۔ اس کی ٹانگیں منہدم ہو کر اس کی ہڈی گھسیٹیں، اس سے چلا نہیں جا رہا تھا مگر وہ اس کی دیر چلتی رہی، پھر بالآخر نہ حال سی ہو کر وہیں گھٹنوں کے بل گر گئی۔

اس میں مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تیز تیز اس لیے ہوئے وہ باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے کئی کوشش کی مگر جسم پر طاری تھکاوٹ اور عجیب و غریب کے باعث اس سے اٹھائی نہیں گیا۔

”افق۔“ وہ پھر سے حلق کے بل چلا کر اسے گئی ”تم کہاں ہو؟“

ہو کا گلیشیر خاموش رہا۔

آسمان سے بہت خاموشی سے ہر باری ہوتی رہی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا سو دونوں ہاتھوں اور سر کے بل برف میں crawl کرتے ہوئے اپنا اپنا ایکس بریک میں مارتی وہ آگے بڑھنے لگی۔

وہاں ہر مودود ہوا سفید برف کی چادر چھٹی تھی۔ اس کیس سے جھلکے سیاہی مائل سرمئی پتھر اور اس بھی ایک برف باری کے باعث چاندی سے چمکی تھیں۔ اور دور تک برف کا ایک نہ ختم ہونے والا میدان تھا اور اسے افق کو تلاش کرنے کے لیے وہ صحرایہ کر رہی تھی۔

گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ”ادھر ادھر برف پر“ وہ کہتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ازالی یا چڑھائی کا سفر نہیں تھا وہ دراصل پٹاڑی کی پر شمال کی جانب بڑھ رہی تھی۔

وہ برقیلا میدان تھا۔ جانے سو میٹر ہوئے تھے یا اس کی کہ وہ ایک جگہ برف میں گہری گئی۔ اب اس میں وہ حرکت کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ زور زور سے ہٹانے کے لیے نفس درست کرنے لگی۔

پھر اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر دیکھا۔ افق کو وہاں اسی جگہ کے قریب ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہاں ہی کا پوٹینشل بہت شدید نہیں تھا کہ وہ بہت نیچے

جا کر تباہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے آس پاس ہی کہیں برف میں دبا سا کس لے رہا ہو گا مگر وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟

پریشے اپنے قریب برف میں ایکس مارتے ہوئے اسے توڑنے لگی کہ شاید وہ اس کے قریب ہی کہیں ہو۔ اس نے بہت سی برف کھود ڈالی مگر وہ نہیں نکلا۔

وہ پھر سے برف پر تقریباً ”جھکی“ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی ساتھ ساتھ وہ اسے آوازیں بھی دے رہی تھی مگر وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ پریشے کو جہاں جہاں کسی سیاہ سرمئی شے کی جھلک دکھائی دی اس نے وہاں کی برف کھود ڈالی، مگر ہر جگہ برف کے نیچے سے وہی سیاہ پتھر نکلتے تھے جنہیں لوگ ترک زبان میں قراقرم کہتے تھے۔

برف باری تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تھک کر حوصلہ



دے کر پیچھے لائی۔ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔
 غالباً اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ٹانگ میں
 آنے والا زخم اتنا گہرا اور اذیت رساں تھا کہ جسے کے
 فرش پر گرتے ہی وہ پھر سے کراہنے لگا تھا۔ وہ کبھی بھی
 درو سے کراہتا نہیں تھا۔ اب اگر کرا رہا تھا تو یقیناً
 شدید زخمی تھا۔

پریشے وہیں اس کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔
 خیمے کی گول چھت پر برف مسلسل گر رہی تھی مگر
 گور ٹیکس میں لگے دو ہیٹ لائٹرز کے باعث اندر اور
 باہر کے درجہ حرارت میں خاصا فرق پڑا جا رہا تھا۔ اندر
 گرما کر آگ لگی پھر بھی اس کے دانت بچ رہے تھے اور
 ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو رہی تھیں۔ وہ بیٹھے
 بیٹھے کھٹ کر اس کے قریب آئی اور اپنا بیگ کھول کر
 فرش پر الٹ دیا پھر فرش پر پلھے سالان میں سے
 دستا لے نکال کر افق کے ہاتھوں میں پھنسائے۔
 سیدنگ بیگ میں اسے لٹایا کہ وہ اپنا سیدنگ بیگ
 اپنے بیگ سمیت کم کر چکا تھا اور پھر مڈمڈل کٹ سے
 ضروری سامان نکال کر اس کا زخم دیکھنے لگی۔

اس وقت اس کا تھکاوٹ اور سردی کے مارے برا
 حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ فوراً "کیبل اوڈھ کر سو جائے"
 مگر سامنے وہ شخص لیٹا تھا جس سے اس کی سانسوں کی
 ڈور بند تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لیے وہ دو دن
 پیدل برف زاروں کو عبور کر کے آئی تھی۔ جو اگر درو
 سے کراہتا تھا تو وہ درد اور گھاؤ پریشے کو اپنی روح میں
 لگتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ سو نہیں سکتی تھی۔ جب
 تک وہ پرسکون نہیں ہو جاتا تھا اسے چلن نہیں آسکتا
 تھا۔

اس کا زخم گہرا تھا۔ شاید ہڈی فریکچر ہو گئی تھی۔
 خون بھی بہہ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کسی حد
 تک گھٹنے کے باعث وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہی تھی
 اور بمشکل بتی کر رہی تھی۔ اس کی اپنی سانس بھی اکھڑ
 اکھڑ کر آرہی تھی۔ وہ ڈیڑھ دن میں تھی اور اس کے
 جسم کے خلیوں کو اس بات کا علم ہو چکا تھا۔ اس کے
 تمام خلیوں کو آکسیجن ٹھیک سے نہیں مل رہی تھی

اور وہ اس کو اس بات کا بخوبی احساس دلا رہے تھے۔
 چونکہ صبح کو بھی آکسیجن نہیں مل رہی تھی غموں
 زمین مافوق سا ہو رہا تھا۔ اس کے جسم کے پاس
 آکسیجن کیسٹو بھی نہیں تھی۔ میں کیمپ میں جب
 اس نے افق سے آکسیجن رکھنے کی بات کی تو اس نے
 لاہروائی سے انکار کر دیا تھا۔ "میں نے بگ فائیو بیگ
 آکسیجن کے سرکے ہیں کبھی کبھی دل کرتا ہے کہ وہیں
 تو سی کہ میرے پیچھے سے کتنا حوصلہ رکھتے ہیں۔"
 اس کے پیچھے بڑے جیسے بھی ہوں وہ بہر حال کم
 آکسیجن کے عادی تھے مگر پریشے عادی نہیں تھی۔ اس
 نے اپنے طور پر کچھ آکسیجن ایمر جیسی پمپیشن کے
 رکھی تھی مگر وہ لانا بھول گئی تھی۔ افق کے پاس
 ایک کبوتر تو لازمی ہونا تھا۔ مگر وہاں ایک کبوتر بھی
 نہ پھولی۔ غلطیوں بہت سی تھیں۔ یہی سبب تھی کہ

زخم صاف کر کے اس کی پٹی تو کر دی مگر فہم کچھ
 بارے میں وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ اس
 افق کو لانا نہیں کیمپ لے کر جانا تھا۔ شہر کچھ دور
 کہ سر جری تا گریز تھی مگر وہ پیچھے کیسے جائے؟ وہاں
 ہلے کے دو کام راستے مسدود تھے۔

افق کو اس نے دوبارہ سیدنگ بیگ پہنا دیا۔ وہ
 بند ہوتے ہی اس کے رخ جسم کو گویا ٹکڑے ٹکڑے لگی اور
 اس کی نیم وا آنکھیں پوری بند ہو گئیں۔ وہ ای
 پوزیشن میں لٹا رہا۔

پریشے کے پاس اب وہی سیدنگ بیگ میں تھا
 صرف دو لافٹوڑ تھے جن کو لپیٹ کر بھی وہ کٹھن رہی
 تھی۔
 ٹوٹی ٹانگ اور گہرے زخم کے باوجود وہ کیسے پرسکون
 بنا ہو کر سو رہا تھا۔ وہ اس کے قریب دیوار سے لگا
 لگائے ہوئے تھا۔ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھے گی۔ اس
 میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ افق کو سیدھا کرے یا وہ
 سیدھی ہو کر لٹ جائے۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔
 غیند میں اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے۔
 آخری خواب آیا اس میں اس نے دیکھا کہ وہ

احست افق، ارم، نصیب، نشاء، منصوب، جلالی
 لورسٹ، پاک آری کے پائلٹس، وہ سب کیمپ نور
 میں ایک ہی خیمے میں دیکھے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے
 ہیں۔ خشک میوے گرم چائے اور ہاٹ چاکلیٹ سرو
 کی جارہی ہے۔ شغالی بھی وہیں تھا اور اس کا اپنا ملازم
 وحید بھی۔ شغالی اور وحید کی شکلیں بہت مل رہی
 تھیں۔

کوئی اس کا گھٹنا جھنجھوڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش
 کر رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔
 وہاں شغالی تھا۔ وحید، آری کے پائلٹس،
 سب کچھ راگاپوشی کی کھٹلی ہو میں تحلیل ہو چکا تھا۔
 وہ اپنے خیمے میں بھی اور اس کا گھٹنا لٹانے والا افق تھا۔
 اس نے کیا؟ پریشے کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار
 رہا۔ لگا۔ باہر طعن کا شور ابھی تک جاری تھا۔ وہ
 کھٹے کھٹے پیر سوئی رہی اسے اندازہ نہ تھا۔

"پالی وہ گریہ پالی۔" بہت دقت سے وہ آہستہ
 آہستہ بول بولا جسے بولنے سے بھی اسے تکلیف ہوتی
 ہو۔ وہ یہ کہ دیوار سے ٹیک لگائے ٹانگیں سیدھی
 لٹائے بیٹھے۔ دونوں کے درمیان پریشے کے رک
 سے بچنے والی اشیاء تھیں۔ وہ اس کی بات پر
 سروں سے سر ہٹا کر سے پیر سمجھنے لگی۔

ایولا لچ میں اس کے منہ سے اسے دانتوں کے
 کھانے کا زیادہ تر سامان یاد رہی تھی۔ پریشے کے پاس
 اس کے پاس اس کے پاس اس کے پاس اس کے پاس
 لی ٹونز اور کچھ رسی تھی۔ کھانے کے نام پر اس کے
 بیگ میں بس ایک دن کا کھانا تھا جو ڈی ہائیڈریٹ تھا اور
 اس کی برف پگھلانے اور اسے ری ہائیڈریٹ کر کے
 اصل حالت میں لانے کے لیے اس میں لیول کی بے
 تمنا ضرورت تھی۔ جو کہ اس وقت شخص دو سے تین
 دن کی بچی تھی۔ وہ بھی صرف پانی بنانے کے لیے۔ وہ
 سے تین دن کا دورانیہ کم ہو سکتا تھا اگر وہ کھانا بھی گرم
 کرنے لگتی۔ مسو اب اس کے لیے وہ تمام فوڈ سیلائی بے
 گار تھی۔ وہ کیس ضائع کرنا اور نہیں کر سکتی تھی۔
 کیونکہ اس بلندی پر انسان بغیر کچھ کھائے بھی ہفت بھر

زندہ رہ سکتا ہے۔ گھری پالی۔
 وہ بے رنگ مائع جو زمین پر صرف آب ہوتا ہے،
 پرائیڈل پر آب حیات ہوتا ہے۔ بغیر کچھ سے وہ چند
 گھنٹوں میں ہی مر جاتے۔ الٹے بھوک دونوں کو نہیں
 لگتی تھی۔ اس بلندی پر لگتی تھی۔

پریشے نے اپنا high altitude stove
 چلایا۔ پھولے سے چن چن میں برف توڑ کر ڈالی اور اسے
 پگھلانے لگی۔ خیمے کی چھت پر برف مسلسل گر رہی
 تھی مگر صد شکر کہ وہ اس زاویے سے نصب تھا کہ
 برفانی طوفان شہر اکھاڑا اگر نہیں سکتا تھا۔

برف پانی بن گئی تو اس نے آخری چاکلیٹ سے کچھ
 ہاٹ چاکلیٹ بنائی۔ ہاٹ چاکلیٹ اور گرم چائے افق کو
 پالی، خود صرف گرم پانی پر گزارہ کیا۔ اپنے جھے کی
 چائے بھی وہ افق کو دے چکی تھی۔

جسم کو کچھ گرم مائع ملا تو وہ کچھ سوچنے کے قابل
 ہوا۔ افق کی توانائی بھی قدرے بحال ہوئی تھی۔ اس
 کے پھرے پر شدید درد کے آثار رہ گئے تھے مگر وہ اب کراہ
 نہیں رہا تھا بلکہ خیمے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔
 آنکھیں بند تھیں اور وہ دھیرے دھیرے کچھ گنگنا رہا تھا۔
 یہ وہی گانا تھا جو اس روز وہ میں کیمپ میں بنو و کٹر
 لوگوں کو سنا رہا تھا۔ اور کئی دن پہلے برستی بارش میں
 وائٹ ٹیکس کے سوروں کو سنایا تھا۔

we are leyla
 we are meenun

اس کی آواز بے حد دھیمی تھی مگر اس نے سن لی
 تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ تکلیف اور دکھ میں ہمیشہ گنگنایا
 کرتا تھا۔

"یہ لیلیٰ کی تو سمجھ آتی ہے،" مگر Meenun کون
 ہے افق؟

افق نے آنکھیں کھولیں جو بے حد سرخ ہو رہی
 تھیں۔

"بھئیوں!" ایک لفظ کہہ کر اس نے دوبارہ سے
 آنکھیں موند لیں۔

"ارے!" اسے حیرت ہوئی۔ یہ لیلیٰ بھئیوں ترکی

میں بھی ہوتے ہیں؟

”ہاں“ مجنوں ترک بھی ہو سکتا ہے۔ ”وہ دھیرے سے مسکرایا اور پھر ہند آنکھوں سے دوبارہ گنگنا نے لگا۔ ”دی آر لیٹی“ ڈی آر مجنوں۔ ”یہ وہ پہلی نارمل بات تھی جو دونوں نے طوفان میں پھنس جانے کے بعد کی تھی۔ یہ گرمیابی کا اثر تھا۔ اب حیات کا اثر۔

افق کچھ دیر گنگنا تاربا پھر خاموش ہو گیا کہ اب اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ پریشے بھی اپنے ذہن کو مجتمع کر کے اس پروجیکشن کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی جس سے اس کا زندگی میں پہلی بار پالا پڑا تھا اور جب حالات سمجھ میں آنے لگے تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس کا میٹر اسے بتا رہا تھا کہ وہ 7437 میٹر ہائٹ پر سخت برفانی طوفان کے درمیان ایک خیمے میں پھنسی بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا ڈی کٹ لیا ہے جس کا زخم نہ صرف اس کو چند قدم بچ جانے سے محفوظ کر چکا ہے بلکہ زخم کے بائٹ اس کی ٹانگیں کم وقت میں فروسٹ بائٹ ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہیں۔ اس کے ایک پاؤں کی دو انگلیاں پہلے بھی فروسٹ بائٹ ہو چکی تھیں اور برائے زخم تو ویسے بھی فروسٹ بائٹ کے عمل کے دوران تیز ترین catalyst بن جایا کرتے ہیں۔ فروسٹ بائٹ کو صرف ایک عنصر روک سکتا تھا اور وہ تھا پاؤں کی ہائڈریشن کا مطلب تھا فروسٹ بائٹ اور ڈی ہائڈریشن جمع ہائی ایٹیٹیوٹ کا مطلب تھا سیریل ایڈیمایا بلعنوی ایڈیم۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ اسے جلد از جلد افق کو وہاں سے نکالنا تھا۔ اس کے پاس صرف اسی میٹر رسی تھی اور اسے کئی ہزار میٹر نیچے اترنا تھا۔ (بیس کیمپ 3400 میٹر پر تھا) اگر وہ جلدی افق کو وہاں سے نہیں نکالتی تو وہ مر بھی سکتا تھا۔ اسے کچھ سوچنا تھا کچھ کرنا تھا۔

اوپر جانے اور چوٹی سر کرنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ افق کی مخصوص اور خالص کوہ پیماؤں والی ضد کے باعث

وہ turn ground time کا آپشن ختم کر چکے

تھے۔

کوہ پیماؤں میں ایک ٹرن ار اوٹڈ ٹائم ہوتا ہے۔ نیچے مڑنے کا وقت پہاڑوں پر موسم پل پل بدلتا ہے۔ کوہ پیما تعین کرتے ہیں کہ اگر آج اتنے نیچے تک ہم نے چوٹی سر کر لی تو ٹھیک ورنہ اتنے نیچے تک ہم جہاں بھی ہوئے واپس مڑ جائیں گے۔ عموماً ”کوہ پیما نہ پلٹنے کی غلطی کرتے ہیں“ یہی غلطی افق ارسلان نے بھی کی کہ وہ بہر حال کوئی افسانوی کردار نہیں، ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔

اب انہیں راکا پوشی کے ناقابل تسخیر رچ کو ناقابل تسخیر ہی چھوڑ کر واپس جانا تھا اور واپس جانے کے لیے طوفان کا رکنا ضروری تھا جو کہ سمجھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ نہ وہ اوپر جاسکتے تھے نہ نیچے اور نہ ہی بیٹھے رہ سکتے تھے۔ خدا یا وہ کیا کرے؟

بڑی دیر بعد کہیں جا کر وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ اس ٹرن اوٹڈ ٹائم سے راکا پوشی کی راکا پوشی کسی تمہید کے کہنے لگی۔

”احمت۔۔۔ احمت افق زخمی ہے، ہم کیمپ فور اور کیمپ تین کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ باہر سخت طوفان ہے۔ ہمیں ہر حال میں نیچے اترنا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟“

”افق زخمی ہے؟ اسے کیا ہوا؟“ حسب توقع وہ پریشان ہو گیا۔

”صبح ابولا نچ آیا تھا۔ افق کی رسی ٹوٹ گئی اور وہ 40 میٹر نیچے گرا ہے۔ ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوئی ہے اور چونٹیں بھی شدید ہیں۔“ سخت سردی کے باعث اس کے بچتے دانت اسے بولنے نہیں دے رہے تھے۔ ”اوہ تم یوں کرو اس کے فریکچر کو۔“

”فار گاڈ سیک احمت! میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے پتا ہے مجھے اس کے فریکچر کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ایک دم غصے سے بات کالی۔ پل بھر کو احمت خاموش سا رہ گیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”میں آئی ایم سوری احمد۔ میں بہت شینس ہوں۔ پلیز تاراج مت ہونا۔“ وہ روہانی ہو گئی۔
 ”ریٹیکس پریشے! جب طوفان رکے تو تم پیچھے اتر آنا۔ اس طرح پریشان ہونے سے تمہارے اعصاب پر برا اثر پڑے گا۔ خود کو calm (ر سکون) کرو۔“

”میں خود کو کام نہیں کر سکتی احمد! ہماری پوزیشن بہت خراب ہے۔ افق شدید ڈھکی ہے۔ وہ ڈھسٹل نہیں کر سکتا۔ اسے شدید درد ہو رہا ہے۔“ احمد سے بات کرتے ہوئے اس نے ایک فکر مند نگاہ افق پر ڈالی جو آنکھیں موندے شدت ضبط سے لب سختی سے ایک دوسرے میں پوست کیے بیٹھا تھا۔

”تم اس کو پچھن کر دو۔“
 ”مگر اس کی ٹانگ نہیں کام کر رہی۔ وہ چل نہیں سکتا تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟“ شدید ڈپریشن پھر سے غصے میں ڈھلنے لگا۔

”لفٹنا“ افق نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے ہاتھ بوجھا کر اس کا گھٹنا ہلایا۔ پریشے نے بولتے بولتے رک کر اسے دیکھا۔

”انقرہ کال کرو۔ جینیک کو۔ اس سے ویدر کنڈیشن پوچھو۔“ وہ نقابت بھرے لہجے میں آہستہ آہستہ ”رک“ ”رک“ کر بول رہا تھا۔ پریشے نے سمجھ کر سر ہلایا اور ریڈیو میں بولی۔

”احمد۔! انقرہ کال کرو جینیک کو اور اس سے ویدر کنڈیشن کے بارے میں۔“

افق نے جھنجھلا کر نفی میں سر ہلایا۔ ”احمد نہیں تم پوچھو پری!“
 ”میں؟ میں کیسے پوچھوں؟“

”سیٹلائٹ فون تھا تمہارے پاس۔“
 ”وہ ہاں۔ احمد! میں تم سے پھر بات کرتی ہوں۔“

آؤٹ (Out) اس نے ٹرانسیور بند کر دیا اور جھٹ بیک سے سیٹلائٹ فون نکال کر اسے تھمایا۔

وہ خود ہی کتنی دیر کسی سے بات کرتا رہا۔ تھکا تھکا لہجہ ”نقابت اور پڑھو گی سے آنکھیں موندے“ وہ

یقیناً ”شدید کرب کے عالم میں تھا۔“
 ”ویدر کنڈیشن کا امکان اگلے اڑتالیس گھنٹے تک کوئی نہیں ہے۔ خدایا۔“ فون بند کر کے اس نے پریشے کو تھمایا۔

وہ وہ دن اس سوری اور موسم میں گزارا کر سکتی مگر افق۔ اس نے پھر سے احمد سے رابطہ کیا اور اسے تمام حالات سمجھائے۔

”اب کچھ کرو احمد! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔“

”میں کچھ کرتا ہوں تم فکر نہ کرو۔“

”کیسے فکر نہ کروں؟ وہ۔ وہ سر ہٹے گا احمد۔ خدا کے لیے کچھ کرو ورنہ وہ مرنے کی شدت پر لگی۔ اسے رونا آ گیا۔“

”میں کیا کر رہی؟“ اس کے رونے پر وہ پوچھا۔
 ”یہاں پر کیمپ کے چرے اور شغل کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔“

”کسی بھی اتھارٹی سے بات کرو کہ وہ ہمیں یہاں سے رہسکیو کریں۔ الپائن کلب آف پاکستان سے کوئٹہ میں رہنے والے کوئٹہ شہری آف ٹورازم سے کوئی سے خدا کے لیے۔“

”میں کچھ کرتا ہوں۔ تم میری کال کا انتظار کرو۔“ احمد نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پریشے کچھ دیر سوچتی رہا پھر اس نے دوبارہ احمد کو کال کیا۔

”احمد! سنو! تم پاکستان آری سے بات کرو۔ ان سے کہو کہ کلائمرز کو evacuate کرنے کے لیے پہلی کاپی بھیجیں۔“

دوسری جانب تھوڑی دیر کے لیے خاموشی پھا گئی۔

”ڈاکٹر پریشے! کیا باقی ایٹمی نیوٹر انسان کا داغ بھی خراب ہو جاتا ہے؟“

”کیوں؟ کیا غلط کہا ہے میں نے؟“

”میری بات غور سے سنو۔ اس وقت پوری دنیا میں کوئی ایسا پائلٹ پیدا نہیں ہوا جو ہمیں ساڑھے ساٹھ

ہزار میٹراٹ سے رہیں کیونکر سکے۔ اس سے پہلے کہ ہمساری انرجی اور بہت جواب دے دے تم نیچے اترنے کی کوشش کرو۔ یہی تمہارے مسئلے کا واحد حل ہے۔“

”میرے استاد مت بنو اور پاکستان آری سے بات کرو۔“

اس نے ریڈیو رکھ دیا اور افق کو دیکھا جو سر جھکائے یوں شکست خوردہ سا بیٹھا تھا کہ جیسے سارا حوصلہ اور بہت ہار چکا ہو۔

”افق! پریشے نے دھڑکے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے گردن اٹھائی۔ ”کیا بہت درد ہو رہا ہے؟“

اس نے آہستہ سے گردن کو نفی میں جنبش دی۔ ”میں زبرد تو نہیں ہو رہا۔“ اسے چٹا درد ہو رہا تھا یہ اس کی شدید آگہیوں میں خراب تھا۔

”کیا نیچے اتر سکتے ہو؟ کم از کم کیمپ قہری تک؟“ بغور اس کے چہرے اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے یوں سننے سے پوچھا جیسے کوئی ڈاکٹر سامنے بیٹھے چھوڑے ہوئے اس کی طبیعت پوچھ رہا ہو۔

اس نے خاموشی سے گردن کو نفی میں جنبش دی۔ ”جند میں نہیں۔“

اس نے افق کی اس ٹانگ کے ساتھ؟ تو نیچو! اس نے سر لفٹی میں ہلایا۔ وہ پورے فقرے

”اپنا ہاتھ مجھے سرخاں مطلب جھک سکتی ہو؟“ پھر اس نے اس سیٹ میں جتنا ہو سکتا ہے ٹانگیں بازو ہلاتے رہو۔ گرم رہو گے اور فرو سیٹ پائٹ سے بچ بھی جاؤ گے۔“ وہ خود بھی یہی کر رہی تھی مگر افق ویسے ہی خاموشی سے بیٹھا خیمے کی سامنے والی دیوار پر نگاہیں جمائے جیسے کچھ سوچتا رہا۔

پھر کتنی ہی دیر گزر گئی اور احمد نے کوئی رابطہ نہ کیا۔ طوفان ابھی تک اسی طرح راکا پوشی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ باہر مسلسل اگلے پڑنے کا شور مچا دے رہا تھا۔ پریشے نے خیمے کی کھڑکی سے جھانکا۔ دیر گزر گئی آؤٹ تھا۔ وزیب ایٹمی محض ایک میٹر

رہ گئی تھی۔
 رات گھٹ کے نہیں دے رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں سے بھاری تھا۔ وہ دونوں اسی طرح بغیر کوئی بات کہنے خیمے میں بیٹھے رہے۔ پریشے کو احمد کی کال کا انتظار تھا۔

”وہ یقیناً“ اتھارٹیز سے رابطہ کر رہا ہو گا جس کے باعث اسے درہوری ہے۔“

وہ خود کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ تمام زبانی یاد سورتیں اور آہستہ انگری وغیرہ پڑھ رہی تھی مگر طوفان نہ تھا۔ وہ شہروں میں آنے والا طوفان نہیں تھا۔ وہ ہمالیہ کا snow storm تھا جو بغیر رکے کئی دن تک جاری رہ سکتا ہے۔ قاتل برقانی طوفان اور مکمل وائٹ آؤٹ۔

اچانک ریڈیو میں شور سا پیدا ہوا۔ وہ اس کی جانب لگی۔

”ہیلو احمد؟“ وہ بے تلی سے بولی۔

”ہاں ڈاکٹر۔ سنو میں نے ترک گورنمنٹ سے بات کی ہے۔ انہوں نے تمہارے فارن مینسٹر سے رابطہ کیا ہے۔“

”پھر؟“
 ”ہاں وہ کہہ رہا ہے کہ آری سے بات کر سکتے۔“
 ”کب کرے گا وہ آری سے بات؟ پلیز احمد تم خود آری سے بات کرو۔ مجھے ان حکومتی اہلکاروں پر بھروسہ نہیں ہے۔“

”تم میری پوری بات کیوں نہیں سنتیں؟ میں اوھر بیٹھا جھک تو نہیں مار رہا۔ اب اپنا منہ بند رکھو اور میری بات سنو۔ میں نے سوئس پائلٹس سے سب سے پہلے رابطہ کیا ہے جنہوں نے ابھی ایورسٹ پر ریسکیو آپریشن کیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر رہے ہیں مگر ان کی فلائمنس کا پرابلم ہے۔ ان کو تین سے چار دن لگ سکتے ہیں اور۔“

”مگر افق کے پاس تین سے چار دن۔۔۔ سوری تم بات مکمل کرو۔“

”تم بھی نا! اچھا سنو۔ سوئس کا آٹا مشکل ہے مگر

تھمارے فارن میسٹر نے پاکستان آرمی سے رابطہ کیا ہے۔ میں اتنی دیر تک آرمی والوں کی کل کا انتظار کرتا رہا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے ان سے میری بات ہوئی ہے۔ انہوں نے تمہارے ریڈیو کی فریکوئنسی پوچھی ہے اور تمہارے کپڑوں کا رنگ وغیرہ اور یہ کہ تم انگریزی بول سکتی ہو یا نہیں۔ میں نے کہا کہ بول سکتی ہو ٹھیک کہانا؟

”تو میں تم سے فریج میں بات کر رہی ہوں کیا؟“
”جی نہیں میرا مطلب ہے وہ تمہاری آرمی ہے۔ تم ان سے اپنی زبان میں بھی بات کر سکتی ہو۔“
”اچھا وہ کب آئیں گے؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”آج میں گئے کیا مطلب؟ وہ ابھی تم سے رابطہ کریں گے۔ ہر کام آرام سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اوقت صرف تمہاری طرف سے رومی سے گزر رہا ہے۔ ڈنن پر تو بیٹھ کی طرح بھاگ رہا ہو گا۔“

پھر چند مزید باتیں کر کے اس نے ریڈیو رکھ دیا اور گھر کے گھرے سانس لیتے ہوئے تھکاوٹ سے افق کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ بہت اداں تھی۔

”وہ ابھی آجائیں گے، تمہیں بس چند قدم چل کر پہلی کاپڑ میں جانا ہو گا۔ چل اوگے نا؟“ اس نے ہولے سے افق کا ہاتھ تھپتھپایا۔
”چل لوں گا اگر وہ آئے تو؟“

”کیا مطلب اگر وہ آئے تو؟ وہ ضرور آئیں گے۔ تم باؤس مت ہو۔“ وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی۔ اس نے ہولے سے سر جھٹک کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔

رات قطرہ قطرہ بھیگتی رہی پچھلاڑی ہواؤں کی ناقابلِ برداشت بلند آواز مسلسل اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ بمشکل چند گھنٹے سو سکی۔ صبح کے قریب اس کے ریڈیو نے اسے پکارا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اسے علم ہوا کہ تیز برفانی ہوا اسے خیمے کے اندر ہی اندر ادھر ادھر لڑھکاتی رہی تھی اور اب وہ خیمہ ورازی تھی۔

ایک پاؤں خیمے سے باہر جا رہا تھا اور دوسرا ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پاؤں اندر کیا اور ریڈیو اٹھا کر گھر سے لگایا۔

”کم ان ایکسیڈنٹیشن ٹیم۔ دس از آرمی ایوی ایشن۔“ آواز تھی یا نئی زندگی کی نوید اس کی جیسے تمام جھلکنی اڑ گئی۔
”آئی ایم ہیر سر۔“ اس نے ریڈیو کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”ڈاکٹر پریشے جہاں زیب آر افق ارسلان؟“
”بھاری رعب دار آواز میں پوچھا گیا۔“

”پریشے جہاں سب۔“
”دس از کرنل فاروق ڈاکٹر جہاں سب۔“

”آئی سر۔“ وہ خوشی سے کہنے لگا۔ وہ یقیناً اس کو بچانے آ رہے تھے اور پہلی کاپڑ میں بیٹھنے سے اس کی دلچسپی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے سوچا۔
”اوکے ایوی یور اسٹیشن پریشے۔“

”ہم نے ایک ٹنٹ چھ کر رکھا ہے جس کا رنگ اورج ہے یہ کمپ ٹھری سے خاصا اوپر ہے۔“ وہ اب اردو بولنے لگی۔

”اور جہاں اب کے کپڑوں کا رنگ۔“

”میں نے پتک اور لائٹ گرین جیکٹ پس رہی ہے۔ میرے ساتھی کی گرے جیکٹ اور ویڈیو براؤن ٹراؤزر ہیں۔ سرریلو ہیڈلٹ ہے اور۔“ وہ انا رنگ کی لیلی رکھنے لگی۔

”اوکے اب مجھے اپنی لوکیشن دیں ٹھیک ٹھیک۔“

پہاڑ کی ڈھلان اور فیس کا ہینکل بتائیں۔“
وہ بتانے لگی پھر وہ بولے۔ ”اوکے اب آپ میری بات غور سے سنیں ہم جلد ہی آپ کو اپنے آجائیں گے۔“

اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔ ”آجائیں گے؟ آپ کا مطلب ہے آپ آئیں گے؟“

”طوفان بہت شدید ہے ڈاکٹر پریشے۔ ورنہ میں نہیں ہے۔“

”تو جب طوفان رکے گا تب تو آپ آجائیں گے نا؟“ وہ کسی امید کا سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔
”جی بالکل۔ اب آپ بتائیں تقریباً کیا ایجنسی ٹیوڈ ہو گا آپ کا؟“ اس نے فوراً میسٹر دیکھا۔ ”7437“

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی پھر ریڈیو سے آواز ابھری۔

”تو پھر آپ بول کریں کہ کم از کم ساڑھے انیس ہزار تک آجائیں۔“

”میں ساڑھے سات ہزار پر ہوں“ آپ انیس ہزار کی بات کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
اب اسے کوفت ہونے لگی۔

”میڈم! آپ انیس ہزار ٹنٹ تک ڈسٹنڈ کر لیں۔“

فاروق نے کرنل فاروق مجھے میسجز میں بتائیں۔“
وہ جھنجھکی اٹھی۔

”اوکے آپ تقریباً چھ ہزار میسٹر تک نیچے اتر آئیں۔“

پریشے نے غصہ بھری نگاہ میں دیکھا۔
”کرنل! میرا کتنی ”شدید“ زخمی ہے۔“

اس نے کمر لگاتے ہوئے اس سے ہڑھ قدم نہیں چلا سکتا اور آپ سے کہہ رہی ہیں کہ میں ایک زخمی کو لے کر ہڑھ ہزار میسٹر سے اتروں؟ آریو ٹنٹ آف۔“

”دیکھیں پریشے! اچھ سو اچھ ہزار میسٹر سے اوپر دنیا کا کوئی پہلی کاپڑ نہیں آ سکتا۔ ہم آپ کو اسی صورت میں سکیو کر سکتے ہیں کہ طوفان رک جائے اور آپ ڈسٹنڈ کر لیں۔“

”مگر میرا ساتھی زخمی ہے۔ وہ نہیں چل سکتا۔ اور آپ نہیں آ سکتے نیچے میں نہیں جاسکتی میں کروں تو کیا کروں؟“

افق نے اس کے ہاتھ پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھ کر اسے اپنا غصہ دہانے کا اشارہ کیا مگر وہ شدید فرسٹولڈ ہو رہی تھی۔

”طوفان ختم جائے تو آپ کوشش کریں۔“ کرنل صاحب کا لہجہ اتنا پرسکون اور ٹھنڈا تھا کہ پریشے کو لگا وہ اس معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

”انہیں کہو میں کوشش کرتی ہوں اور ڈسٹنڈ کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔“ افق کی ہدایت پر اس نے وہی کام کر رابطہ منقطع کر دیا اور ریڈیو فرش پر رکھ کر اسے دیکھا۔

”عجیب بے حس لوگ ہیں کوئی اوپر مہربا ہے اور انہوں نے رٹ لگا رکھی ہے کہ نہیں آ سکتے، نہیں آ سکتے۔“ وہ ہر دہائی۔

”وہ واقعی نہیں آ سکتے وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں جانتا تھا وہ نہیں آئیں گے میری پوری زندگی اہلیہ میں گزری ہے اس لیے تمہیں کہا تھا اگر وہ آئے تو میں چل لوں گا چھ ہزار میسٹر سے اوپر ہوا اتنی تکی اور دھند اتنی شدید ہوتی ہے کہ پہلی کاپڑ وہاں نہیں آ سکتا۔“ وہ آہستگی سے کہتا اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو پھر ہم نیچے کیسے اتریں؟ میں کیا کروں؟“ وہ بے حد پریشان تھی۔

وہ کتنی ہی دیر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا پھر بالآخر چند قدم ہٹ کر اس کے نزدیک آیا اور اس کے بالکل مقابل بیٹھ کر اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میری بات غور سے سنو اور جو میں کہوں ویسے ہی کرو تمہیں یاد ہے پری! میں نے تمہیں ایک دفعہ بتایا تھا کہ میری ہاں بہت بہادر ہے۔“

وہ بھی کتنی ہی اسے نیچے اترنے کے کسی منصوبے اور حکمت عملی کے متعلق بتائے گا مگر وہ نہایت غیر متعلقہ بات کر رہا تھا۔

”ہاں مجھے یاد ہے مگر اس وقت۔“

”میری ہاں بہت بہادر ہے پری! اس نے اپنے تئیں جوان بیٹوں کی موت کا غم سہا ہے۔ اس کے بیٹوں کے بعد ان کے بچے اس کے پاس ہیں اور وہ ان میں بہت خوش اور مگن ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے افق! مگر کرنل صاحب کہہ رہے

ہیں کہ ہمیں۔۔۔

”یقین کرو پری! میرے ماں باپ کے پاس دوسری سنی مصروفیات ہیں۔ وہ خود کو زندگی کے جھمیلوں میں گم کر سکتے ہیں اور ان کے لیے یہ مشکل نہیں ہو گا۔“ اس نے جیسے پریشے کی بات سنی ہی نہیں تھی اور یہ نہیں کون سے قصے لے کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ الجھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”تمہاری نو بہنیں شادی ہے۔ تمہیں اس کی تیاری کرنی ہوگی۔ نشاء تو نہیں مانگی مگر شاید تمہاری پچھو تم سے بہت محبت کرتی ہوں اور تمہارے پیلا بھی تو ہیں نا۔ ان کی زندگی میں ایک واحد رشتہ تم ہو پری! میرے ماں باپ کی اور بات ہے۔“ وہ رک رک کر ہنسنے لگا۔ ”میرے ماں باپ عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور بھی ہیں مگر تم اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔“ ایک دم پریشے کے لا شعور میں خطرے کا الارم بجا۔

”تم۔۔۔ تم کھل کر بات کرو افق!“

”پری! یہ سب صرف اور صرف میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں تمہیں اس جگہ پھنسانے کا ذمہ دار ہوں۔“ کیونکہ میں نے جلدی ٹرن اراؤنڈ نہیں کیا۔ ورنہ اس وقت تم میں یکپ میں ہوتیں۔“ وہ پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”خیر افق! میں تو خود۔۔۔ تم ہم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ اس طرح بات کیوں کر رہے ہو ہاں؟ اگر مل فاروقی نے کہا ہے کہ ہم جیسے ہی ڈیڑھ ہزار میٹرؤسٹنڈ کریں گے وہ ہمیں لینے آئیں گے۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ان کو کہوں کہ میں کو شش کرتی ہوں۔“ اس نے اسے یاد دلایا۔

”تم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔“ میں نے ٹھیک کہا تھا۔ تم کو شش کر کے ڈسٹنڈ کر سکتی ہو۔“

اس کے لیے میں کچھ تھا جس پر وہ بری طرح جوگی۔

”تم؟ کیا مطلب ہے تم؟“ اس کو اب کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

”پری! تم نیچے جاسکتی ہو۔ تم نیچے چلی جاؤ۔“

”افق!“ پریشے نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا۔

”خدا کے لیے پری! جذباتی مت ہو۔ میری وجہ سے خود کو خطرے میں مت ڈالو۔ تم نیچے چلی جاؤ۔“ چلی جاؤ۔

وہ سانسے میں رہ گئی۔

”تم افق! تم۔۔۔ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس برفانی طوفان میں چھوڑ کر اکیلا چھوڑ کر یہاں سے چلی جاؤں؟“ وہ بے یقینی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں تم چلی جاؤ۔ پلیز چلی جاؤ۔ وہ اس کی نہیں آئیں گے۔ وہ چھ ہزار میٹر سے اوپر کسی ایسی جگہ پر آئیں گے تم یہ یہ۔۔۔ میری فکر نہ کرو۔“

”تمہیں چھوڑ کر؟ اس۔۔۔ اس ٹینٹ میں چھوڑ کر؟“ وہ حیران تھی بے یقین تھی۔

”میں نیچے نہیں جاسکتا پری! میں کبھی بھی نہیں جاسکوں گا۔ میں جانتا ہوں میں مری جاؤں گا اور اگر تم میرے لیے اوھر رہیں تو تم بھی مری جاؤ گی۔“

تمہارے نیچے اس کے لوگ ہیں جو تمہارے لیے نہیں رہ پائیں گے۔ تمہارے باپ کے اور بچے نہیں ہیں۔ پریشے! میرے لیے اپنی اور خود سے جڑے لوگوں کی زندگی خطرے میں مت ڈالو۔ تم بہت سے لوگوں کی جانیں بچاؤ۔“

”تم۔۔۔ تم میرا۔۔۔“

”جیسے ازل سے علم تھا کہ میری موت پہاڑوں میں ہی آئی ہے۔ میں نے ہالیوڈ میں ہی مرنا ہے۔ میرا کیا ہے پری! میرے لیے کوئی نہیں روئے گا۔“

اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑایا۔

”تم۔۔۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟ میں اتنی خود غرض ہوں کہ جس ہوں کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟ بلکہ تم تو۔۔۔ تم تو افق مجھے سمجھتے ہی نہیں ہو تم تو مجھے سمجھ ہی نہیں سکتے۔“

کی آواز آنسوؤں سے رندھنے لگی ”کیا سمجھ کر تم

مجھے یہ سب کہا؟ تمہیں لگتا ہے تمہارے کئے پر میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟“

”پانگل مت ہو اور چلی جاؤ۔ خدا کے لیے چلی جاؤ۔“

یہ سب میری غلطی تھی میں نہیں ملے گی۔

”لایا تھا۔ پھر ایوانچ کے بعد تم نے میری پچائی“

میری کچھ نہیں کر سکتی۔ اس سے زیادہ ہالیوڈ سے

”تم تو مجھے سمجھ ہی نہیں سکتے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری

کے لیے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار

دہلی تھی۔ اس نے راکا پوشی سے ہار مان لی تھی۔

سامنے دیکھتی رہی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ سورج کیس سے بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ آسمان پر سیاہ بادلوں اور آسمان سے ذرا نیچے برفانی طوفان کا راج تھا۔ روشنی بس اتنی تھی کہ وہ شدید دھند میں محض پچاس میٹر تک دیکھ سکتی تھی۔ برف ابھی تک گر رہی تھی مگر رات کی طرح کا شدید وائٹ آؤٹ نہیں تھا۔

کشتی ہی وہ برف میں اسی طرح ہاتھ باندھے سہاگت چلیوں سے پلکیں پھیلے بغیر سامنے دیکھتی رہی جیسے دھند برفباری اور طوفان میں کوئی جیتتی جاتی مگی کھڑی ہو۔ اس کی ٹوپی ہوا کے باعث اڑ کر دو کڑور گر گئی۔ ہرٹا گرنی برف اسے سفید کرتی رہی مگر وہ اسی طرح کھڑی دھند میں دیکھتی رہی۔ دھندنا اس کے عقب میں دھیمی آہٹ ہوئی۔

بہت مشکل اور شدید تکلیف کے عالم میں وہ ski pole کا سہارا لیے چل کر رہا تھا۔ اس سے اسے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا اور طوفانی ہواؤں کی چٹکھاؤ کی آواز کے باوجود اسے اس کی ہر قدم رکھنے کے ساتھ لیوں سے نکلنے والی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بے شکل چلا لنگڑا اس کے قریب آیا مگر پریشہ گردن کو جنبش دے بغیر سامنے دیکھتی رہی۔ اسے گال پر افق کے طمانچے کی حرارت اور دور ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد کچھ کے بغیر اسے دیکھا رہا پھر اس کی نگاہیں پریشے کے چرے سے پھسلتی اس کے اڑتے پاؤں پر جا گھس گئیں۔ اس نے ارد گرد متلاشی نگاہیں دوڑا کر کچھ ڈھونڈنا چاہا پھر جس طرف اس کی ٹوپی گری تھی وہ اس طرف بڑھنے لگا۔

پریشے نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا جو لنگڑاتے ہوئے بدقت ایک ٹانگ پر زور ڈالے چل کر ٹوپی کے قریب گیا جھٹک کر ٹوپی اٹھائی اس پر لگی برف جھاڑی اور اسے لے کر واپس پریشے کے قریب آنے لگا۔ تب اس نے محسوس کیا کہ وہ دایاں پاؤں قدرے ٹیڑھا کر کے رکھ رہا تھا جیسے اس میں بھی تکلیف ہو۔

”اسے پس لو۔“ اس نے ٹوپی اس کی جانب بڑھائی۔

اس نے جیب جاب ٹوپی تھام کر سر پر پہن لی اور پھر محنتی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اگر تمہیں لگتا ہے کہ مجھے پھپر بار کر مجھ پر چیخ چلا کر مجھے خود سے متفر کر کے تم مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کرو گے تو تم غلط ہو۔ میں تمہیں کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں حناوے نہیں ہوں افق ابیں پریشے ہوں۔“

افق نے خاموشی سے سر کو اثبات میں ہلایا۔ ”اب چلو اندر۔“ اس نے ڈیٹا۔ وہ سر جھکائے اس کے آگے چلتا ہوا اندر رخسے میں داخل ہوا۔ ”بٹھو اور اب اپنا جوتا اتار کر مجھے دیکھاؤ۔“ وہ دوبارہ ٹیک لگا کر ٹانگیں سجھائی پھیلے پینے کا تودہ حکم دے گئی۔

”میرا پاؤں ایک سے کچھ نہیں ہوا۔“

”میں نے جو کہا ہے وہ کرو جو کرانا۔“

”مگر میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔“ اس نے جھپٹ پر یوں ہاتھ رکھ دیا جیسے کوئی چھوٹا پتہ اپنی کوئی غلطی چاہنے کی کوشش کرتا ہے۔

”یہ فیصلہ کرنے والی میں ہوں کہ تم ٹھیک ہو یا غلط۔ مجھ سے آگے بحث مت کرو اور جو کرنا۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ میرا پاؤں ٹھیک۔“

اس کے چرے پر زور سے سپر بار۔

”پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ اپنے سامنے بڑھاتے ہوئے موبیض زہر لگتے ہیں ڈاکٹر کے سامنے خاموش رہا کرو۔ اب اتار لو اپنا جوتا۔“ افق نے حیرت اور بے یقینی سے ہاتھ سے ریشہ ہولے سے چھوا جیسے کچھ محسوس کرنے کی سی ہو۔ پھر اس کے تاثرات حیرت سے مدھم مسدود میں بدل گئے۔ اس نے خاموشی سے سر ہلایا مسکراتے ہوئے جو گر کا تمہ کھولا۔ پریشے نے کہیں کچھ برابر کر دیا تھا۔

اس کے پاؤں کا انگوٹھا زخمی تھا۔ ناخن ٹوٹ چکا تھا اور خون جما ہوا تھا۔ ناخن کے نیچے والی جگہ نیلی تھی۔ اسے یقیناً اس زخم کا علم تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہوگی افق نے اسے آگاہ نہیں کیا تھا۔ ”مجھ سے یہ زخم چھپاتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آئی ہوگی؟“ اس کا زخم صاف کر کے پٹی کرتے ہوئے وہ طنز سے بولی۔

”بالکل نہیں آئی تھی۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اب پس لو جراثیم۔“ پٹی کر کے اس نے پھر حکم دیا۔ وہ بااعداری سے جراثیم پس کر یوس جڑھا کر کسے سے کرتے لگا۔ اس کے لیوں پر او اس مسکان رہ گئی تھی۔

پہلیں ہر حال میں نیچے کا سفر آج ہی شروع کرنا تھا۔ آج طوفان کا زور ٹوٹ جائے اور سورج نکل آئے پھر برفباری بھی ہو رہی ہو تب بھی ہم ڈھنڈک کر میں گے۔“ چوہے پر برف پھلا کر گر مپانی کا ایک کپڑا اس نے آدھا افق کے برتن میں اندھا اسے دیا۔ ”میں جراثیم ہوں تمہاری انگری شدید مگر تمہیں است کر کے اپنے لیے نہیں تو میرے لیے کرو۔“

گھونٹ ہو کر اسے افق نے لہجے میں سر ملایا۔ پریشے نے آخری بار اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ افق کے لیے۔“ وہ خاموشی سے پاؤں پر بار بار مار پڑا کر لکھانے لگا۔

پریشے نے گیس کی مقدار چیک کی۔ بس دو دن کی گیس بچی تھی وہ بھی صرف پانی بنانے کے لیے انہیں پر دھنڈے بعد آدھی پیالی پانی کی لازماً ضرورت ہوتی تھی اور نہ فروسٹ بانٹ کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ اڑھے سات ہزار میٹر پر ایک پیالی پانی دو گھونٹ گرم پانی تھوڑی سی گیس زندگی اور موت کے درمیان افق کرتی تھی۔

پاؤں بار ختم کر کے جانے کب وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا، کچھ بھی نہیں چلا۔ وہ اپنے خیالات سے چوکی تو

اسے اسی پوزیشن میں اونگھتے دیکھا۔ ابھی کچھ گزورے پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے مگر وہ کتنا بیمار گزور اور پرہیزگار لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت زردی مائل سفید پڑی تھی۔ اس کا زلی خلقت سنہری پن اور سرخی آج اس کی رنگت میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ باہر برفانی طوفان شور مچاتا رہا اور وہ خاموشی سے اسے سوتے دیکھتی رہی۔ نیند میں وہ کبھی کبھی ہلکا سا کھاس دیتا۔ چہرے پر واضح کرب رقم تھا۔

اسے افق پر بے پناہ ترس آیا۔ اس کی ٹانگ یقیناً اتنی دکھ رہی تھی کہ اس کا عزم محو صلہ اور ہمت جواب دے گیا تھا۔ اس کو علم ہو چکا تھا کہ وہ مرجائے گا مگر مرتے مرتے بھی وہ اپنی آخری سانسیں اسے کرنا چاہتا تھا اس کو وہاں سے بھیجا چاہتا تھا۔

وہ اس کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس چھوٹے سے خیمے میں محض اس کی زندگی بچانے کے لیے نہیں بیٹھی تھی۔ بلکہ وہ محض جو سامنے بیٹھے بیٹھے سوچتا تھا وہ محض اس کی پوری زندگی تھا۔ بعض لوگوں کی زندگی آپ کے لیے اہم ہوتی ہے۔ ان کے بغیر رہا جاسکتا ہے اور بعض لوگ آپ کی زندگی ہوتے ہیں ان کے بغیر صرف مر جاسکتا ہے۔

اسے افق سے پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ وہ تو شاید اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پری نے اسے کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا جب اس نے اسے پھپر مارا تب بھی اس کا ایک لمحے کو بھی دل نہیں چاہا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس کے باہر نکلتے ہی اس کے پیچھے آگیا تھا۔ اظہار نہیں کرتا تھا مگر محبت کرتا تھا۔ کشتی عجیب خاموش محبت تھی دونوں کی۔ ایک دوسرے کو چاہنا بھی ہے اور بتانا بھی نہیں ہے۔ کیا ایسے بھی کسی نے محبت کی ہوگی؟

برف باری ہوز جاری تھی۔ سورج ٹھیک سے طلوع نہیں ہو پا رہا تھا جیسے کیا وقت ہوا تھا۔ غالباً صبح کے اولین گھنٹے تھے۔ اس نے ریڈیو اٹھا کر سلسلہ میں

کیمپ سے جوڑا۔

”احمت! ہمیں آج رات تک ہر حال میں ڈیڑھ ہزار میٹر ڈیسٹنڈ کرنا ہے۔ مگر میرے پاس صرف اسی میٹر لمبا rope ہے۔ باقی چودہ سو میٹر میٹر میں کس طرح ڈیسٹنڈ کروں گی، کچھ بتاؤ۔“ اس کی آواز میں ٹھکن غالب تھی۔ وہ کوئی سپر مین تو نہیں تھی کہ اعصاب جواب نہ دینے لگتے، مگر صرف اور صرف اس ایک شخص کے لیے اس نے خود کو ٹوٹنے سے روک رکھا تھا۔ وہ افق کو مرنے نہیں دے گی، اس نے عہد کر رکھا تھا۔

”میں کلا ٹمبر نہیں ہوں ڈاکٹر! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے تم نے جو رسی پہلے لگائی تھی وہ کہاں گئی؟“ وہ برف میں دب چکی۔ ضائع چلی گئی اگر ہوتی بھی تو کیا فائدہ تھا۔ اسے بھٹک کر دوسرے راستے پر آچکے ہیں۔ تھوڑا سا بارش کی طرف اور اب مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ میں اسی میٹر رسی سے ڈیڑھ ہزار میٹر کیسے ڈیسٹنڈ کروں؟“

”کچھ کرو۔ کچھ سوچو۔“

”یہ ڈھتھ زون ہے۔ جوتوں میں کڑی پکڑیں چڑھانے کے لیے بیس منٹ سوچنا پڑتا ہے ڈیسٹنڈ پالیسی کے متعلق کیا سوچوں بھلا؟“ اس کا دماغ سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا تھا۔

”افق کیسا ہے؟“

”پاؤں میں ایک اور زخم آیا تھا۔ ابھی صاف کر کے پٹی کی ہے۔ اب سو رہا ہے۔“ اس نے ایک نظر سوتے ہوئے افق پر ڈالی۔

”اچھا۔“ وہ ہنس دیا۔

”خسے کیوں؟“

”افق کو پچھلی دفعہ ناٹنگاریٹ پر ایولانچ نے 480 میٹر نیچے چٹا تھا۔ آٹھ آدمی ایک ہی رسی پر تھے۔ ایک گرتا تو سارے جاتے، مگر سارے بچ گئے۔ صرف افق کو پاؤں میں موج آئی۔ اس کا پاس کہتا ہے، تم بے عزتی اور ایولانچ پروف ہو۔“ وہ ہنس دی۔

”یقین کرو ڈاکٹر! اگر تو پاس کا پاس افق کے پاس

کا دوست نہ ہوتا تو اب تک اس کو شوٹ کر چکا ہوتا۔ مگر اس دفعہ افق نے پاس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ راکا پوشی کی چوٹی سے کنکور ڈیا اور بلتورو کی چوٹیاں دیکھ کر واپس آجائے گا اور پھر کبھی پہاڑوں میں نہیں جائے گا۔“

”میں نے راکا پوشی کی دیوار سے وہ تمام چوٹیاں دیکھ لی ہیں اور یقین کرو، مجھے ان کے دیکھنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ وہ زندگی سے زیادہ حسین نہیں ہیں اور اب مجھے زندگی کو دوبارہ چھوٹا ہے۔ دعا کرنا، ہم زندہ واپس آجائیں اور ہاں، سنو وہ کرنل فاروق کدھر ہیں؟“

”یہیں بیس کیمپ میں ہیں۔ آج سارا دن یہیں رہے۔ دور بینوں سے تمہیں ٹھونسنے کی کوشش کرتے رہے۔“

”انہیں کہنا ہم رات تک ڈیسٹنڈ کرنے کی کوشش کریں گے اور پاپا کی ای میل تو نہیں آئی؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”آئی تھی کہہ رہے تھے کہ ارسہ کی ڈھتھ کی خبر اخبار میں بڑھی ہے۔ تمہارے لیے سخت پریشان ہیں۔ میں نے تمہیں جھوٹ بچ ملا کر تمہاری طرف سے مکمل خیریت کی اطلاع دی ہے۔“

”ہست اچھا کیا اور فی بیس کیمپ پہنچ گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ تو ادھر نہیں آیا۔“

پیشے کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔

”تو پھر پھر وہ کہاں گیا؟“ وہ پریشان ہو گئی، وہ نیچے نہیں اتر آ؟“

”نیچے تو وہ دودن پہلے ہی آ گیا تھا۔ پھر کریم آباد واپس چلا گیا میں سمجھا تم اس کے دوبارہ آنے کے متعلق پوچھ رہی ہو۔“

”احمت! تم نے میری جان نکال دی تھی۔“ اس کا دل احمت کا سر پھوڑنے کو چاہا تھا۔

پھر کتنے ہی پل گزر گئے۔ طوفان رکانہ آہستہ ہوا۔ آسمان ویسا ہی سفید اور دھندلا تھا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ اگر زیادہ رسی ہوتی تو وہ دونوں طوفان

بھی نیچے اتر سکتے تھے مگر افق کی زخمی ٹانگ کے بعد سب سے بڑا مسئلہ رسی کا تھا۔

افق اسی طرح سویا ہوا تھا۔ اس کی جیب سے کچھ سرخ سا جھانک رہا تھا۔ پریشے نے ہاتھ بڑھا کر اس سرخ کپڑے کو کھینچا۔ وہ افق کا ترکی کے جھنڈے والا مقرر تھا۔

وہ یونسی مقرر کو دیکھ کر "سوات اور کلام کے مرغزاروں میں گزرے مل یاد کرتے ہوئے اسے ہاتھوں میں لپیٹتے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ مقرر سے کھیلتی رہی۔ یہ وہی سرخ جھنڈا تھا جو افق کو راکا پوشی پر لہراتا تھا۔ پریشے چولی پر رکھنے کو اپنی ہاں کی تصویر لیا لی تھی۔ پاکستان کا جھنڈا وہ کیمپ ٹو میں ہی بھول آئی تھی۔

مقرر لبا سا تھا۔ اس نے اس کے دونوں سرے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیے یوں کہ وہ ڈھل ہو کر آدھا ہو گیا۔ اب اس نے بائیں ہاتھ سے وہ جگہ پکڑی جہاں سے وہ آدھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کس کر پیچھے مقرر لمبی سیدھی لیکھیں گيا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑا ایک سرا چھوڑ دیا اور اسی ہاتھ میں موجود دوسرا سرا کھینچا۔ پورا مقرر اس کے ہاتھ میں آگیا اور اب وہ مستقل ہو کر دوبارہ لبا ہوا گیا تھا جبکہ بایاں ہاتھ وہیں ہوا میں خالی رہ گیا۔

"اوہ خدا یا۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "میں کتنی استویڈ ہوں۔ مجھے پہلے کیوں نہیں خیال آیا۔ افق افق اٹھو۔" وہ مقرر چھوڑ کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھانے لگی۔ وہ ہڑبلا کر اٹھ بیٹھا۔

"چاد جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے مجھے سمجھ آگئی ہے کہ ہمیں کیسے نیچے اترنا ہے۔"

"کیسے؟" وہ حیران پریشان سا اسے دیکھنے لگا۔

"آنکھیں پتیند کے باعث ابھی تک بو جھل ہیں۔"

"ہم rappelling کر کے اتر سکتے ہیں۔ رسی کو ڈبل کر کے۔ میرے پاس 80 میٹر لبا سا ہے۔ اس کو ڈبل کر کے اتر سکتے ہیں اٹھو جلدی کرو۔"

تمام سالانہ بند کر کے وہ اپنی ہار نہیں سے افق کی

ہار نہیں کو باندھنے لگی۔

"بیک ہٹنا ہے تمہارا؟" افق نے یونسی پوچھا۔

پریشے نے استغراب انداز میں سر جھٹکا۔ "نہیں سب کچھ چھوڑتے اور پھینکتے جاتے ہیں صرف ہار باندھنے کے لیے۔ وہ چولی پر پہنچ بھی جاتے ہیں کیمپ وہاں سے اپنے قدموں پر پلٹتے ہیں تو ان کے پاس ہار نیچے جانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے کیمپ کی مدد سے رسی کو اس کی ہار نہیں سے بک کر کے کاٹ کر نکل کر لیا اور اپنے رک سبک کو اٹھائے "افق کو سارا دسیے ایک کندھے پر رسی کو اسٹیک کر کے ڈالے یا پھر نکل آئی۔"

اسے برستے طوفان میں کھلم کر رہا تھا۔ ایک ایک سے وزنی مرد گاؤں کی طرف بھاگتا تھا۔ وہ کوئی بارہ۔ چھوٹی سوئی لٹکا میں تھی وہ اس کے پاس دوڑتی تھی ایک ایک کھینچا۔ جم میں وہ ڈھیلے ہوا کسی کی کالونی میں جو گریڈین کر رہا تھی پھرتی تھی۔ وہ بھاگتا تھا اور وہ یہ کر سکتی تھی اس کے باوجود کہ اس نے ایک دن سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ مگر اسے افق کو بچانا تھا اس کو ہر حال میں وہاں سے نکالنا تھا۔ وہیں سے کے قریب اس نے پھر میں ہاں باندھ کر ایک تلاش کیا اس میں تقریباً ایک انچ تک لی ٹون کا بلڈ کھبوا اس کو ٹیپ سڈنگ سے باندھا پھر رسی سے گلاب کیا اور کھینچا۔ کھنچاؤ سہی تھا۔

اس نے رسی کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیے اور افق کو لیے اترنے لگی۔ رسی اب ڈبل ہو کر چالیس میٹر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں تقریباً چالیس میٹر نیچے اترے پھر پریشے نے رسی کا ایک سرا چھوڑ کر دوسرا سرا زور سے کھینچا۔ پوری رسی اس کے ہاتھ میں آگئی جبکہ لی ٹون اس برف میں لگا رہ گیا۔ اب جہاں وہ اتری تھی وہاں اس نے بیک سے دوسرا لی ٹون نکال کر نصب کرنا شروع کیا۔

برفانی ہوا میں اوپر سے نیچے چل رہی تھیں۔ سو کنڈیشن سخت خراب تھی۔ افق مسلسل کراہ رہا تھا۔

اس نے سنا تھا کہ مزید برداشت کر سکتا تھا۔ مسلسل برف سے پریشے سے بھی لی ٹون کاڑے نہیں جاتے تھے۔ شروع کے چند کھٹے افق خود چل کر اترتا تھا۔ وہ بھی ہر حال انسان تھا اس کی ہمت جواب دے گی۔ سب اسے پریشے سہارا دے رہا تھا۔

"پلیز افق! ہمت کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔"

اس پریشے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ "وہ لی ٹون گاڑتی ہے ہمت دلا رہی تھی۔

چوٹی سے مت کرو۔ مجھ میں۔ ہمت نہیں میں تمہارے سر میں یہ لی ٹون مار دوں گی اگر تم اب اتر کر کی۔ چپ کر کے اترتے رہو۔" وہ اترتی۔ اترتی کے دوران ہونے والے تمام حالات اس کے سامنے اس کے ذہن میں گروش کر رہی تھی۔ کہ لی ٹون زیادہ تر حادثے (خصوصاً کے ٹور) اس کے ذہن میں ہوتے ہیں وہ تو پھر ایک زخمی کے ہاتھ میں اس کی سکت بھی نہیں تھی۔

برف پر تڑپ رہی تھی اس کی رفتار تھنی ہو جاتی رہی وہ دیکھنے بغیر اترتے رہے۔ راکا پوشی کی چولی کو بادل سے بوندے ہوئے ہوا میں تیرتے چلے جا رہے تھے۔ کوئی لی ٹون بھی جا رہا تھا۔ اس نے جھٹ جاتا تو ہر بار جھتی دھند ان کی بات کا دوسرا حال تھا۔

اس کا ہاتھ تھا مگر کسی شام سی سی تھی۔ وہ ہند سے اترتا تھا۔ اس کی گلشہر گلا سڑ دھنکی ہو رہی تھی۔ اسے بار بار رک کر انہیں صاف کرنا پڑتا۔ افق سڑ کے بغیر اتر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم مروں کی طرح ادھ کھلی تھیں۔ وہ شدید تکلیف میں تھا اس کی ہونٹ ہونٹ تھیں اور شدید سردی کے باعث اس کا دم خراب ہو رہا تھا۔ مگر جانے کیسے وہ برداشت کر رہا تھا واقعی ہمارا انسان تھا۔

"بس ہمت کرو افق! ابھی ہمارے پیچھے ہی کرنل راک اپنا پہلی کا پڑ لے کر آتا ہے گے ہیں چند گھنٹوں کی بات ہے۔" وہ بمشکل سانس لیتے افق کی ہمت بڑھا رہی تھی۔

ایک جگہ وہ گلشہر گلا سڑ صاف کرنے کی توافق زور سے کھانسا۔ اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجا رہا تھا۔

مگر حد شکر کہ وہ لیڈی نہیں، تھوڑا سا جنکس کا پرابلم تھا۔ لیڈی ہوتا تو بھی ہمالیہ کی پلندیوں پر پانی کے بعد دوسرا "آب حیات" اس کے پاس میڈیکل کٹ میں تھا۔

Dexamethasone کی سرنج جو لیڈی کے خلاف واحد ہتھیار تھی اور پانی سے بڑی آب حیات تھی۔

راکا پوشی پر دھیرے دھیرے شام اترتے لگی۔ ان کے اطراف میں موجود یونسی گل سیاہ اور سفید پہاڑ دھند کے پیچھے خاموشی میں ڈوبے تھے۔ ہزاروں میٹر نیچے دلکش داؤیاں پھلتی تھیں۔ وہاں فرید کا کریم آباد بھی تھا جس کے باسیوں کو علم بھی نہ تھا کہ وہ وہ نفوس شام کی نیلگوں روشنی میں اترتی کا سفر۔ زندگی کا سفر کر رہے ہیں۔ آئے دن کوہ پیادوں کے مرنے کی خبریں مل رہی جالیا کرتی تھیں۔ کریم آباد کے باسیوں کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

پھر اندھیرا پھیلنے لگا۔ ان کو اس سفر میں جتنی دیر ہو چکی تھی اس میں کوئی آدمی لاہور سے پنڈی جا کر واپس لاہور بھی آسکتا تھا اور ان سے ابھی تک ایک کلو میٹر نہیں ملے ہوا تھا۔ جو سفر صاف موسم میں وہ چند گھنٹوں میں کر سکتے تھے۔ وہ اب تین گنا زیادہ وقت لے رہا تھا۔ وہ بار بار میٹر چیک کرتی مگر سوئی ابھی چھ ہزار کے بند سے اوپر تھی۔

دلچسپ طور پر انہوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ بڑ پھر سے جاگ اٹھا۔ برہماری میں شدت آگئی اور بالاخر افق کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اترتے اترتے وہیں برف پر تڑپا ہوا سا ہو کر گر گیا۔

"نہیں اور نہیں۔ تم بے شک جاؤ میں اور نہیں۔" طویل سانس لیتا وہ بے ربط جملے کہتا برف پر رہا تھا۔ پریشے نے پریشانی سے ہو کر میٹر دکھا۔ 6320 میٹر۔

"بس ڈھانکی سو میٹر اور افق۔"

"نو نیور۔ تم جاؤ۔ مجھے۔ مجھے اوہر ہی مرنے

دو۔ میں اور نہیں جاسکتا۔ وہ اکثرتی سانسوں کے درمیان نفی میں سرھلاتے ہوئے انکار کر رہا تھا۔ وہ جگہ بالکل vertical تھی جیسے کسی ٹکون کی ایک سائیڈ ہوتی ہے یا جیسے کسی چھت کی پہلی منڈیر۔ چند قدم آگے بڑھتے تو نیچے گر جاتے۔ وہاں تو خیمہ بھی نصب نہیں کیا جاسکتا تھا۔

طوفان ہرگز رتے بل وحشی ہو رہا تھا۔ برقی ہوا بڑیوں میں گھسی کر خون منجمد کر رہی تھی۔ مگر افق اُدھر سے ایک اونچے نیچے نہیں اترنا چاہتا تھا۔ پریشے نے بھیج کر رہی کو اپنے ہاتھ میں کر لیا اور فولڈ کر کے ایک کندھے پر ڈال لیا۔ اب اسے خیمہ گاڑنے کو جگہ ڈھونڈنی تھی۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پریشے تھی جو گھوڑے سے ڈرتی تھی؟

اس نے افق کو برف میں دونوں اطراف سے رسی گزار کر باندھ دیا۔ ایک اور ڈھیلا سا prusik بھی برف کی دیوار میں نصب کر دیا تاکہ وہ نہ گرے۔ اس کی وہ سیٹھی گروپ کا کھنچاؤ چیک کر کے وہ خیمے کی جگہ ڈھونڈنے کی خاطر اندھیرے اور طوفان میں گھٹنوں کے بل برف پر crawl کرتی اوھر اوھر آگس ایکس مارٹے ہوئے کوئی پلیٹ فارم تلاش کرنے لگی۔

کم بصارت گہری سفید ماری کی کور بڑیوں کو کھاتی سرزدی اس کو چند ہی منٹ بعد واپس افق کے پاس لے آئی۔ وہ اس خطرناک سلوپ پر زیادہ دور نہیں جاسکتی تھی۔ اگر اسکاٹ فشر نے کہا تھا کہ ہمالیہ میں اندھیرا آپ کا دوست نہیں ہوتا تو بالکل درست کہا تھا۔

وہ ویسے ہی دیوار کے ساتھ بندھا بیٹھا تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں گردن کندھے پر جھکی گئی چہرے پر بڑھی شیو میں برف کے ذرات چھپنے تھے۔

وہ تھک کر اس کے بالکل ساتھ گھٹنوں کے بل دو زانو بیٹھ گئی۔ طوفان کا ناقابل برداشت شور اس کے کانوں کے پروے پھاڑ رہا تھا۔

”یہ سواچھ ہزار میٹر ہے“ آئی تھنک پہلی کا پڑا دھر آسکتا ہے۔ ”رک رک کر ہاتھ ہوتے وہ بولی۔ افق

نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

”افق؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کا کندھا ہلاتا مگر اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔

”افق؟“ اس نے پھر پکارا۔

”ہوں؟“ بہت پست آواز میں اس نے جواب دیا۔

بھرا۔ پریشے کو سکون ہوا۔

”دروہو رہا ہے؟“

”نہیں۔“ اس کی آواز سے ہی دروہ نہیں تھا۔

”بس تم فکر مت کرو۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔“ افق کے بائیں جانب بیٹھی اس کا پایاں بازو منجمد ہونے سے پکڑے ہوئے تھی۔ وہ سہارا لے رہی تھی کہ

سارا لے رہی تھی وہ اندازہ نہ کر سکی۔ آگے سیاہ سفید تھا۔ وہ رکت وخت پہلی تھی۔

جائے نہیں کرک آئے؟ اس نے سر پر بندھے رک میک میں سے رسی نکالا۔

”کم ان میں کمپ۔“ ہاتھ اتنے منجمد تھے کہ انہیں نہیں دیا جا رہا تھا۔

”آئی ایم ہینئر۔“ احمیت کی آواز غوغائی مارتی تھی۔

”احمیت ہم آواز ڈسواچھ ہزار میٹر ہیں۔ یوں کہ میری کرٹل فاروق سے بات کراؤ۔ میں انہیں آواز دے دوں گا۔“

اس فاروقیہ نے اپنے پریشے کو لگا اس نے غلط سنا ہے۔

”کہاں چلے گئے؟“

”واپس۔ اسکرود!“

پلٹو رو کا پورا گلیشئو اس کے سر پر چٹا تھا۔ گنگ سی ریڈیو کو دیکھنے لگی۔

”وہ۔ وہ کیسے چلے گئے؟“ انہوں نے تو اسے اس نے تو ہمیں دھسکھو گرتا تھا۔ وہ کیسے؟“ اس کے اواز سے الفاظ ادا نہیں ہو پارہے تھے۔ قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ موسم خراب ہے۔ کوئی ادا

ی پر ابلم تھا۔ آئی ڈوٹ نہ تو۔ بس صبح ہی صبح وہ واپس آئے تھے۔“

جب پہلی بار پریشے کو احساس ہوا کہ وہ اس برفباری طوفان میں کھلے آسمان تلے ایک زخمی کے ساتھ تھا تو اسے کہہ۔

”احمیت! وہ کیسے جاسکتے ہیں؟ ہم نے ان کے کہنے پر سنا کیا اور وہ۔۔۔ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیوں اس کا بل پھوٹ پھوٹ کر روئے کو چاہ رہا تھا۔ وہ

اب جھ قٹ کے لیے چوڑے مرد کا وزن اٹھائے جانے کے لئے پھاڑکی ڈھلوان سے نیچے اترتی رہی تھی وہ

کے جو صدیوں پر بھاری تھے اور اب احمیت کہہ رہا

دو چلے گئے؟“

”تم حوصلہ مت ہارو۔ ہو سکتا ہے وہ صبح تک آجائے۔ تم نے تو لے آنا زیادہ سفر نیچے کو کیسے کیا؟“

”اس کو اسے کر کے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”تم مارا اور ہوتا ہے۔“ وہ زور سے چلائی۔

”بچہ پر کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ میں اوھر میں کمپ آگیا پڑا۔ دن اس شخص کا پوشی کا برقیلا

گھٹا رہتا ہے۔ شاید اسے زیادہ سفر کر رہا ہوں

”تم غلط سوچ رہی ہو۔ غلط بات کہہ رہے ہو۔“ وہ

سے سو رہی کرنے کے ان پر تھا ہوئی۔

”تم غلط سوچ رہی ہو۔ غلط بات کہہ رہے ہو۔“ وہ

”جیسے منہ یہ پتہ ہی نہیں ہے؟ خدا کے لیے احمیت

میں حالات بہت خراب ہیں۔ برف کی کنڈیشن بہت

کسی سے بات کر سکتا تھا، کر چکا تھا اور بہت کم وقت میں اس نے فوج تک سے رابطہ کر لیا تھا مگر یہ ایسی ٹیوڈ کا اثر تھا یا شدید احساس ہے۔ ایسی خود ترسی کہ پریشے کو لگ رہا تھا، احمیت اور پاکستان آرمی دونوں اس کے معاملے میں دلچسپی نہیں لے رہے۔ غصہ نکالنے کو وہ ریڈیو واپس بیک میں رکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

”پاکستان آرمی سے اتنا نہیں ہونا کہ۔“

”پاکستان آرمی نے ہماری منت نہیں کی تھی کہ۔“

خدا کے لیے اگست میں راکا پوشی کا ٹیمب کرو۔ یہ ہماری غلطی تھی ہم خود اوھر آئے تھے وہ ہمارے لیے جتنا کر سکتے تھے کر چکے۔ اس سے زیادہ وہ۔“ تیز تیز

بولتے ہوئے وہ کھانسنے لگا، کھانسی رکی تو دوبارہ برف سے کمر بکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ شاید وہ خالص پاکستانی تھی تب ہی بہت جلدی شدید بدگمان ہو جاتی تھی۔

وہ دونوں ابھی تک کھلے آسمان تلے برف کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہر بل گرنا درجہ حرارت

مسلل جاری طوفان اور برفباری سے بچاؤ کے لیے انہیں شیشو چاہیے تھا۔ وہ شیشو کہاں سے حاصل

کرے یہ سوچتے ہوئے اس نے پیچھے برف کی دیوار سے کمر نکالی۔ اس ایسی ٹیوڈ پر سوچنا انتہائی گھٹن کام تھا

مگر جیسے ہی اس کی کمر پیچھے برف سے مس ہوئی اس نے بے اختیار گردن گھما کر پیچھے دیوار پر جمی برف کو

دیکھا۔

یہ تازہ پڑی برف تھی مگر اس کے پیچھے بھی یقیناً

ڈھیروں برف تھی۔ اس وقت اسے آسمان سے گرتی برف سے پناہ لینی تھی اور یہ پناہ اسے صرف ایک چیز

دے سکتی تھی اور وہ تھی دیوار پر جمی برف۔

سارے دن کی تھکاوٹ کے باوجود وہ نئے سرے سے دیوار کی طرف پھیر کر آگس ایکس زور زور سے برف میں مارتی ہوئی اسے کھودنے کی کوشش کرتے لگی۔ کچھ برف ٹوٹی کچھ سفید ذرات اڑ کر اس کے چہرے اور بالوں میں آ پختے۔ وہ پوری قوت صرف کرتے ہوئے دیوار میں سرنگ بنانے لگی پورا

دن افق کو سارا دینے کی مشقت کے باعث اس کی کمر شدید درد کر رہی تھی۔

وہ اسی طرح دیوار سے بندھا، آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور پیٹھے پیٹھے سوچ رہا تھا یا پھر شاید اپنی نیند میں تھا جب پریشے نے اسے جگایا۔

”اٹھ جاؤ۔ میں نے ہم دونوں کے لیے ایک ضرورت پارٹمنٹ تیار کیا ہے جس کا دیو بے حد حسین ہے۔ ذرا موسم ٹھیک ہو تو اس سے پورا قراقرم نظر آتا ہے۔ اب ہمیں اس میں شفٹ ہونا ہے۔ دیکھو اور یاد رکھو کہ میں کتنی اچھی آرکشیٹیکٹ ہوں۔“ یہ وہ پہلی خوشگوار بات تھی جو اس نے انتہائی ناخوشگوار ماحول میں کسی اور افق کی رسیاں کھولنے لگی۔ ”یوں لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں اغوا کر کے اوہر پاندھ رکھا ہو۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس دی۔ وہ نیم فنوڈگی کے عالم میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے لگا تھا کہ پریشے کا دلخ پل گیا ہے۔ کہاں وہ اتنی پریشان ہو رہی تھی اور کہاں اس کی حس مزاج ایک دم جاگ اٹھی تھی۔

وہ افق کو یہ نہیں جانتا سکتی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح خود کو اور اسے اس ظالم پہاڑ کے اوپر چڑھنے کی چادر میں کھود کر بنائے گئے اس پھولے سے سوراخ میں زندہ رکھنا تھا۔ ہنس کر نہیں تو رو کر۔ رو کر نہیں تو ہنس کر۔

برف کی عمودی دیوار میں اس نے سرنگ بنائی تھی، ویسی جیسے سی ٹی اسکین کے لیے مریض کو سرنگ میں سے گزارا جاتا ہے۔ وہ اتنی تھی کہ دو آدمی اس میں کمر کا کرنا ممکن سامنے پھیلائے بیٹھ سکتے تھے۔ برف سے انسان کو صرف برف بجاتی ہے، جیسے ہیرا ہیرے کو کانٹا ہے۔ چونکہ برف کی تاثیر گرم ہوتی ہے اس لیے برفانی غار یا ice cave کسی بھی Goretex کے نیچے سے زیادہ گرمائش فراہم کرتا ہے۔

اگر ان کے پاس دو سیلینگ ویگز ہوتے تو اسے غار کھودنے کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ دونوں کھلے آسمان تلے طوفان کے باوجود صرف

سیلینگ بیگ میں بھی گزارا کر سکتے تھے۔ غار ایک سیلینگ بیگ ایوانچ ان سے چھین چکا تھا۔ کافی دیر کی محنت سے تیار کیے غار میں اسے کئی سال خود دوڑاؤ ہو کر بیٹھ گئی اور اس کو لٹا دیا۔ افق کے ہاتھ غار کے دبانے سے کافی باہر نکل رہے تھے۔ یوں لگا جیسے وہ کسی اونچے ریفریجریٹر کے اوپر بنے ڈسپنسر میں رکھی ہے جس کا ڈسپنسر سامنے سے کھول دیا گیا ہے۔ وہ برفانی غار ایسا ہی تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ پرانے کھانے میں واپس چلی گئی ہو جب انسان غاروں میں پناہ لے رہا تھا۔ جب زخمیوں کے لیے مرہم نہیں ہوا کرتے تھے۔ جب تزیین کا کوئی وجود نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے اسے جلدی لیندے کی یاد آئی۔ خواب میں اس نے خود کو قحط زمانوں میں پایا تھا۔ کھانا نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایک زخمی سپاہی کو اپنے پیچھے پیچھی بیٹھی تھی۔ دشمن کی فوج ان دونوں کے تعاقب میں آرہی تھی۔ دوڑتے کھوڑوں کے ٹالوں کی بلند آواز اس کی سماعتوں میں ہتھوڑے پر سارائی گئی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ قحط زمانوں کا سارا عالم غائب ہو گیا۔ جس کو وہ کھوڑوں کی آواز سمجھ رہی تھی وہ طوفان کا شور تھا۔ وہ کسلندی سے قدرے سر ہٹا کر برفانی غار میں رات کی نسبت زیادہ گرم تھا۔ یہ برفانی غار اس کی سماعتوں میں گونجنے لگی تھی۔ یہ تھا کہ اس نے اپنا سر کسی چھوٹے سے پاندھ کی طرح پریشے کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور مہری نیند میں سکون نیند سوٹا وہ واقعی معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔

باہر طوفان کے شور میں اس کے کان کسی اور جگہ کے سننے کے متنبی تھے۔ پہلی کاپڑ کے پردوں کی غار کی گونگڑا ہٹ، آرمی ایوی ایشن کے سبز پٹی کا ڈھلوان، جھلک ہی اس کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ ”وہ آتے ہی ہوں گے۔“ کھوجتی نگاہوں نے دور تک دھند میں دیکھتے ہوئے وہ خود کو تسلیم کر لیا تھا۔ ”مگر زمین“ سے انہیں بچانے کوئی نہیں آتا۔

دونوں جانے کتنے گھنٹے اس برفانی غار میں بڑے سردی سے ٹھنکے رہے۔ وہ غار اب جائے پناہ کم اور برفانی تابوت زیادہ لگ رہا تھا۔

افق اٹھ گیا تو اس نے جائے بنا کر خود بھی پی اور اسے بھی دی۔ جائے کیا تھی، بغیر شکر اور دودھ کے کڑوا توہ ساتھ۔ افق نے کب پکڑ کر کمینوں کے بل قدرے بیٹھ کر جائے کے تلخ گھونٹ اپنے حلق سے اتارے اور پھر کپ خالی کر کے سائیڈ پر ڈالا اور دوبارہ پریشے کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

پتہ نہیں کیا وقت تھا، کیا تاریخ تھی، کون سا مہینہ اور کون سی صدی تھی وقت کا حساب کتاب بھی اب بھولنا جا رہا تھا۔

”ای!“ افق نے اسے پکارا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے برفانی غار کی چند اچانک اور سفید چھت کو تنک رہا تھا ”سو رہی ہو؟“

”نہیں سو نہیں رہی یونہی تھک چکی ہوں۔“ وہ پیچھے کمر لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ ”میں جانا بچا۔“ کا شکر یہ۔ تم نہ ہو میں تو میں مر جاتا۔“

”اور تم کہتے ہو تو میں بھی مر جاتی۔“ وہ کمر لگ کر بٹھری۔ ”پھر کتنے ہی دن غار میں رہا ہو گا۔“ ”مہری؟ سو نہیں کیا؟“ ”میں نے پھر پوچھا۔“ ”نہیں۔“ ”اے!“

”پھر بولتی کیوں نہیں ہو؟ مجھ سے باتیں کرو، تاکہ مجھے لگے کہ میں اس برفانی تابوت میں اکیلا نہیں ہوں۔“ وہ ایسے کہتا اس وقت کوئی ڈرا سما بچہ لگ رہا تھا۔ اس حاضر جواب اور شوخ افق سے قطعاً مختلف جس سے وہ یونہی ایک شام مارگلہ کی پہاڑیوں پر ٹکرا گئی تھی۔ اسے اس پر بیک وقت پار بھی آیا اور روٹا بھی۔

”کیا بولوں؟ تمہیں درد ہو رہا ہے؟“ ”ہر وقت یہی کیوں پوچھتی ہو؟“ ”اور کچھ سوچتا ہی نہیں۔“ غار میں ایک دفعہ پھر خاموشیاں راج کرنے لگیں۔

وہ کافی دیر کچھ نہ بولا تو پریشے نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے، دونوں ہاتھوں میں ایک پھولی سی تصویر پکڑے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ حنادے مرچکی تھی، باوجود اس کے وہ تصویر افق کے ہاتھوں میں دیکھ کر اس کے کہیں بہت اندر درد کی لہریں اٹھی تھیں۔

”ہری!“ اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ ”تم نے کل یہ کیوں کہا کہ میں نے تمہیں حنادے سمجھا؟ تم نے تمہیں میں نے بھی حنادے نہیں سمجھا۔ تم پریشے ہو، تم حنادے ہو ہی نہیں سکتیں۔“ ”اب وہ بے ربط فقرے نہیں بول رہا تھا۔ گرم جائے کی بخشی توانائی کا اثر تھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ اسے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ اب افق کو ہی سب کچھ بتانا تھا۔

”جانتی ہو، لوگ کے ٹوک Savage ماؤنٹین۔ (سفاک پہاڑ) کہتے ہیں، بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“

وہ ایسا ہی ہے۔ وحشی اور ظالم میں انورسٹ نہیں، راکا پوشی نہیں، کے ٹوکا عاشق تھا۔ کے ٹو جسے قراقرم میں بسنے والے جھگوری بولتے ہیں۔ اور اب میرے لیے اس کا نام بولنا بھی تکلیف ہے۔

وہ کہتے کہتے کھانسنے لگا۔ کھانسی رکی تو پھر سے کہنے لگا۔ ”حنادے میرے بچا کی بیٹی تھی۔ بہت خوبصورت، بہت پرلہک اور بہت آرنٹھنٹھل اس کی پرلہکشن کے متعلق تو تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ہمیشہ شپ ٹاپ میں رہتی تھی یعنی سنووری، فیل میک اپ میں۔ وہ بہت سیکور اور آزاد خیال تھی۔ یہ ہمارے درمیان پہلا قرق تھا۔ کیونکہ میں آزاد خیال نہیں، روشن خیال ہوں اور بھی کئی فرق تھے۔“

وہ جیسے ذہن پر زور دے کر یاد کر کے بتا رہا تھا۔

”ہمارے خیالات کبھی نہیں ملے۔ وہ مجھ سے بہت اختلافات کرتی تھی۔ (غالبا) ”افق“ بہت لڑتی تھی، کہنے سے احتراز برت رہا تھا۔ وہ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جنہیں بات ”نہیں“ سے شروع کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی، ہماری شادی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ امریکہ سے آئی تھی، اور واپس وہیں جانا چاہتی تھی، مگر میں ترکی اور اپنے پیرش کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔“

شادی کے وہ دو سال میری زندگی کے بدترین سال تھے۔ اس میں ایک اہم کردار احمیت دوران کا بھی تھا۔ احمیت کو بچپن سے بھانڈا پھوڑنے کی عادت ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا خیال ہو کہ وہ بہت معصوم، بے وقوف اور سیدھا ہے۔ حالانکہ میں اسے پہچانتا تھا۔ ہمیں سال سے جانتا ہوں۔ وہ میرا ہمسایہ ہے اور بہترین دوست بھی۔ احمیت حقیقت میں استہالی تیز اور عقل مند ہے۔ وہ جان بوجھ کر بھانڈا پھوڑتا ہے۔ میری اور جینک کی اس سے لڑائی ہو گئی تو اس نے جھٹ ڈاکٹرز کو پشیر آنسرز کے متعلق بتا دیا۔ اس دن دیکھا نہیں تھا، ہم نے اس نے ذرا اکٹا کر بات کی اور میرے جانے کے بعد اس نے فوراً ”تمہیں پیڑ کی اصلیت بتادی۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ شکل پر بھول پن

ہونے سے کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا۔

ہاں زندگی میں صرف ایک دفعہ احمیت کے غیر ارادی طور پر ایک بات حنادے کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ”قراقرم اور ہالیو کی بریوں کی بات اس نے بعد میں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگی، مگر کھانسنے ہو چکا تھا۔ حنادے نے بریوں کی بہتوں کے متعلق جاننے کے بعد کبھی مجھ پر اختیار نہیں کیا۔ وہ اچھے شخص تھے۔“

طوفان کا خوف ناک شور ہنوز جاری تھا۔ اس کی آواز اس شور کے باعث دھیمی لگتی تھی۔

”پھر شادی کیوں کی تھی اس سے؟“

”میری ماں کی خواہش تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایک کلاسروں، تو صرف ایک کلاسروں کے ساتھ ہی خوش رہوں گا۔ حنادے بہت زبردست شخص ہیں۔ کلاسروں میں اس سے پہلے میری زندگی میں صرف ایک کی آئی تھی، میری اسٹول فیلوڈی۔ مجھے گمان کڑا تھا کہ وہ میری آئیڈیل ہے، اس کے ساتھ چھوٹا سا انفر بھی چلا، مگر وہ میری آئیڈیل نہیں تھی۔ تو کئی ایک کرش تھی۔ میں کوئی بہت اچھا فلمی ہیرو نہیں ہوں، جس کی وجہ سے اس سالہ زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہو۔ چھوٹے موٹے ایشورز تو ہر انسان کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ پھر حنادے آئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنی زندگی میں ناکام ہو گیا ہوں تو مجھے شادی کر کے مارل انسانوں کی طرح بن جائے۔ وہ کہنے لگی کہ میں اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ وہ بہت مری و خفی تھا، اب تک ہماری عیادت کی ہو چکی ہوتی، اور میں اس کے لیے حساس نہیں ہوں، بس میں اس کا ذکر اچھا یا برا کرنا یا سنتا پسند نہیں کرتا۔“

برفانی غار میں ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔

”افق۔“ کچھ دیر بعد وہ بولی۔ ”کے ٹو پر کیا ہوا تھا؟ تم دو سال پہلے اوھر حنادے کے ساتھ کے ٹو سر کر کے آئے تھے نا؟“

کتنی ہی دیر وہ خاموش رہا، اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور کربور آیا تھا۔

”برفانی طوفان آیا تھا۔ وہ بھی ڈسٹنڈ کے دوران کے ڈسٹنڈ بہت مشکل۔ بہت ہی مشکل۔ جتنے لوگ کے ٹو۔۔۔۔۔ سر کرتے ہیں۔ کم بہت کم واپس آتے ہیں۔ ایک تہائی واپس آتے ہیں۔ کے ٹو نے کرنا بڑا کام نہیں۔ اسے صبح کر کے واپس آنا بڑا کام ہے۔“ وہ پھر کھانسنے لگا۔ اس کے فقرے بے ربط اور بے تھک کئی دیر بولنے کے باعث اس کی توانائی ختم ہوئی جا رہی تھی۔ ”وہ کے ٹو کا طوفان تھا۔ اور سٹ، نانگا پرست، براؤ پیک، راکا پوشی، سب کا طوفان ایک سا ہوتا ہے۔ مگر کے ٹو کا طوفان بہت برا ہوتا ہے۔ میرا بچہ کتنا تھا اگر کے ٹو پر طوفان آجائے تو اپنا سب کچھ برف پر پھینک دو اور بھاگو۔ اپنی زندگی بچے بھاگو۔ وہ طوفان بہت خطرناک تھا۔ ڈسٹنڈ کے دوران آتا تھا۔ میں آکسیجن کے بغیر کلا فمب کرتا ہوں۔ میرے سیریل ایڈما ہو گیا تھا۔ دلغ میں سو جن ہو گئی تھی۔ سو ایک آکسیجن کینسٹرو ساتھ رکھا ہوا تھا۔

میں اور حنادے ساتھ ساتھ تھے۔ اس کی آکسیجن ہو گئی۔ ایڈما سا تھا۔ مجھے آکسیجن کی ضرورت تھی۔ میں نے کچھ چہرے پر لگا رکھا تھا۔ وہ ڈسٹنڈوں تھا۔ اچھا، میں نے اسے چار سو میٹر سے بھی اوپر دن بھر کھانسنے کے لیے نہیں دیا۔ ایک کلاسروں کے ساتھ کرنا۔ حنادے کے آکسیجن کے لیے میں نے وہ میرا آکسیجن کے بھی ڈسٹنڈ کر سکتی تھی، مگر اس نے پھر بھی میرا مارک، میرا کینسٹرو اور ری ڈکٹر سب میرے چہرے سے توڑ لیا اور نیچے چلی گئی۔ وہ میری فیلو کلاسروں میں تھی، وہ میری بیوی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے ایسا کیا۔ میں بغیر آکسیجن کے تین گھنٹے برف پر رہا۔ کے ٹو کے طوفان کے دوران۔

حنادے نے کیمپ فور میں جا کر میرے متعلق بتایا کہ میں لاپتا ہو چکا ہوں۔ مجھے تین گھنٹے بعد اس مقام سے ایک دو سری میم ہوئی۔ کے ٹو نے اٹھایا اور مجھے لے آیا۔ گرم چائے اور ڈیکس کے انجیکشن لگائے۔ میرا ایڈما بدتر ہو رہا تھا۔ میں نیم مر رہا تھا۔ وہی

گائیڈ مجھے اٹھا کر چھ ہزار دو سو میٹر کے ڈاؤن پر لے کر آیا، جہاں بجر عاصم نے پہلی کاپڑ کے ذریعے مجھے پک کیا اور پھر نیچے زمین پر لے آئے۔ میرے دونوں ہاتھ باؤل فراسٹ ہائٹ ہو چکے تھے۔ نقصان صرف دو انگلیوں کو ہوا، باقی بچ گئے۔ بہت حیرت انگیز درد و جد کی تھی۔ عاصم نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ تمساری ملٹری، ہماری ملٹری سے بہت بہتر اور بہادر ہے۔ مجھے وہ کچھ نہیں بھولتے، جب میں برف پر گائیڈ کے ساتھ نیم بے ہوش رہا تھا۔ اور مرنے ہی والا تھا کہ دورانق میں سبز پہلی کاپڑ اڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ لحد میرا ”دوسرا جنم“ تھا۔ میں پھر سے زندہ ہوا تھا۔ عاصم میرا لیٹور میں دو دفعہ لیڈان آفسر رہا تھا۔ اس نے دوستی کا حق ادا کیا۔“

”اور حنادے؟“

”وہ ڈسٹنڈ کے دوران کیمپ تھری سے آگے ابو لالچ کا شکار ہو گئی۔ اس کی رسی تنک ٹوٹ گئی۔ کیونکہ ابو لالچ کا پوٹنٹنٹل بہت شدید تھا۔ وہ برف میں گم ہو گئی۔ اس دن کے بعد پھر حنادے کو کسی نے کے ٹو پر نہیں دیکھا۔ گنگھی میموریل قبرستان میں رکھنے کے لیے اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ لوگ کے ٹو کو سفاک ساؤنٹین کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ طویل سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

”تم خواب میں بھی ڈر جاتے ہو نا؟“

افق نے شدید کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

”میں خواب میں بھی نہیں چھوڑتے۔ میں ہمیشہ خود کو اس مقام پر دیکھتا ہوں، جہاں حنادے مجھے چھوڑ کر جاری ہو گئے۔ میں ہمیشہ اس سے اپنا آکسیجن کینسٹرو مانگتا ہوں، مگر وہ نہیں دیتی، پری، وہ مجھے میری آکسیجن نہیں دیتی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مجھے برف میں تھا چھوڑ کر وہ میری سانس لے جاتی ہے۔ جب مجھے خواب میں یہ سب آتا ہے تو میرا دل کرتا ہے میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ کیا کوئی اتنا بھی سفاک ہو سکتا ہے؟“

مجھے خاموشی سے سر کہتے رہے۔ باہر ہوتی برف

باری غار کا دہانہ بند کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ افق بار بار لوٹ مار کر گول دہانے پر آنکھی ہوتی برف گر آتا۔
 ”بس شام تک ہمارے ڈسٹ کے متعلق علم ہوتے ہی وہ آجائیں گے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“
 اس کی بے قرار حلاشی نگاہیں غار سے باہر نظر آنے والے دھند میں اپنے افق پر بھٹک رہی تھیں۔ انتظار کے لمحے طویل ترین ہوتے جا رہے تھے۔ دنیا کا سب سے کٹھن کلم انتظار کرنا ہے۔ راکا پوشی پر یہ اور بھی کٹھن تھا۔

”بس شام تک وہ آجائیں گے“ افق۔ ڈنٹ یووری۔“

پھر شام بھی ڈھل گئی اور ان دو بزرگ سیارہ بانوں پر رات اترنے لگی مگر جن کو آنا تھا وہ نہ آئے۔
 یقین ڈگر رہا تھا جو صلہ پست ہونے لگا تھا پھر بھی وہ اپنی اور اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی۔

رات گہری ہوتی چلی گئی۔ انہیں بشیر کچھ کھائے یہ تیسرا دن تھا جو اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ آگے ایندھن کی صرف ایک آخری بوتل بچی تھی جو اس نے یوں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی کہ جیسے ہفت اقلیم کے خزانوں کی کچی ہو۔ بس ایک دن کے پانی کی گیس۔

”باؤں کے زمین بھیج لی جائے اور سر سے آسمان پہنچے گئے تو کیسا محسوس ہوتا ہے مجھے آج علم ہوا ہے۔ جانے کب میں اس لطیف ہوائے ٹکڑوں کی اور خالص آکسیجن سے پُر ہوا میں سانس لے سکوں گی۔“ بریشے کے اعصاب اب جواب دینے لگے تھے۔ افق بند آنکھوں سے مسکرایا۔

”چار سال قبل مارچ میں میں نے ایورسٹ سر کیا تھا۔ موسم اتنا خوشگوار تھا کہ میری ایورسٹ کی فتح ایسے تھی جیسے کوئی رولر کوٹر پر چڑھے اور رائیڈ لے کر کالر جھاڑا اتر جائے۔ چوٹی پر میرے ہمراہ ایورسٹ کے نزدیک واقع شہر پاس گاؤں

Sherpas Village کا جو شہر آیا تھا اس کا نام باو شری شریا تھا۔ وہ اتنا تھا کہ چوٹی پر سنہری پریاں دکھائی دیتی ہیں۔ یقین کرو میں نے خود چوٹی پر کھڑے

ہو کر سنہری پریوں کو رتھ پر سوار، سورج سے چھوڑ لنگھائی چوٹی پر اترتے دکھا تھا۔ شاید وہ میرا وہاں جو بلند یوں پر ہوا کرتا ہے۔ پریوں کا رتھ دیکھ کر میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا تو باو شری شریا خاصا بڑھاپا ہوا اس نے چلا کر مجھ سے کہا۔

”تم اوپر زیادہ دیر نہیں کھڑے ہو سکتے۔ یہ تمہارا ٹھکانا ارارت نہیں ہے یہ ہمارا ساگر مانا ہے۔ دنیا کی دیوی ہاں۔ اس کی عزت اور احترام کرو۔“

اور میں نے واقعی اس کا احترام کیا۔ باؤ نے مجھے رتھ پیچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھائے جن پر بدھا کی عظمت کی دعائیں لکھی تھیں۔ وہ دعائیں باؤ کو بدھ مت کے بھکشوؤں نے دی تھیں۔ باؤ دو پوناؤں کے اعزاز میں ساگر مانا خاصا میں کھینچ کر لیا۔ اس نے مجھے وہ ٹکڑے سنا میں اچھا لگا۔

”ان شہر پاس شہر پاس“ منے کا انداز تھا۔ میں کوئی نوکریاں آدی ہوں نہ مجھے بدھ مت سے کوئی لگاؤ ہے پھر بھی وہ حال یہ کا کوئی برا سرا راتھ تھا جس کے باعث میں نے وہ ٹکڑے لیے اور انہیں ہوا میں اچھال دیا۔ وہ منظر بہت حسین تھا۔ ٹشو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہمارے سروں سے تقریباً پانچ چھ سو فٹ تیرتے بادلوں میں ٹھہر گئے زمین اور ہوائے درمیان سفید بادلوں میں ساکت سے ہو گئے۔ آج مجھے اپنا آپ ٹشو کے ان ٹکڑوں کی طرح لگ رہا ہے جسے زمین اور آسمان کے درمیان بادلوں کے ٹکڑے کے ساتھ سام رکھا ہو اور گرنے نہ دے۔

اس کی آنکھیں بند اور لب آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بہ وقت میں سکتی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو جیسے ساگر مانا کا ظلم لوٹ کر فضا میں بکھر گیا۔ وہ ایورسٹ سے واپس واپسی کی برف میں آگئی۔

”سو جاؤ۔ صبح پہلی کا پڑ کے آتے ہی تمہیں اٹھا دوں گی۔“
 افق کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی جیسے اسے پریشے کے اتنے پڑھیں ہونے پر ہنسی آئی ہو۔ پھر ہم

پہلے کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی جیسے اسے پریشے کے اتنے پڑھیں ہونے پر ہنسی آئی ہو۔ پھر ہم

یہاں ہوا کیلئے وہ فینڈ کی کیفیت میں ڈوبا چلا گیا۔ اس کے سونے کے بعد اس نے ریڈیو نکال کر اس سے رابطہ کیا۔

”کیسی ہو ڈاکٹر؟“ وہ غالباً اس کی کال کے انتظار میں سویا نہیں تھا۔

”پتا نہیں کیسی ہوں۔ میری ای سیلز تو پڑھ کر نکلو۔“

”اچھا سنو۔“ وہ لب لباب کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ پہلی تو میری دیوی سکتی کی ہے۔ لکھا ہے اچھی بیٹے جلدی سے پیچھے پیچھے جاؤ تاکہ میں کمپ میں موجود میرے شوہر پر نظر رکھ سکوں۔ مجھے ہمارے ہنوز کے اس پار کا فرستان کی عورتوں کے سر کے قصے افق نے سنا رکھے ہیں کہ وہ اتنی حسین ہیں کہ تمہاری زبان میں ان کے باعث ”کافران“ ”مناظر“ اور ”مراۓ حسن“ جیسی اصطلاحات رائج ہو چکی ہیں۔ میرا شوہر اتنا معصوم اور سیدھا نہیں جتنا تم کہتے ہو۔ میرا خیال ہے پاک آری کو 320 میٹر پر سے کھینچ کر آپریشن کرنے سے پہلے سرجیشن راکاوش میں کمپ میں بھی کرنا ہے۔

”پتا نہیں اس جرحے کی جلد اتنی ٹھیک ہو چکی کی کہ مجھے کچھ اور دیکھنا۔“

”میں تو میری طرف سے جواب دے گا۔“

”کیا لکھا ہے؟“

”تمہاری طرف سے اپنا کریکٹر سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ اور کیا؟“ وہ ہنسنا۔ ”اچھا یہ کسی سیفٹ الحلوک کی بھی ای میل آئی ہوئی ہے۔“

پریشے کے لبوں پر رقصاں مسکراہٹ خائب ہو گئی۔ سیف کو تو وہ ان تین دنوں میں بھلا بھی چکی تھی۔ ”کیا لکھا ہے؟“

”میں نے اور نڈا ایپا (ندا آپا) نے برائیڈل ڈریس پہن کر کے آرڈر دے دیا ہے۔ باری (بیری) کی ڈھیر باری شاپنگ بھی کر لی ہے۔ ریڈنگ کارڈز کے سیمپل

بھی سلیکٹ کر رکھے ہیں مگر کارڈز تو ناموں کے رہے تھے رمضان کے بعد ہی چھوڑائیں گے اور ہاں ناموں پر سوں کے بجائے ایک ہفتے بعد واپس آئیں گے۔ اچھا پلیز اب جلدی لینا ایڈوینس ختم کر کے واپس آؤ۔ یہ آنکھیں نہیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔

”تمہارا سیف۔“

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے صرف ”ہائے احسنت“ کہہ کر ریڈیو رکھ دیا۔

کئی دنوں بعد پہلی دفعہ اس پر یہ اور اک ہوا تھا کہ جسے وہ اتنا آسان سمجھ رہی تھی وہ ناممکن ہے۔ اگر اس کا خیال تھا کہ وہ افق کو پلاس سے ملوا دے گی اور وہ خوشی اس کی تین سال پرانی منگنی توڑ دینے کے تو وہ غلط تھی۔ وہ بھی بھی ایک سیکولر ملک سے آنے والے غیر ملکی کو اپنے گلے بھانجے پر ترجیح نہیں دیں گے۔ راکا پوشی سہ کرنا ایک ایڈوینس تھا جس کی اجازت دے دینا کوئی اتنی انوکھی بات نہیں تھی مگر منگنی ان کی عزت ان کی زبان کا معاملہ تھا۔ وہ اس معاملے میں سخت کنزرویٹو تھے۔ وہ کبھی بھی اپنی خوشی سے یہ منگنی نہیں توڑیں گے۔ اور وہ ان کی خوشی کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی خواہش اپنی محبت کے لیے اپنے باپ کو ان کے خونی رشتوں سے محروم نہیں کر سکتی تھی جو ان کی زندگی تھے۔

اور اس کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور وہ منگنی توڑنے کے متعلق سوچ رہی تھی؟ وہ ایسا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی اگر یار افق کے لیے بے دلی سے مان بھی گئے تو افق کبھی بھی ترکی نہیں چھوڑے گا اسے اس کے ساتھ ترکی جانا پڑے گا۔ پیچھے پایا اپنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی ویسے ہی اکیلے ہوں گے جیسے وہ اس وقت ان دیران پناہوں میں اکیلے پڑی تھی۔ وہ شخص اس کا باپ تھا وہ اس کو دکھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ برو کے خطرناک کلینیکل سروس سے لڑ سکتی تھی مگر وہ اپنے رشتے داروں کی منگنی توڑنے کے بعد کی ہمنامہ ”بلیک میلنگ“ سے ہار گئی تھی۔

رات کے اس پہر اس اندھیرے برفانی غار میں بیٹھے 'اسے' افق اور اپنے باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

اس نے ایک نظر اپنے گھٹنے پر سر رکھ کر بے خبر سوئے افق کو دیکھا جو نیند میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا تھا شاید اس کا زخم ناسور بننا جا رہا تھا اور اسے ناقابل برداشت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے ٹوپی پہن رکھی تھی مگر اس میں سے بھورے بال نکل کر ہاتھ پر پھرتے تھے۔ باہر چاند تھا نہ تارے غار میں روشنی نہ ہونے کے باعث وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کچھ عشق تھا کچھ مجبوری تھی۔"

وہ زیر لب بڑبڑاتی اور آنکھیں موند لیں۔ اس نے اپنا انتخاب کر لیا تھا۔

"تم مجھے بہت دیر سے ملے افق ارسلان! کاش پہلے ملے ہوتے۔" آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے۔



21 اگست 2005ء

کسی دھماکے کی آواز نے اسے جگایا تھا۔ وہ ہڑبکا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ برفانی غار میں بالکل تنہا تھی۔ اس کے گھٹے پر بوجھ نہیں تھا۔

"افق کہاں گیا؟ اور میرے اللہ! وہ پکرا کر رہ گئی۔ اور پھر بہت تیزی سے دونوں ہاتھوں پیروں پر ٹکی کی طرح رینگتی غار سے باہر نکلی۔

وہ غار کے دیانے کے دائیں طرف چند قدم دور بیٹھا تھا۔ اس نے زخمی ٹانگ برف پر لٹا رکھی تھی جبکہ بائیں گھٹنا سیدھا کھڑا تھا۔ کمر پر لٹی دیوار سے ٹکائے وہ بے اثر لگا ہوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

"تم اوپر کیوں بیٹھے ہو؟" اس کے ساتھ ویسے ہی وہ زانو کر بیٹھتے ہوئے اس نے فکر مندی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ برستی برف کے کچھ ٹکڑے اس کے پیروں، ٹوپی اور چھوٹی چھوٹی بھوری شیو میں ٹھہرے ہوئے

تھے طوفان برس برس کر اب گھٹنے کو تھام رہا تھا۔ برف بے حد خراب تھی۔ چند چند منٹ بعد اسے لانچز آرہے تھے۔ اب بھی اسے کسی گہرے گڑھے کی آواز نہ جگایا تھا۔

"نہیں بیٹھ سکتا۔ اس قبر میں۔ نو بہار۔ سو۔" اس کی سانس رک رک کر آرہی تھی۔ کل کے مقابلے میں آج اس کے چہرے سے چھلکی نکلتی تھی اور کمزوری میں اضافہ ہوا تھا۔ اب اس کی توانائی ختم ہونے کو تھی۔ وہ اندر ہی اندر مر رہا تھا۔

"تمہیں درد ہو رہا ہے؟"

"ہاں۔" اب وہ جھوٹ بول بول کر تھک گیا تھا۔ جانے کتنی دیر سے باہر آکر بیٹھا تھا۔ اسے نے پلیٹ کر ایک نگاہ بڑبڑائی۔ وہ واقعی برفانی غار میں ہے۔

"بس مت کرو۔" وہ بولی ہے۔ طوفان جتنے بھی ہو اسے سننے ہی میں لگے۔ "اس کی دھند میں وہ دور تک دیکھنے کی سعی کرتی آنکھیں کسی ہیلی کاپٹر کو نہ دیکھ پائیں۔ افق جواب دے یہ مناسبتاً بوجھل پوٹوں سے سامنے کود نکلتا رہا۔

صبح کی سفیدی سے قراقرم کے پہاڑ مشورہ ہوئے۔ اسے شکر ہوئی کی سرخ روشنی اور نمازت و بعد کے پردے میں پھپھ کر رہ گئی تھی۔

وہ غار سے دو آنکس اسکرپوز اور ایک Prusik اٹھا لائی اور افق کو اندھ دیا۔ خود کو بھی حفاظتی ریشمی محفوظی کی طرح لٹا دیا۔ وہ اس کے پیروں پر قلی ہوا میں اور برنس یاری ہنوز جاری تھی۔

دفعہ "اس کی نگاہ افق کے ہاتھوں میں پکڑے سرخ منظر پر پڑی۔ اس منظر کے ساتھ اسے جیتے جی بہت یاد آئے تھے۔ ماہو ڈھنڈ کے پانیوں پر رقص کرتی حسین بریاں، اشوکا پتھروں سے سرپختا پانی مری مالی روڈ پر آتر سے باہل۔ وہ سب اب صدیوں پرانی یاد لگتا تھا۔

اس لمحے گرتی برف اور کمر میں ڈوبے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ رواج کا یہ فاصلہ مٹا دے اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر خوب روئے آئے

روئے کہ اس کے آنسوؤں سے راکا پوشی کی ساری برف پگھل جائے اور پھر وہ تھک کر سو جائے اور جب جاگے تو ساری مشکلات، تکلیف اور پریشانیاں اس کی زندگی سے غائب ہوں۔ وہ چاہے تو وہ اپنے گھر میں ہو اور سوات جیسا ہشتا مسکراتا شوخ سا افق اس کے سر ہائے کرسی ڈالے بیٹھا ہو۔ مگر سوچ اور حقیقت میں کتنا فرق ہوتا ہے؟

اس نے اپنے منہ ہوتے ہاتھوں میں افق کا ٹھنڈا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کے ہاتھ دستاؤں کے باوجود اتنے خچ تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے برف کے تین ٹکڑے اوپر نیچے رکھے ہوں۔

"جب میں چھوٹی تھی تو ایک کہانی بہت شوق سے سننا لگتی تھی۔ اس کہانی میں حسین دادیوں اور فلک کی پہاڑیوں کا ذکر تھا، ہجری طویل راتوں کے بعد ملن کی شہر میں کاد کر تھا۔ ایک بہادر شہزادہ دنیا کے سب سے حسین پہاڑ کی چوٹی پر موندنے کے تجربے میں مقید ایک پری کو چھڑانے جاتا ہے جس کو ظالم دیو نے صدیوں سے اس شجرے میں قید کر رکھا تھا۔ دو سال کے دنیا کے نئے سے بھی پہلے سے وہ پری موندنے کی تلاشوں میں اس بار نگاہیں جمائے شہزادہ کو اس تک پہنچنے کی بجائے اس پہاڑ پر جاتا ہے اور۔"

وہ سن کر خاموش ہو گئی۔ اس اب گردن نہ اٹھا کر دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسی طرح دھند میں سامنے ہاراموش پرانی بڑی برف کو تک رہی تھی۔

"جب میں ایک ڈسٹرکٹ میں تھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں بابا کو بتائے بغیر اپنے بچپن کے ساتھ کیرا کے نو اسکول کے بچپن کے ساتھ سوئس مرعزار میں جایا کرتی تھی۔ میرا اور بابا کا سکرٹ تھا۔ ہم نے بابا کو اس کے متعلق کبھی آگاہ نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہوں گے اور میں بابا کو پریشان یا اپ سیٹ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اپنے رشتے داروں سے بہت محبت کرتے ہیں، انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مہما بیش میری اہمال بنا کرتی تھیں، اب ہوتیں تو ڈھال بن جاتیں مگر

وہ نہیں ہیں۔"

وہ اوجھری باتیں کر رہی تھی۔ وہ ہاراموش کی چوٹی کے قریب برف میں دلاڑ پڑ رہی تھی۔ وہ ہٹا پلک جھپکے اس کریک کو دیکھنے لگی۔

"فکر کیوں کرتی ہو؟ خود ہی تو کہتی ہو کہ وہ آجائیں گے جیسے ہالی ووڈ کے فلموں کے آخر میں پولیس آجاتی ہے۔ ہمیں بچا کر لے جائیں گے۔ پھر میں تمہارے بابا کے پاس جاؤں گا، وہ مجھ سے ملے گا۔" وہ بولی جاؤ گے؟" اس کی نگاہیں دراڑ سے نیچے ٹوٹتی برف پر تھیں۔

"تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتی ہو؟" وہ بہ وقت بول رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اب کچھ سننے کی حسرت نہیں رہی۔" دراڑ کے نیچے کی برف کے ٹکڑے ٹوٹ کر دور سے چند فٹ نیچے گرے اور پھر ساری برف سفید دھول میں تبدیل ہو کر تیزی سے ٹھیک میں گرنے لگی۔

"پری! پریشان مت ہو۔ ہم سب کو منالیں گے۔ پھر میں تمہیں ترکی لے جاؤں گا اور۔" وہ کھانسنے لگا۔

"مجھے خواب مت دکھاؤ افق۔" اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ "خواب نہیں دیکھتے چاہئیں۔ یہ ٹوٹ کر ساری عمر آنکھوں میں کرجیوں کی طرح ڈھبھکتے رہتے ہیں۔ آنکھیں زخمی ہو جاتی ہیں، صبح بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ مجھے خواب مت دکھاؤ۔" سفید دھول نے نیچے گرتے ہوئے ایک بڑا حصہ اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔

"پری! تمہیں۔"

"نہیں افق۔ ابھی تم صرف میری سنو۔ میں ساری رات ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ میں غلط تھی افق! انشاءً تم ہم سب غلط تھے۔ بابا نے دس لوگوں کے سامنے میری سنگینی کی ہے۔ میں وہ سنگینی تو ذکر ان کو دکھ نہیں دے سکتی۔ میں ایسا کوئی بیارشتہ نہیں بنانا چاہتی جس کی بنیاد میں پرانے رشتوں کی قبریں ہوں۔ میں

چکے تھے۔ لوگ کہتے ہیں، وقت نہیں ٹھہرتا، مگر جیسے تو باز ہو کر ماکر رہا تھا، بعض اوقات وقت بھی ٹھہر جایا کرتا ہے۔

22 اگست 2005

اس کے ذہن میں اندھیرا تھا۔ ساعتوں میں کیل آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی، مگر نگاہوں کے سامنے گہری تاریکی چھائی تھی۔ کمر کے پیچھے برف کی دیوار وہ محسوس کر سکتی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے تاریکی جھٹکنے لگی اور گہرا نیلا ہٹ بھرا اندھیرا ان میں بھرنے لگا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ اور پھر کئی دفعہ۔ منظر قدرے واضح ہوا تھا۔

سامنے دور دور تک پھیلے سلسلہ ”قراقرم کی چامش چوٹیوں کی برف نیلگوں روشنی میں چمک اٹھی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ دھند چھٹ چکی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر ستارے بکھرے تھے۔ جھلکاتے، ہر سو بکھرے تھے ستارے۔ پہاڑوں سے بہت اوپر بہت اوپر تیرتے بادلوں کے پیچھے سے نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔ راکا پوشی پر اتار رہی تھی۔

گھوٹے سر اور ٹکراتے ذہن کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ برف پر رکھے۔ گردہ اگا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ مشکل جھٹکنے پر زور دے کر کھڑی ہو پائی۔ اس کی ٹانگیں جھک کر سر میں ہو چکی تھیں اور دلخ پوری طعنہ مار رہی تھی۔

افتق وہیں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ جاگ رہا تھا۔ ریشے کو کھڑے ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ مسکرایا۔ جلد اتنی خشک ہو چکی تھی کہ مسکراتے ہوئے کھینچنے سے جگہ جگہ سے خون نکلتے لگے۔

ریشے نے بے یقینی سے خود کو اور اسے دیکھا۔ زخم تھی۔ وہ اب تک مری نہیں تھی۔ اور اب بھی شاید کسی کے پکارنے پر اٹھیں تھی۔ کس نے پکارا؟ اسے؟ اس نے سامنے پھیلے پہاڑی سلسلے پر دھاوا ڈالی۔ دوران پہاڑوں کے درمیان سے آواز آئی۔

زندگی میں چند لمحے ایسے آتے ہیں، جب وقت رک جاتا ہے، گھڑیاں جم جاتی ہیں۔

تب کوئی گزرا کھل اور کوئی آنے والا کھل نہیں ہوتا۔ تب صرف آپ ہوتے ہیں اور آپ کی تھالی۔

وقت کی تفریق اور حساب ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ عجیب سے timeless time میں پھنسے ہوتے ہیں، جو درحقیقت وہاں ہوتا ہی نہیں ہے۔

ان تھنوں میں پوری کائنات رک جاتی ہے۔ راکا پوشی پر بھی وقت ٹھہر گیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ نہ وہ سوچ جانتی تھی نہ وہ

وقت کا حساب رکھ پاتی تھی۔ کتنے گئے، کتنے آئے، کتنے رات کا کون سا پہر تھا، اس کی یادداشت نے کام کرنا ترک کر دیا تھا۔ ہاں بس اسے نیند آرہی تھی۔ وہ گہری میٹھی نیند

سوٹا چاہتی تھی، گہرا ایسے اپنے لبوں کی قید سے آزاد ہوتے الفاظ فضا میں تحلیل ہوتے سنائی دے رہے تھے۔

”سوٹا نہیں افق۔! سوٹا نہیں۔ اگر ہم سو گئے تو پھر کبھی نہیں جاگیں گے۔“

وہ سوٹا چاہتی تھی، نیند، اور وہ سو گئے تو پھر کبھی نہیں جاگیں گے۔

بڑا حال تھا۔ مگر دور اندر کوئی اسے جھنجوڑ کر اسے جگائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے کہہ رہا تھا کہ وہ نہ سوئے۔ ہاں اندر سے وہ بھی جانتی تھی کہ اگر

وہ اس رات سو گئی تو پھر وہ کبھی نہیں جاگے گی۔ اسے سوٹا نہیں تھا، خود کو اور افق کو جگائے رکھنا تھا۔ وہ وہی الفاظ بار بار کسی غیر ارادی عمل کے طور پر دہرائی

جاتے کہ اب اس دنیا سے، سردی، برف اور دھند کی اس دنیا سے اس دنیا میں چلی گئی، جہاں کوئی درد، کوئی تکلیف، کوئی خیال، کوئی ذہنی کشمکش، کوئی زماں

اور مکاں۔ کی تفریق نہ تھی۔ وہ دنیا زمان و مکان کی قید سے آزاد تھی۔ وہاں مکمل خاموشی اور سکون تھا۔

وہ سو گئی تھی۔

تھی۔ برفانی طوفان کے چنگھاڑنے کی آواز، مگر وہ طوفان کی آواز نہیں تھی۔ وہ کوئی دھبہ سا تھا، جو ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ دھبہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ سبز رنگ، درمیان میں چمکتا چاند ستارے۔

”افق اٹھو۔ وہ آگئے ہیں۔“ وہ ایک دم زور سے پھٹی آواز میں چلائی۔ اس کی بے حد خشک جلد سے خون نکلنے لگا، مگر وہ بروا کیے بغیر اس سبز ہیلی کاپٹر کو دیکھتے چلانے لگی، جو فضا کا سینہ چیرتے ہوئے ان کے قریب پہاڑ کے سامنے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”افق اٹھو۔ میں نے کہا تھا نا وہ آجائیں گے۔ وہ آگئے ہیں۔“ وہ خوشی سے رونے لگی تھی۔ ”وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گئے۔ دیکھو سامنے وہ آگئے ہیں۔“

وہ کھڑی تو تھی ہی، اب اس نے پوری کشت سے دونوں بازوان کی جانب ہلائے، پھر اس کے گرد گھول کا پیالہ بنا کر ان کو آواز دینے لگی۔

”ہیلپ۔ ہیلپ۔“ وہ انہیں دونوں ہاتھوں کو ہلاتی اپنی جانب بلارہی تھی۔ سبز ہیلی کاپٹر کی ایک جھلک نے اس میں جیسے نئی روح بھونک دی تھی۔

ہیلی کاپٹر بہت چھوٹا سا تھا۔ اس میں دو سبز گرے یونیفارم میں ملبوس پائلٹ بیٹھے تھے۔ ایک کے چہرے پر گلاسز تھے اور قدرے درمیانی عمر کے دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر اڑا رہے تھے۔ وہ جان گئی کہ وہ کرس فاروق تھے۔ ان کا کوپاٹلٹ نو جوان تھا۔ اور اس کے چہرے پر گلاسز نہیں تھے۔ اس نے پریشے کو ہاتھ سے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔

”چلو افق۔ اٹھو۔“ نقاہت کے باوجود اس نے افق کو کندھے سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

”تم جاؤ، ان کے قریب۔“ یہ وقت تمام وہ بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ افق کو چلنے کا کہہ رہی تھی اور وہ اسے آگے بھیج رہا تھا، دوسری جانب وہ کوپاٹلٹ مسلسل اسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

”جاؤ نا! افق نے بیٹھے بیٹھے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے دھکیلا۔ پریشے نے اپنی حفاظتی رسی کھول کر افق کی کھولنی چائی۔ وہ کھل کے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اس نے چاقو نکال کر اس کاٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ارد گرد دوستانوں پر پرل کرنے لگی۔ رسی کٹ کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر بے چینی سے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ کوپاٹلٹ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا اور ہاتھ میں چھوٹا سا مووی کیمرہ پکڑے قلم بن رہا تھا۔ لرزتے منجھتا ہوں سے اس نے رسی کاٹی اور آواز ہو کر ہیلی کاپٹر کے قریب جانے لگی۔ وہ جگہ کسی بہت کی منڈیر کی طرح تھی۔

برف کی سراط۔ جیج جیج اس پر قدم رکھنا۔ ہیلی کاپٹر کے قریب بڑھنے لگی۔ اب بھی تک ان کے نزدیک ہی ارم اوھر چکرا رہا تھا۔ اس کے ”خچے“ اس کے بہت قریب تھے، مگر وہ وہاں لینڈ نہیں کر سکتا تھا۔ پریشے سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قدم اس من بھر کے پورے تھے۔ اسے قریب آتے دیکھ کر مومن بناتے پائلٹ کیمرہ دکھا اور بار بار اس کی جانب ہلایا۔ وہ اس کو اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔

پریشے نے الجھ کر اسے اور پھر گردن پھیر کر افق کو دیکھا۔ اسے اپنے جانب دھکے دے کر ہاتھ سے اشارہ کرنے لگا۔ وہ واپس میں کاپڑا جا رہا تھا۔ بلال اسے اندر آنے کو کہہ رہے تھے۔

”میرا سا تھی زخمی ہے، پہلے اسے اٹھاؤ۔“ وہ اس سے چلائی، مگر ہیلی کاپٹر کے پروں کی بھاری گڑگڑاہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

مجر بلال نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور اسے دوبارہ اندر آنے کو کہا۔ وہ ایک بل کو ہچکچاتی، پھر اس کا برہیا ہوا بازو تھام لیا۔ دوسرے ہی بل وہ ہیلی کاپٹر کے اندر تھی۔

”اوہ سر! ہم گئے۔ بس ہم گئے۔ کلمہ پڑھیں سر! ہنس کر کہتے ہوئے مجر بلال نے دُور بند کیا۔

”میرا سا تھی زخمی ہے۔ اسے سہارا دے کر اٹھانا پڑے گا۔ وہ چل نہیں سکتا۔“ ہیلی کاپٹر کے اندر اتنا شور تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔ مجر بلال نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پھر ہیڈ فون اس کی جانب بڑھایا۔

”یو او کے میم؟ اسے پس لیں۔“ اس نے ہیڈ فون تھاما، مگر پہنا نہیں۔ بس وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پریشے کے اس پار برف پر بیٹھے افق کو دیکھتی رہی، جس نے سر پر فلی دیوار سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ تب دفعتاً اسے احساس ہوا کہ افق دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں اوپر بلند ہو رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے الارم سا بجا۔

”وہ۔ میرا سا تھی۔ اسے بھی تو اٹھائیں آپ۔ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔“ بھاری گڑگڑاہٹ اس کے دماغ پر ہتھوڑے پر سارہی تھی۔ اس کی بے چین نگاہیں نیچے برف پر بیٹھے افق پر جمی تھیں، جس کی آنکھیں بند تھیں اور گردن شانے پر ڈھلک گئی تھی۔ وہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟ وہ گردن سیدھی کیوں نہیں کر رہا؟ کوئی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

”اسے مت چھوڑ کر جائیں آفسیر! وہ۔ وہ زخمی ہے۔ آپ لوگ اسے اٹھاتے کیوں نہیں ہیں؟“ جیسے جیسے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا، پروں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس شور کے درمیان اسے آگے والی دونوں نشستوں پر بیٹھے پائلٹس کی آوازیں ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھیں۔

”لڑکی چیخ کیوں رہی ہے؟“ ”سر! آئی تھنک ان کو شک ہے، یا کوئی نفسیاتی اثر۔“

”اور وہ دوسرا لڑکا؟ بلال تمہارا خیال ہے، وہ وہاں ہے؟“

”نہیں سر! آئی تھنک وہ مر چکا ہے۔“ ”اچھا، مگر باڈی تو ری کور کرنی پڑے گی۔ ترک کور نمٹ کوس۔“

شور بلند ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں کے پردے پھٹ

رہے تھے۔ اس کا دل چکرا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے وہ سنتا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی نظریں دور ہوتے افق پر تھیں۔ وہ چیخ کر اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ آنکھیں کھولے۔ وہ اسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی اسے کھسٹ کر اپنے ساتھ ہیلی کاپٹر پر لانا چاہتی تھی مگر وہ کانوں کے پردے پھاڑا شور۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ اس نے خود کو زور زور سے چلاتے سنا۔
”وہ زندہ ہے۔ خدا کے لیے اسے بچاؤ۔ وہ زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں ہے۔ اسے پکارو۔ وہ آنکھیں کھول دے گا۔“

میجر بلال نے شاید مڑ کر اس کی طرف توجہ بھری نظروں سے دیکھا بھی اور ہیڈ فون کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا بھی، جو اس کی گود میں دھرا تھا مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے گمرانڈ میرا جھانپا گیا۔ گمرانڈ میرا۔ سیاہ و خضہ۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ ٹنگوں کی اوہ کھلی درزیوں سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ وہ کسی چیز پر لپٹی ہوئی تھی اور کچھ لوگ اس چیز کو حرکت دے کر نہیں لے جا رہے تھے۔ اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ وہ بس چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔ ”تم نے مار دیا اسے۔ تم اسے مرنے کے لیے چھوڑ آئے۔“

دہچتا نہیں کس پر چلا رہی تھی۔ کوئی سوئی کی ٹوک اس کی جلد میں نہیں چبھی اور پھر گمرانڈ میرا اور خود کی تھی۔ پھر اس کے کان میں کوئی مدھم سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دھیمی دھیمی خوبصورت آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کوئی اس کے بہت قریب تھا اور کسی نے آستلی سے اس کے بالوں کو چھوا۔ گرم ماسوں کی تپش اسے اپنی گردن پر محسوس ہوئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

وہ کسی اسپتال کا کمرہ تھا۔ سفید دیواریں، سفید چھت، بستر کی سفید چادر، اس نے کنبیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ قریب کھڑی ساڑھی میں ملبوس

نرس نے جھٹ اس کے پیچھے ٹکیر رکھا۔ وہ بیٹھ گئی تو اس نے بغور اپنے دائیں پہلو میں دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا۔
”اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بستر پر اکیلی تھی۔“

Happy Second Birthday
Dr Parisheh!
(دوسری زندگی مبارک ہو ڈاکٹر پریشہ!)
چونک کر سر اٹھایا۔ قریب ہی آرمی ہسپتارم میں کرنل کے روم کے ڈاکٹر نے اس کی فائل پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے اسے مبارکباد دی۔
”ٹھیک یو سیر!“ اس کو اپنا گلابیٹا ہوا محسوس ہوا۔ ساتھ ساتھ زکام بھی تھا۔

”کیسی ہے آپ کٹل پر یو گرا!“
”بالکل ٹھیک۔“ وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے جسم کے کس کس حصے میں درد نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ اس نے بچہ سے سفید کپڑے پہن رکھے تھے جن کی آدھی آستینوں سے اس کے دودھیا بازو باہر نکل رہے تھے۔ گرم موٹے کپڑوں سے اسے ملا آخر نجات مل گئی تھی۔ حال بھی خاصی نرم تھی۔
”مجھے کیا ہوا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ صرف سائیکولوجکل شک تھا۔ ظاہر ہے کسی سانحہ کے مرحلے پر محسوس ہوتا ہے۔ باقی ضرور میں نے دیکھا۔“
”جھوٹے موٹے زخم بھی تھے۔“
”کسی سانحہ کے مرجانے پر“ کے الفاظ پر چونک سی گئی۔

”مم۔ میں بے ہوش تھی کیا؟ کتنی دیر تک؟“
”تین دن تک۔ آج 25 اگست ہے۔“ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

”تین دن تک؟ میں اتنی لمبی بے ہوش نہیں رہ سکتی۔ ناممکن۔“ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔
”آپ کو رونا رہا تھا۔ آپ ہسٹریک ہو رہی تھیں۔“
میجر بلال نے بتایا تھا کہ سم فرینڈ آف یور ڈائریز کن رانا

پوشی۔
”ڈائریز؟“ وہ سانس نہیں لے سکی۔
”آپ کے انکل، آئی اور ایک کرنل بھی اسلام آباد سے آئی ہوئی ہیں۔“

”اسلام آباد سے؟ تو میں کدھر ہوں؟“
”آپ فلک سی ایم ایچ میں ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ آپ ایک ڈیٹیل ماؤنٹین سے بچ کر آئی ہیں۔ آپ کا ریسکویو ماؤنٹین کلائمبنگ کی تاریخ کا۔“

”پلیز میری کرنل کو بلا دیں، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“ اس نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔ وہ سر ملا کر اسے آرام کرنے کو کہہ کر باہر چلے گئے۔
”ڈائریز؟ انہوں نے یہ کیوں کہا؟ وہ۔۔۔ وہ کسی اور کی بات کر رہے ہوں گے۔“ افق کی نہیں۔ ہرگز نہیں۔

اس کی نگاہوں نے سامنے آخری بار دیکھا، افق کا چہرہ گھوم گیا۔ پھر آنکھیں بندھے پر ڈھکی گردن۔ پریشہ کو کابل ڈوینا اس ہوا۔

دروازہ اس کی آنکھ کے ساتھ کھلا اور نشاء اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا اور آنکھیں متورم تھیں۔

”کیسی ہو پری؟“ اس کے بیلے کے کنارے کھڑی ہوئی۔
”نشاء؟“ اس کیسے ہے؟“ اس نے بے قرار ہوتی دھڑکنوں کو بمشکل قابو کیا۔
نشاء کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر لبوں

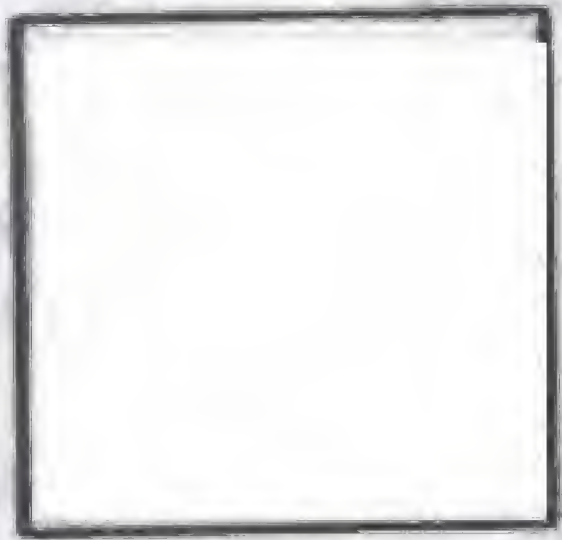
قاریمن!
اس مقام پر اگر ہمارے دل کی دھڑکن بھی رُک سی گئی ہے۔ کیا اس مہم جو کہانی کا انجام نہیں ہو جاتا؟ یہ سوال ہمارے ذہن میں بھی ابھرا ہے۔ یقیناً ”نہو احمد بھی“ کی کہانی کہتے کہتے اس مقام پر آکر ٹھہر گئی ہیں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اس ماہ آخری قسط ہو۔ لیکن اب ہم ”آخری قسط“ کے لیے مزید صفحات ان کے لیے مختص کرتے ہیں کہ وہ صراحت سے اپنی کہانی کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے اطمینان خیز ”اختتام“ بر لا کھوں قارئین کو مطمئن کریں۔ سو آخری قسط آپ اپریل کے شمارے میں ملاحظہ کیجئے گا۔ اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔

کو جنٹل دی۔ ”تم ٹھیک ہو جاؤ گی پری! شکر ہے تمہارے ہاتھ پاؤں فراسٹ باٹ ہونے سے بچ گئے۔“

”نشاء! میں تم سے پوچھ رہی ہوں! افق کیسا ہے؟“ وہ زور سے بولی۔ اس کو اپنے قدم کسی کچی برف پر کھڑے لگ رہے تھے۔ ابھی نشاء کچھ کہنے کی اور اس کے پیچھے کچی برف پھٹ جائے گی۔

”تم آرام کر پری! ہم پھرت کر یں گے۔ تمہاری طبیعت۔“
”نشاء! خدا کے لیے مجھے بتاؤ افق کیسا ہے؟“ کوئی اس کے جسم سے جان نکال رہا تھا۔

نشاء چپ چاپ کھڑی لب کاٹتی رہی۔ وہ بول کیوں نہیں رہی وہ چپ کیوں ہے؟ پریشہ کا دل گھبرانے لگا۔
”نشاء پلیز مجھے بتاؤ وہ ٹھیک تو ہے؟ وہ اسے بچانے گئے تھے یا نہیں؟ خدا کے لیے نشاء مجھے بتاؤ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔“ (باقی آئندہ)



اس مقام پر اگر ہمارے دل کی دھڑکن بھی رُک سی گئی ہے۔ کیا اس مہم جو کہانی کا انجام نہیں ہو جاتا؟ یہ سوال ہمارے ذہن میں بھی ابھرا ہے۔ یقیناً ”نہو احمد بھی“ کی کہانی کہتے کہتے اس مقام پر آکر ٹھہر گئی ہیں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اس ماہ آخری قسط ہو۔ لیکن اب ہم ”آخری قسط“ کے لیے مزید صفحات ان کے لیے مختص کرتے ہیں کہ وہ صراحت سے اپنی کہانی کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے اطمینان خیز ”اختتام“ بر لا کھوں قارئین کو مطمئن کریں۔ سو آخری قسط آپ اپریل کے شمارے میں ملاحظہ کیجئے گا۔ اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔

دل کا محل

یہ کہانی ڈاکٹر پریشہ جہانزیب کی ہے جو خوابوں کے حقیقت بننے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ طبعاً ”مشکل پسند“ ہے اور ہر چیز میں خوب صورتی تلاش کرتی ہے۔ پریشہ والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور پریشہ کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن کوئی شہزادہ اس کے خوابوں کو تعبیر کا رویہ کرے گا۔ اسے جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب اس کے والد اس کی

مکھانیاؤں



وہ مسکرا بھی نہ سکی۔



26 اگست 2005ء

ہیلی کاپٹر سبز گھاس پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ بالوں کو انگلیوں سے سنوار کر انہیں اوچی پونی ٹیل میں مقید کر کے برآمدے سے باہر نکل آئی۔ (اس کا کچھو گھر میں رہا تھا۔)

اسے گلگت سے اسی ہیلی کاپٹر پر اسلام آباد جانا تھا۔ کرنل فاروقی جا رہے تھے تو وہ بھی ساتھ ہی جا رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کے برساکن تھے اس کے دروازے کے قریب۔ مگر بلال کھڑا تھا۔

”ابھی سیکنڈ ہرنڈ ڈے میم!“ اسے آتے دیکھ کر وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ وہ بھی جواباً ”مسکرا دی۔ کتنا غلط سمجھتی رہی تھی وہ ان کو کتنی بدگمان تھی کہ وہ اسے بھول گئے ہوں گے، مگر انہوں نے اسے نہیں بھلایا تھا۔ وہ اسے وقت پر پچانے آگئے تھے۔

”میں نے اپنے ہسکمو کی ویڈیو دیکھی تھی آج۔ مجھے میجر خالد نے دکھائی۔ بہت امیزنگ کام کیا آپ نے۔ اتنا مشکل ہسکمو کیسے کر لیا آپ نے؟ میں اب تک امیزڈ (ششدر) ہوں۔“

”ارے میم! جو کیا اللہ نے کیا۔ پاک فوج نے بس ہمت کی۔ ویسے امید ہے اب آپ مجھے برا بھلا نہیں کہیں گی۔“

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ”میں وہ دراصل۔ میں بریشان ہو گئی تھی۔ آپ ہیں کیپ سے اچانک چلے کیوں گئے تھے؟“

”میم! ہم فیول کے لیے گئے تھے اور ہنزہ کے باہر

تین دن موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسے ہی آسمان صاف ہوا ہم آگئے۔“

”مگر آپ نے افق ارسلان کو ہیلی کاپٹر میں کیوں نہیں بٹھایا؟ یہ اچھا خاصا ہوا ہیلی کاپٹر ہے۔ اس نے سامنے کھڑے ہیلی کاپٹر کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ وہ نہیں ہے جس نے آپ کو ہسکمو کیا تھا۔ آپ کو ٹھیک سے یاد نہیں ہے؟ ”گاما“ تھا اس میں ہم ارسلان کو کیسے بٹھاتے؟ وہ تو بالکل پچھرا تھا۔“

”کون ارسلان؟“

”میں میڈم! ہمارا پہلی لانا پچھرا ہوتا ہے۔“ وہ ہنسا۔

”وہ زیادہ ویٹ نہیں اٹھا سکتا۔ تین سے زیادہ بندے اس میں نہیں بیٹھ سکتے۔ کرنل زیر اور میجر عاصم نے اپنی گھری آئی میں اپنے squirrel سے ارسلان کو ہسکمو کیا۔ اس دفعہ راکا پوشی پر ہم نے دو ہیلی کاپٹر بھیجے تھے جیسے بلور پر ہسکمو آپریشن کرتے ہوئے بھیجے ہیں۔“

بریتے نے غور سے سبز رنگ کے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ ”ہاں یہ وہ پچھرا نہیں لگ رہا۔“

”لوئے میم! اسے کچھ مت کہیں یہ مائنڈ کرے گا۔“

وہ ہنس دی۔ ”میجر بلال! یہ ہیلی کاپٹر ہے۔ جیسے کہنا چاہی تھی کہ اس انسان میں ہے۔“

”غالب یہ میرا جانا ہے۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

”سبز رنگ کی دھات کو چمکی دی۔“

”اپنی ویز۔ میجر بلال میں۔ میجر عاصم سے مل نہیں سکی۔ ان کو میری طرف سے شکریہ بول دیجیے گا۔“

”راجر میم! پھر کد مہ وہ بولا۔ ”یاں۔ میجر عاصم آپ کا پوچھ رہے تھے۔ شاید کوئی چیز تھی آپ کی ان کے پاس۔“

”میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اچھا خدا حافظ۔ اور ایک دفعہ پھر شکریہ۔“ وہ بات کٹ کر ہیلی کاپٹر کے کھلے دروازے سے اندر چڑھنے لگی۔

میجر بلال نے اس قدر بے الجھ کر کچھ کہنا چاہا تھا کہ اسے کوئی الجھن تھی مگر بریتے کو علم تھا کہ یہ کوئی جیتی شے چھوڑے نہیں جا رہی تھی۔ جو وہ کھو چکی تھی اس کے بعد اگر کچھ وہ بھی گیا تھا تو اسے پرانا نہ تھی۔ اندر بیٹھ گئی۔ کرنل فاروقی تیار ہی تھے سو دروازہ بند کر دیا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا۔ اس نے ہیڈ فون میں پرچہ چھال لیا۔ شور نہ بٹتا ”کم ہوا۔“

وہ کھڑکی کے پار چھوٹے ہوتے گلگت اور دور نظر آنے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔ جن کے درمیان بہت گنات اور غرور سے پرستوں کی دیوی کھڑی تھی۔

”thank you raka poshi!“ اس نے اپنی دیوار کو کس بات کا شکریہ ادا کیا، وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

دور دور تک پھیلے یہ وہ پر بڑے تھے جن کی پیشانیاں ان جھک کر جوم رہا تھا۔ وہ واقعی عظیم پہاڑ تھے اور ان کے درمیان میں قراقرم کا تاج جل کھڑا تھا جس کی علیہ سرس دیواروں پر عینت کی ایک خاموش داستان لکھی تھی۔ وہ بلاشبہ اگرہ کے تاج کے لیے زیادہ سفید اور حسین تھا۔

اس نے ایک آخری نظر قراقرم کے کوساوں پر ڈالا۔

”قراقرم۔“ اس نے ہالے ہالے مجھے تم قراقرم کی قسم! میں زندگی میں پھر بھی تم غلام پہاڑوں کی نہیں آؤں گی۔“

اس نے سیٹ کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موندیں۔ کتنے دنوں بعد آج اس کی کمر کے پیچھے برف کھلی تھی۔

”تو یہ تھا میری کہانی کا اختتام۔ آخر اس موڑ پر آخر قراقرم کی پری اور کوہ پیا کی کہانی بالآخر ختم ہو گئی۔“ وہ آنکھوں سے بے حد افسروں سے مسکرائی۔

لیکن قراقرم کی پری اور کوہ پیا کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔



محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
بہی دل سوز محلوں سے
بہی بے کار رسموں سے

کبھی تقدیر والوں سے
کبھی مجبور قسموں سے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے
کبھی یہ صوب جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے
کسی کا چین بنتی ہے
کسی کو رول دیتی ہے
کبھی لے پار جاتی ہے
کبھی یہ ہار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے

اسلام آباد واپسی پر اسے ہر اس بندے سے لیکچر ملا جس کی اس نے توقع کی تھی۔ ”پچھو، ندا آپا، ماموں سمائی اور سب سے بڑھ کر سیف۔“

”تمہیں احساس ہے کہ تمہاری زندگی ہمارے نزدیک کتنی اہمیت رکھتی ہے؟“ وہ کتنی ہی دہرانا رہا اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے اور کوہ پیا کی نقصانات بتانا رہا، مگر جس طرح وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی تو وہ جھنجھوڑ کر بولا۔ ”پریشی نے سر اٹھایا۔ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔“

”آپ کے لیے میری زندگی اہم ہے یا میں آپ کی زندگی ہوں؟“ سیف کچھ بول نہ سکا۔

”اگر آپ کا لیکچر ختم ہو چکا ہے تو میں جاؤں؟“

”پریشی تم آستند۔“

”آستند تم پہاڑوں کا نام نہیں لوگی کلا ٹینگ جیسی فضول اسپورٹ میں حصہ نہیں لوگی میری ہر ای میل کا جواب دوگی، کی نا تو میں یہ باتیں سن چکی ہوں۔ جواب نہ دنا میں ضروری نہیں سمجھتی۔“ وہ میز پر رکھے

کافہ فائل میں جو ڈکرائی ہوئی۔

سیف اتنا بے وقوف نہ تھا کہ اس کا سر دھریہ نوٹ نہ کر یا مگر وہ اس سب کو اس کی دوست کے مرے کے باعث آپ سیٹ ہونا سمجھ رہا تھا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ پرس کندھے پر ”اندور آل بازو پر ڈال کر باہر چلی آئی۔ وہ ہسپتال جا رہی تھی۔ گزشتہ روز ہی اس نے ہمز جو ان کیا تھا۔

پلیا آج صبح ہی واپس پہنچے تھے۔ یہ پریشہ کو بعد میں علم ہوا کہ پلیا کو سارے معاملے کی مکمل خبر تھی مگر جانے کیوں شاید اس کی ذہنت کے باعث ”انہوں نے پریشہ کی ذہنی حالت محسوس کرتے ہوئے کچھ نہ پوچھا کوئی باز پرس نہیں کی“ کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ اختیار میں یقیناً ”انہوں نے تمام خبر پڑھ لی تھی۔“ ”ماہی ناز ترک کا نمبر افق ارسلان“ کو انہوں نے نظر انداز کر دیا یا اہمیت نہ دی۔ جیسے وہ خور ایک ماہ پہلے تک کئی دفعہ کلا نیٹنگ میگزین اور اسپورٹس میگزینز میں افق ارسلان کا نام پڑھنے کے بعد اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

پلیا اس کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ مگر چونکہ وہ بالکل ٹھیک واپس آگئی تھی اس لیے انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔

مگر وہ ”بالکل ٹھیک“ نہیں تھی۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ وہ زندگی بھر کبھی اتنی خاموش اور الگ تھلک نہیں رہی تھی۔ جتنی ان دنوں رہنے لگی تھی۔ پچھونے اسے دیکھا تو ان کو تو لگتا ہی نہیں آیا کہ یہ وہی پریشہ ہے جو پانچ اگست کو لہذا گئی تھی۔

اس کی گوری رنگت نہیں ہو چکی تھی اور وزن نہیں بائیس پاؤنڈ گھٹ چکا تھا۔ سب کو یہ بات نظر آئی تھی۔ مگر کسی کو وہ نظر نہیں آیا تھا جو اسے اصل میں ہوا تھا۔ وہ بیماری جو اسے دراصل لاحق ہوئی تھی۔ پریشہ جہاں نہ سب کو عشق ہو گیا تھا۔

6 ستمبر 2005

اس روز ندیا آپا آپا نہیں تو اسے اپنے ساتھ لے کر گئیں۔ کسی اور وجہ یا پھر شاید یوم دفاع کی چھٹی کے باعث سیف گھر رہی تھا۔ اسے ندیا آپا کے ہمراہ آنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص چمک آئی جس سے پریشہ کو نفرت تھی۔

”کیسی ہو پری؟“ وہ اس کا سر سے پیر تک جائزہ لے کر مسکرایا۔ پریشہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا ”سیف! آپ! نہیں لگتا کہ میں اب بڑی ہو گئی ہوں اور آپ! مجھے پورے نام سے پکارنا چاہیے۔“ اس کی بات پر سیف اس پر ہنسا ”میشلا! بڑے بل دیکھ کر اسے خاموش ہونا پڑا“ ”شعبہ“ آیا آپ جی میں لیں، آئندہ پریشہ کو پری نہیں کہنا۔“ وہ خاموشی سے سیف کو دیکھتی رہی جیسے اسے اس کے مذاق پر ہنسی نہیں آئی۔

”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“

”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“

”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“

اس یا اچھی ہے۔ ویسے بھی بیٹا اچھی بیوی وہ ہوتی ہے۔ شوہر کے شانہ بشانہ کام کرے۔ آخر کو شوہر بھی اس کے لیے کما تا ہے۔“ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اس کے بعد بھی جاب کرتی رہے گی۔

”اور نہیں تو کیا اچھا پری! یہ وہ کھوئیہ جتنا سپرے اس ریلوٹ کالے کر آئی ہوں پورے پانچ ہزار کا“ ”انہوں نے نیوی بلیو ریلوٹ پر فیوڈی ستاروں والا پٹہ سامنے پھیلایا۔ وہ غیر دلچسپی اور قدرے کسی سے وہ سارا سامان دیکھتی رہی۔

سیف بھی ساتھ بیٹھا کپڑوں کے بارے میں ”دکان میں کی ہے اچھا! کے بارے میں مسلسل تبصرہ کر رہا ہے“ ”عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ اس نے کلاس بدل لی لیکن اس کلاس میں رہے کا سلیقہ اسے ابھی مل نہیں آیا تھا۔

”دعنا“ اس کے موبائل کی بپ بجی۔ اس نے ساکل نکال کر روشن اسکرین کو دیکھا۔ وہاں ایک غیر متعارف نمبر تھا۔ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“ ”جی پچھو! آگے!“

اسی اثنا میں روشناس اور سنی جانے کہاں سے وارو ہو گئے۔

”لانا دیکھیں! سیفی ہاموں ہمارے لیے مونو پلی لائے ہیں۔“ روشناس مونو پلی کا گتہ اس کے کارڈز اور گوٹ ماں کو دکھانے لگا۔

”بھلا اتنے چھوٹے بچے یہ کیم کھیلیں گے؟“ ”میرا آپا نے کہا۔ پریشہ کو بے اختیار کچھ یاد آیا۔ رات کی تاریکی جلتے الاؤ سے اڑ کر فضا میں گم ہوتی چنگاریاں، ٹکڑیوں کے پھٹنے کی آواز، ماہر ڈھنڈ کے خاموش پانچوں پر چڑھی چاندنی کی تہ، دور دور تک پھیلا سبزہ زار۔

اس نے سر جھٹکا۔ اس کو مزید وہاں بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میرا ڈیوٹی ٹائم ہے۔“ ڈاکٹر واسطی بہت تھا ہوں گے مجھے جانا ہو گا۔“ ”ہمانہ اسے سو بھگ گیا تھا۔“

12 ستمبر 2005

جیولری شاپ کا گلاس ڈور دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سیف اس کے عقب میں تھا۔ وہ بہت اعتماد سے چلتی شوکیس کے سامنے سیٹوں کی لمبی قطار میں سے ایک کرسی کھینچ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھا سیکڑ میں پروفیشنل خوش اخلاق سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”جی میڈم“

سیکڑ میں کے پیچھے والی دیوار شیٹے سے کورڈ تھی، چمکتی ہوئی شیٹے کی دیوار۔ چمکتی دیوار۔ اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے سر جھٹکا اور آئینے میں ایک نظر خوب ڈالی۔ لمبے اور سیدھے بالوں کو ہاف باندھ کر اس نے کچھ لگا دیا تھا۔ قیمتی پتھروں سے مزین کچھو جس کا وہ رنگا پتھر ڈھیلیا تھا کچھو سے چند ٹیس نکال کر گالوں پر ہلتے ہوئے چھو رہی تھیں۔ چند دنوں سے بہت کھانے پینے کے باعث اس کا چہرہ آج خاصا تروتازہ اور گل قدرے بھرے بھرے لگ رہے تھے۔

سیف اس کے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اس کو دیکھ کر دوسرا بیٹھا اویسز عمر ستار لپک کر اس کی طرف آیا۔

”جی سیٹھ صاحب! کوئی یونیک چیز دکھائیں۔ ہماری ہونے والی ریس کو شادی کے دن پہننے کے لیے۔“

اس کو سیف کا متعارف کرانے کا انداز نہ ہرگا تھا۔ مگر وہ خاموش رہی۔

ستار بیٹھ جھٹ سیاه دلوٹ کے ڈیوں میں سج چکے دیکھتے سونے کے سیٹ شوکیس پر رکھنے لگا۔ دوسرا لڑکا اس کی بدد کر رہا تھا۔

پیشے ایک ایک کر کے ہر سیٹ کو رینجیکٹ کرتی رہی۔ اسے اس سب میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ ٹوپیلا اور پھپھو نے کہا کہ وہ سیف کے ساتھ اپنی مرضی کی شاپنگ کر آئے تو وہ چلی آئی۔

سیف نے بہت سے ڈبے کھلو لیے جو اس کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ یقیناً ”وہ پہلے یہاں آتا رہتا تھا۔ ندرا آئی کی شادی کو عرصہ گزر چکا تھا جب ان کی شادی ہوئی تھی تب سیف اتنے سگے جیولرز کو انورڈ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یقیناً ”وہ پچھلے چند برسوں میں یہاں آتا رہا تھا۔ جانے کتنی عورتوں کو زورات دلوانے۔ شاید اسی لیے اس نے دکان دار پر واضح کیا تھا کہ وہ لڑکی اس کی ہونے والی بیوی ہے سو وہ محتاط رہے۔“

ایک لمحے کو بھی اس کا دل نہیں چاہا تھا کہ وہ جیولرز سے سیف کے چکریوں کے متعلق پوچھے۔ اسے سیف اور اس کے انورڈ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر پایا جانتے بوجھتے اپنی آنکھیں بند کر رہے تھے تو وہ بھی اپنی آنکھیں اور دل کب کی بند کر چکی تھی۔

”یہ بیروزی پتھروں والا تو بہت اچھا ہے۔ لے لو۔“ اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے بالوں پر لگا کچھ اٹار سیاه آبشار کمر اور چہرے کے اطراف میں گرتی دیکھی۔

”آپ کے پاس اس طرح کا کوئی دوسرا پتھر ہوگا یا

آپ اس پتھر کو جو ڈیس سیہ ڈھیلا ہے اور کسی بھی لے اکھڑ جائے گا۔“ پریشے نے کچھ شوکیس پر رکھ ہونے دور گئے پتھری جانب اشارہ کیا۔

”یہ بالکل گرنے والا ہے۔ اس کچھ کو پھینک دے۔ میں تمہیں نیا لے دوں گا۔“ سیف نے اپروائی سے کچھ اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا۔ کسی پتھر کی تیزی سے پری نے چھٹ کر اس کے ہاتھ سے کچھ چھینا۔

”ہاتھ مت لگاؤ اسے یہ بہت قیمتی ہے۔“ کچھ اس کی متاع عزیز کی طرح اسے منگول میں ہنسنے پریشے نے سیف کو عیسیٰ نگاہوں سے دیکھا۔

وہ اس کے ہاتھ پر شدیدہ گیا۔ ”پریشے! تمہیں اس سے بہت آواز میں کچھ کہنا چاہا۔“

”میں گلاڑی میں بیٹھ رہی ہوں آپ کو آنا ہے تو آجائیں۔“ نہیں تو میں فیکسی سے چلی جاؤں گی۔“ بالوں کو پورا کچھو میں جکر کردہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھٹ کھٹ چلتی کلاس دور دھکیل کر باہر نکل گئی۔ سیف جیولر کے سردار کے ساتھ حیران رہا۔ وہ بے وقت کے ساتھ اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

جیولر نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹک کر ساتھ والے لڑکے کو بتایا۔ ”نیکم صاحب! شادی پر خوش نہیں ہیں پتھری۔“

لڑکا دانت کھونسنے لگا۔ جیولر پھر سے اپنی سیٹ منہل کر رہ جھٹک گیا۔ جبکہ لڑکا شوکیس پر رکھنے کی زورات کے مخلیں ڈبے بند کرنے لگا۔

13 ستمبر 2005ء

وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اور آل بازو پر لیپٹا اسٹیکس کوپ ایکٹ میں گھسایا۔ جلدی جلدی جوتوں کی اسٹریپس بند کیں بالوں کو اسی طرح اسی کچھو میں جکڑا اور پرس کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

لڑکی کی جانب پر دھتے ہوئے اس نے نشاء کریت روکنے دیکھا۔

”میں ہسپتال جا رہی ہوں؟“ وہ اس کی تیاری اور غفلت سے اندازاً دور سے ہی پہچان گئی تھی۔

”کی کو کوئی کام ہے؟“ وہ گاڑی کلاک کھولتے لڑکی ہونے لگی۔

”میزم آپ کے جینز کی شاپنگ کرنی ہے۔ آپ تیاری ہیں۔“

”اوہ نشاء! ہائی کی چوائس بہت اچھی ہے، وہ خود کر کے۔“ تم ان کی ہیلپ کروا رہا، تمہیں میری پسند کا حکم تو ہے۔“

”مگر اچھی ہم جوتے لینے جا رہے ہیں جو تمہیں ہی مل گئے۔“

”اوہ اوہ اسلام آباد چندی سے کہاں اچھے جوتے ہیں؟ اور میرے پاس بہت جوتے ہیں۔“ چھوڑو۔“ وہ کھٹک رہی ہو رہی ہے۔“ اس نے فکر میں ہی دیکھی۔ ”یہ وقت لینے جو پرس کے آخر کو شادی ہے۔“

اس کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا۔ دروازے کے پاس اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

”پری! وہ اس کے قریب چلی گئی۔“ اگر فیصلہ کر لیا تو کھسکا رہا۔ لڑکنا بھی کھو۔ سیف بھائی جیسے بھی اس میں جیون کر داور دل سے کرو۔“

”دل؟“ ایک پتھری مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو۔ ”دل تو نہیں۔“ قزاقزم کے پھاڑوں میں رہ گیا ہے۔ ”تو یاد بھی نہیں کہ کس جگہ کھویا تھا اسے۔“ باہر کی پھیل میں یاد دہانی کی دھند میں۔“

”کوئی فون کوئی فط کوئی رابطہ نہیں کیا اس نے؟“ وہ جانتی تھی نشاء کس کی بات کر رہی تھی۔

”میں اس کو فون نہیں دیا کب تھا۔“

”اسی میل؟“

”احسن دوران کی واکف کی آئی تھی میں نے

جواب نہیں دیا۔ مجھے ترکی کے باسیوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا۔“ وہ سر جھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ کھلے پیشے کے اس بار نشاء کھڑکی پر جھکی۔ پریشے نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”خوش رہا کرو پری! ورنہ لوگ سب جان چائیں گے۔“

”جائے دو۔“ اس نے اکٹیشن میں چابی گھمائی۔

گاڑی کے انجن میں حرکت ہوئی۔ نشاء کھڑکی سے ہٹ گئی۔ وہ پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی باہر نکلتے لگی۔

ہاتھ کی لکیوں میں کیا تلاش کرتے ہو؟ ان فضول باتوں میں کس لیے الجھتے ہو جس کو ملنا ہوتا ہے۔

بن لکیر دیکھے ہی

زندگی کے رستوں پر

ساتھ ساتھ چلتا ہے

پھر کہاں پھرتا ہے؟

جو نہیں مقدر میں

کب ہمیں وہ ملتا ہے؟

کب وہ ساتھ چلتا ہے؟

ہاتھ کی لکیوں میں

کیا تلاش کرتے ہو؟

اور یہ اسی شام کی بات ہے جب اسے ہسپتال میں فون کر کے نہایت بدحواسی کے عالم میں وحید نے بتایا کہ جہاں زیب صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ آفس سے جلدی آگئے تھے اور ابھی گاڑی سے نکلے ہی تھے کہ ان کی حالت بگڑ گئی۔

وہ اپنے حسب کام چھوڑ کر ہاگم ہاگم گھر پہنچی مگر جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی مسمانی اور نشاء پہلے سے ہی وہاں موجود تھیں اور پایا۔ وہ کافی دیر ہوئی جا چکے تھے۔ انہوں نے اس کے پیچھے کا اس سے آخری بار ملنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

13 ستمبر 2005ء

وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اور آل بازو پر لیپٹا اسٹیکس کوپ ایکٹ میں گھسایا۔ جلدی جلدی جوتوں کی اسٹریپس بند کیں بالوں کو اسی طرح اسی کچھو میں جکڑا اور پرس کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

احسن دوران کی واکف کی آئی تھی میں نے

اسے نہیں معلوم وہ کتنے دن بغیر کچھ کھائے ہے
روتی رہی تھی۔ اس کے غم بہت تھے وہ کس کس کا
ماتم کرتی؟ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری محبت کو اس نے
جس شخص کے لیے چھوڑا تھا وہ اسے چھوڑ کر بھری
دنیا میں تنہا کر کے جا چکا تھا وقت ایک دفعہ پھر چھ برس
پہچھے چلا گیا تھا۔ تب بھی یوں ہی لوگوں نے اس کے سر
پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا تھا، کھوکھلے دلا سے اور
جھوٹی تسلیاں۔ آج بھی اسے یہی مل رہی تھیں۔

اس نے بہت لوگوں کو پایا کی میت کے سر ہاتھ میں
کرتے دیکھا تھا، ان میں ندا آیا بھی تھیں اور پچھو بھی۔
وہ بے اثر بھیگی نگاہوں سے سب کو دیکھتی رہی۔ وہ
ان سب کو اندر یاہر سے جانتی تھی۔ ان کے آنسوؤں
کی حقیقت کو سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر
کسی کو اس بھری دنیا میں پایا کی خوشی اور دکھوں کا خیال
تھا تو وہ صرف وہ خود تھی۔ اس کی زندگی میں وہی تو مرد
تھے ایک پایا اور ایک اتی ارسلان۔ ایک پہلے چھوڑ گیا
تھا اور دوسرے نے اب چھوڑ دیا تھا وہ پھر سے اکیلی رہ
گئی تھی۔



وقت کا کام ہے گزرتا اور وہ تو گزرتی جاتا ہے۔
رو کر نہیں تو نہیں کر۔
ہنس کر نہیں تو رو کر۔

بھلا وقت کب ایک سار ہوتا ہے؟

سو پریشے جہاں زیب کی زندگی میں بھی وقت گزر رہا
تھا۔ چند دن اس نے بہت ماتم کیے تھے اسے لگتا تھا۔
اب زندگی ختم ہو چکی، مگر پھر گزرتے دنوں کے ساتھ
اس نے خود کو سنبھالی ہی لیا تھا۔ ہاں اب وہ پھر سے
کنور ہوتی جا رہی تھی ہنسنا بولنا اس نے ترک کر کے
خود کو زندگی بے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

اب اس اتنے بڑے دوران جنگلے میں وہ رہ کر کیا
کرتی؟ سو شادی تک جو جہاں زیب صاحب کی فتنہ
کے باعث فی الحال ملتوی ہو چکی تھی اس نے شاموں کی

طرف رہنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی ماموں اب
اکیلے نہیں رہتے دے رہے تھے وہ اس کے بچہ
سے قبل ہی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔
چند دن تو خاموشی سے کمرے میں بند رہ کر اس
بتا دیے پھر اس روز نشاء اس کے پاس آئی اور
سمجھانے لگی۔
”زندگی میں غم آتے رہتے ہیں یہ غم اتنا بڑا ہے
میں تمہیں صبر کرنے کو تو نہیں کہوں گی مگر تمہیں
کو سنبھالنا ہو گا۔“

”میں کوشش کر رہی ہوں۔“

”میری بات سنانو تو ہسپتال پھر سے جوائن کر لو۔“
”ہاں یہی سوچ رہی تھی۔ مصروف رہوں گی
شاید صبر آتی جائے۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔
”پر کی! اب تم زندگی کو نئے سرے سے شروع کر
نشاء بہت آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

”جو کچھ جیسے ہو رہا ہے اسے ویسے ہی ہو۔“
نشاء اچھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں بلکہ اس نے
اچھا ہی سوچا ہو گا۔ اس لیے مجھے مزید کوئی فیصلہ
کرنا مجھے سیف قبول ہے۔“ اس کے کہنے سے
ہی اس کا مطلب سمجھ کر پریشے نے کہا۔

نشاء احتجاجاً ”کچھ کہنے لگی تھی مگر پھر مصلحتاً اس
قصے کو کچھ غصے تک پس پشت ڈالنے کا سوچ کر وہ
گئی۔ پریشے خود بھی ابھی اس معاملے پر کوئی بات نہیں
کرنا چاہتی تھی۔

پھر اس نے ہسپتال جانا شروع کر دیا۔ حالات اب
دوبارہ معمول پر آنے لگے تھے۔ اسے لاشعوری طور پر
انتظار تھا کہ نشاء پھر اس سے اس بارے میں کوئی بات
کرے گی مگر اس روز کے بعد نشاء نے ایسی کوئی بات
نہیں کی۔

ماموں، ممانی اور نشاء کی صحبتوں کے قرض اٹھانے
اس نے خود کو زندگی کے جھیلوں میں گم کر لیا۔
شاید اسے صبر آ گیا تھا۔
یا شاید اس نے سمجھو تاکر لیا تھا۔



نمبر 2005ء

ہسپتال میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ سامنے
ان پر ایک معمر عورت اور ساتھ ایک نو عمر لڑکی
سمجھانے منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ
رہیں۔ وہ سر جھکائے دونوں کہنیاں ٹیبل پر
مدی سے پیڑ پر قلم چلاتے ہوئے نسخہ لکھ رہی
تھی۔ کچھ سے لگی چند لمبیں اس کے ساتھ سے لٹک
کر چھو رہی تھیں۔

وہ لکھ کر وہ سیدھی ہوئی۔ کانڈ پیڈ سے پھاڑا اور
کے ”مگر خاؤن کی جانب بڑھایا۔“
”ہی کی خوراک کا خیال رکھو۔ یہ تو ویسے بھی بہت
کم ہے۔ اب گھر جا کر اس سے کام و غیورہ کروائی

وہ امی عورت نسخہ تمام کر شکر یہ ادا کرتی اٹھ کھڑی
گئی ہوئی لڑکی نے اس کی تقلید کی۔ اس نے
پھر وہ کون جہرے کے گرت کر کے انگلیوں سے پکڑ
لیا۔ اس کی انگلیوں پر ہندی کے درمیں تیل پونے
ہیں تھے۔ کالی میں ستاسا زور بھی تھا۔

پریشے نے اپنی سوئی نکالیوں اور مرمریں کی تھوں کو
چند ماہ گزر جائیں پھر ان پر بھی ہندی لگی ہوگی۔
ان نکالیوں میں بھی کسی کے نام کا
”مر جھنگ کر سامنے رکھی فائل کی جانب متوجہ ہو
میں نے اس کے موبائل کی کھٹی تھی۔ اس نے
ان کا صفحہ پلٹتے ہوئے فون کان سے لگا کر مصروف
انڈیا میں بولو کہا۔

”اکثر پریشے جہاں زیب بات کر رہی ہیں جی؟“
انڈیا مردانہ اور غیر شناسا تھی۔ اس نے موبائل
سے ہٹا کر نمبر دیکھا۔ پنڈی اسلام آباد کے کوڈ کا
فون نمبر تھا۔

”کی بات کر رہی ہوں“ آپ کون؟“
”اکثر صاحب! میں راترنگ پاکستان سے بول رہا

ہوں۔ ہم آپ کو اپنے شو میں انوائٹ کرنا چاہ رہے
تھے۔“ دوسری جانب کوئی پروڈیو سر صاحب تھے۔
”اچھا؟ مگر کس سلسلے میں؟“
”آپ کو ابھی چند ہفتے قبل راکا پوشی سے آرمی نے
رہسکیو۔“

”سوری۔ مجھے کوئی انٹرویو نہیں دینا۔“ وہ رکھائی
سے کہہ کر فون بند کر کے دوبارہ فائل پر جھٹک گئی۔
چند لمحوں بعد دوبارہ کھٹی تھی۔ اس نے اسکرین پر
چراغ نمبر دیکھا۔ وہی تو سے شروع ہونے والا سرکاری
نمبر تھا۔

”جی؟“
”ڈاکٹر صاحبہ! ہم آپ کو انٹرویو کے لیے بہت اچھا۔“

”رائٹ نمبر میں وہ پریشے جہاں زیب نہیں ہوں۔“
”ہائے۔“ اس نے درستی سے بات کاٹ کر فون رکھ
دیا۔ فوراً ہی کھٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس نے دیکھا بھی
نہیں کہ اس بار اسکرین پر جگمگا تا نمبر کوئی سیلوں نمبر ہے
اور تیزی سے فون کان سے لگایا۔

”جی فرمائیے؟“ کچھ میں دیا دیا سا غصہ تھا۔
”السلام علیکم“ ڈاکٹر پریشے جہاں زیب؟“ اجد بھاری
اور عید اور تھا۔

”جی اب آپ کو کیا براہم ہے؟“ اس کو اتنا شدید
غصہ چڑھا تھا کہ اس نے مختلف آواز اور لب و لہجہ بھی
نوٹ نہیں کیا۔
”ہمم! آپ کو یاد ہو گا؟ آپ کو راکا پوشی سے پاک
آرمی نے۔“

”گناہ کر دیا تھا پاک آرمی نے مجھے رہسکیو کر کے۔“
میں حوالتی جا رہی ہوں کہ میں بیچ کر زمین برادیں آگئی۔
خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں اگلی دفعہ زندہ
بیچ کر آئے دالی غلطی نہیں کروں گی۔ اب مجھے کل
مت کیجیے گا۔“ کھری کھری سنا کر اس نے کل منقطع
کی اور پھر موبائل آف کر کے رکھ دیا۔
”اسے دن ہو گئے پھر بھی لوگ بھولے نہیں ابھی

تک۔ "ہڑواتے ہوئے اس کی نگاہ مبصر رکھے کیلنڈر پر پڑی جو اسے سعید بک بینک سے کتابوں کی خریداری پر مفت ملا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بجتے کو تھے وہ اٹھنے ہی لگی تھی سو کیلنڈر کا صفحہ پلٹ کر وقت کو چار گھنٹے پہلے اکتوبر میں لاکھڑا کیا۔

اکتوبر کے صفحے پر تاریخوں سے اس طرف دیوار کے درختوں کے جھنڈے اس پار را کا پوشی کھڑا تھا۔ اس کی چوٹی دھند میں لپٹی تھی۔

جو چیزیں وہ بھول جانا چاہتی تھی 'جائے کیوں بار بار اس کے راسے کو کسی ڈراکونی کللی کی طرح کاٹ جاتی تھیں۔

اس نے کیلنڈر اٹھا کر میز کی دراز میں ڈال دیا اور کرسی پیچھے کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا موبائل ابھی تک آف تھا۔



18 اکتوبر 2005ء

سفید دودھ سی اچلی برف کے درمیان سیدھی لکیر کی طرح کریک پر پڑا تھا۔ کریک کی نیچے کی سابی برف سلائیڈ ہو کر نشیب میں گرنے لگی۔ ہر سو برقی سفید دھول تھی۔ افق اس دھول میں چھپ گیا۔ وہ حلق کے بل چلا کر افق کو پکار رہی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا اور گرد کے پہاڑ اس پر قہقہے لگا رہے تھے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں اپنے چہرے کو چھوا وہاں برف نہیں لگی تھی۔ وہ را کا پوشی پر نہیں تھے۔ وہ اپنے نرم گرم بستر میں اپنے خوب صورت اور آرام دہ بیڈ روم میں تھی۔

اس نے دوپٹہ اٹھا کر چہرہ خشک کیا۔ خود کو نارمل کرنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔

وہ خواب وہ خوف زدہ کر دینے والے خواب اس کا

پہچان نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ پونے نو ہونے لگے تھے۔

"کاؤ" مجھے تو آٹھ بجے تک ہسپتال پہنچنا تھا۔ تیزی سے پاؤں میں سلپرز ڈالے ہاتھ روم کی ہال کی بھاگی۔ منہ پر چند چھٹے بارے بالوں کو ستارے کی طرح کھینچ کر اسے لٹے سیدھے جوتے پہن کر وہ منٹ میں باہر آگئی۔ ممالی اور نشاء سامنے نظر آ رہی تھیں۔ ساموں تو شاید آفس جا چکے تھے۔

ڈاکٹنگ ہال میں ناشتہ نہیں لگا تھا۔ اس نے حلق سے فریج کا دروازہ کھول کر پیسے اور بیج کا بوا سا پکا نکالا اور اسے منہ سے نگلنے ہی لگی تھی کہ یاد آیا کہ دروازہ تھا۔

اسے خود پر ہنسی بھی آئی اور شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ جنوں کا ٹکٹ ہاتھ میں پکڑے اس نے دروازہ ہاتھ فریج کھولنے کو ہٹھایا اور وہ سرے ہی بل ٹشون سے اٹھی۔

جوں کا ٹکٹ اس کے ہاتھ سے گھومتا کرتا تھا۔ جا کر اسے بے اختیار لڑکھڑاتے ہوئے اس نے فریج کا کنارہ تھاما اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ زمین نے وہ دروازہ جھٹکے اور دیے اور پھر سکوت چھا گیا۔

"مجھے خواب اور چکر بہت آنے لگے ہیں۔" غور کوستے ہوئے اس نے ٹکٹ اٹھا کر فریج میں رکھا اور ملازم کو فرش صاف کرنے کا حکم ملانے کو دیکھ کر کندھے پر ڈالے باہر نکل آئی۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرتے ہوئے ڈاکٹر واسطی سے دیر سے آنے پر کیے جانے والا بہانہ سوچ رہا تھا۔ ہسپتال میں ماحول معمول کا تھا۔ سامنے رہائش تھا۔ دونوں اطراف میں چمکتی دکتی راہداریاں مگر ان راہداریوں میں ادھر ادھر بھاگتے لوگوں میں ہلکا سا "غیر معمولی پن" تھا۔ تھوڑی سی ہلچل، تھوڑی سی افزائگری۔

وہ تیزی سے سامنے سے آتے ڈاکٹر واسطی کی

میں۔ "میں آئے ہی والی تھی کہ میری کار۔" ایک بے ٹھیک ہے "آپ ایمرجنسی میں جائیں۔" کثرت میں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

کیا؟ آج سر نے ڈاکٹا نہیں؟ "وہ حیران ہوتی پٹی کثرت دسپیشن ڈیسک سے اوپر دیوار پر لگے لیوی لیوین پر نظر پڑی۔

وہ یہی کیوڈ فلیش تھی جس سے اسے علم ہوا کہ حادثہ کل اس کا سر نہیں چکرایا تھا۔



حسب حشر رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے سالوں سے مسلسل مریضوں میں گھڑی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ ایمرجنسی میں تھی تو دوسری جنرل وارڈ میں۔ لیویوں کو لانے کا سلسلہ کئی گھنٹوں سے جاری تھا۔ اب تو کچھیر سے بھی لڑائی لائے جا رہے تھے۔ لیوی ڈاکٹر اسلام آباد کے تمام ہسپتال بھرے ہوئے تھے۔ ہر چند منٹ بعد اسٹریجیجر زخمی لائے جا رہے تھے۔ کوئی خون میں لت پت تھا کوئی جسمانی اعضا سے محروم تو کسی کا چہرہ مسخ ہو کر سیاہ ہو چکا تھا۔ غیب منظر تھا۔

لالہ صرف مارگلہ ٹاورز تک محدود نہیں رہا تھا۔ کشمیر کے چناروں تک یہ قیامت خیز ہلاکت پھیلی ہوئی تھی۔ ماسکو، ایبٹ آباد، باغ، وادی، نیلم، وادی، کرم، گڑھی، دہشت، گڑھی، حدیگل، بانا، ڈسٹرکٹ، کلا، اٹاک اور ایسے نام والے بہت سے شہر اور گاؤں جو اب سے پاکستان نے زندگی بھر نہیں سنے تھے۔ سیاست دان اور وزیر تو مارگلہ ٹاورز کے بلے پر کھڑے ہو کر تقریر کر کے اور ٹوٹو بنوا کر جا چکے تھے مگر ہسپتالوں میں دوا، عیسی نافذ تھی۔ جانے کتنی دیر بعد وہ ذرا جو کمرہ دمی کرنے کو ہسپتال کی لابی میں ایک طرف رکھے ہوئے پر جا کر بیٹھی تو قریب بیٹھے کسی ڈاکٹر کا فقر و کالوں

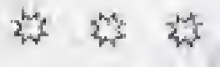
سے ٹکرایا۔ "یہ صوبہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔" اس کا ایک دم بار بار ہائی ہو گیا۔ "گناہوں کی سزا ہے تو پھر اللہ سے سحالی باتیں اور اپنی اصلاح کریں، بجائے ادھر بیٹھ کر دوسروں کو نصیحت کرنے کے تبدیلی ہمیشہ میں سے شروع ہوتی ہے آپ سے نہیں۔" مجھے سے کہہ کر وہ ابھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی راہداری کا موڑ مڑتے ہوئے بے اختیار کسی سے ٹکراتے ٹکراتے چکی۔

"سوری میں۔" "اسی جگہ سے موڑ میں سوری کرتے کرتے وہ رک کر اس نو عمر لڑکے کو دیکھنے لگی جس سے وہ ٹکراتے والی تھی۔ بہت جلدی پہچانی شکل تھی۔ "ارے ڈاکٹر پریشہ؟ کیسی ہیں آپ؟" اس نے آستینیں کھینچی تک چڑھا رکھی تھیں اور غالباً "ڈھیموں کو مار قہ ٹاورز سے لانے میں رضا کارانہ طور پر مدد رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں تمہاری ہوتا جس کے ابا۔" "جی، جس کے ابا کے بارے میں آپ نے پیش گوئی کی تھی کہ انہیں ترقی ملے گی، جبکہ وہ پچھلے ہفتے رشتہ ہو گئے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تو مجھے تو حسیب نے کہا تھا۔ وہی بڑا امپریس تھا جنرل صاحب سے اُمس تو نہیں تھی۔"

"ظاہر ہے، ان جیسا ہیڈ سم کور کمانڈر ہنڈی کو کبھی نہیں ملا۔"

"اچھا پتہ راتے سے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا "اس وقت تک جب تک وہ راہداری کے آخری سرے سے آگے غائب نہ ہو گئی اور پھر سر جھٹک کر خود بھی مخالف سمت کو ہولیا۔



12 اکتوبر 2005ء

"کچھ پتہ چلا تمہارے کنکن کا" فریج "ہسپتال

جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے فون کان سے لگائے پوچھا۔ فرح اس کی کولیگ ڈاکٹر تھی اور ڈاکٹر کے زلزلے کے بعد اسٹھ کلام کرنے کے باعث دونوں میں اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

”نہیں یار! ان کا پارٹنمنٹ دوسرے فلور پر تھا اور مارگلہ ٹاورز کے دوسرے فلور پر تو آٹھ اور فلورز گر پڑے ہیں۔ اچھا میں نے تمہیں فون اس لیے کیا تھا کہ مظفر آباد میں ویرا سٹیڈ بکلی اسٹاف کی ضرورت ہے میں نے وہ لپنٹو کر دیا ہے۔ تم چلو گی؟“

”نہیں میں اوھر ہی ٹھیک ہوں۔ ویسے تم جاؤ گی کیسے؟“

”آری سیلی کلپٹر اور کیسے؟ روڈ ز تو ابھی تک بلاک ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ بھی خاصی ہوئی ہے۔ چلو پھریات ہو گی۔“

پریشے نے الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا اور جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکلی۔ رات تین بجے آکر سوئی تھی سو آج دیر سے آنکھ کھلی تھی۔

”السلام علیکم پچھو! ماموں! آپ ابھی تک سفس نہیں گئے؟“ پچھو بھی ماموں کے ہمراہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں وہ بیک وقت دونوں کو مخاطب کر کے بولی۔

”بس نکلنے لگا ہوں۔ تم نے سحری نہیں کی؟“

”بس اٹھ نہیں سکی مگر نیت کر لی تھی۔“ وہ اپنی

اڑی لاسروائی سے بولی۔ ماموں واقعی جانے ہی والے تھے سو اٹھ کر چلے گئے۔ وہ مروتا کچھ دیر کے لیے پچھو

کے پاس بیٹھ گئی۔

”شادی تو ظاہر ہے اب بھائی کی وجہ سے لیس ہی

کریں گے مگر تیاری تو بہر حال کرنی ہے۔ پری! ابھی

میں پٹیا والوں سے دونوں سیٹ اٹھانے جا رہی ہوں

تم بھی چلو۔ پھر آگے ہندی کا جوڑا بھی پسند کرنا ہے وہ

تم خود ہی کرنا۔ اب مجھے کیا پتا آج کل کی لڑکیوں کی پسند

کے۔“

وہ حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھنے لگی۔

”میں تمہیں لپٹے ہی آئی تھی۔“ انہوں نے

وضاحت کی۔

”نہرا کے لیے پچھو! ملک پر اس وقت آٹھ

ہوئی ہے لوگ مر رہے ہیں اور آپ لوگوں کو

کے جوڑے کی پڑی ہے؟“ اسے سخت صدمہ ہوا

”وہ تو ٹھیک ہے مگر زلزلہ ہم تو نہیں لائے

سکھ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ اب ان کے لیے ہم

خوشیاں بھی خرام کر لیں؟“ پچھو کو اس کی بات

نہیں آئی تھی۔

”دکھ سکھ چلتے نہیں رہتے۔ دکھ تو آتے ہیں اور

جاتے ہیں۔ جانے کتنے بچے بوڑھے اور خاندان

زلزلے میں جان ہار گئے۔ فرح نے کہیں

خوشیاں مناتے اگر ان مرنے والوں میں

ہوتے؟“

”خدا نہ کرے سیف کیوں ہوتا؟“ وہ ہل کر

بہا نہیں دیکھ کر رہ گئی۔ انہوں نے صرف سیف

نام لیا تھا۔ انہیں صرف سیف پیارا تھا۔ یہ نہیں

انہیں نہ آگے تم اور سیف کیل ہوئے؟“ وہ کسی

میں بھی نہ تھی۔

”کم از کم ہاں کا کفن تو میلا ہونے دیا ہوتا پچھو!

تیری سے کہہ کر باہر نکل آئی اور پھر تفتی ہی دیر گاڑی

کے دروازے کے ساتھ کھڑی خود کو مار مل کرنے کی

کوشش کرنے لگی۔

وہ شاید اس دنیا میں کسی کے لیے بھی نہیں

سوائے اس شخص کے جو اسے قراقرم کی پری کہا کرتا

تھا جس نے محبت بھی کی تھی اور اظہار بھی نہیں

تھا۔

ہاسپٹل کے سارے راستے وہ بے آواز روئی آئی

تھی۔ پھر ہاسپٹل پہنچ کر اس نے فوراً ڈاکٹر فرح کو

دھونڈا۔

”فرح! تم مظفر آباد جا رہی ہونا؟ تو پھر مجھے بھی ساتھ

لے چلو۔“ اس نے فرح کو ملتے ہی اپنا یکدم کہا جانے

والا فیصلہ سنا دیا جو وہ تمام راستہ بوجھتی آئی تھی۔

”اب پھر ابھی چلو۔“ فرح نے مصروف سے

کہا اور آگے کو بڑھ گئی۔

وہ آج پچھو ایک دفعہ پھر ان پرانوں میں

جا رہی تھی جن کی شکل نہ دیکھنے کی قسم اس نے

لی تھی۔ تین ماہ قبل بھی وہ پچھو اور نندا آیا کے

دلوں سے نجات کے لیے پہاڑوں میں گئی تھی۔

پھر اس نے فرار حاصل کرنے کا وہی راستہ سوچا

1 اکتوبر 2005 مظفر آباد

دل ہار شوں کا موسم

دل سردیوں کی شامیں

دل دیر لپٹا نہیں

دل ماس لیجی خوشبو

دل موڑ مڑتی سڑکیں

دل سسکوں جگے

دل فرق میں ڈرنا

وہ زشتہ موسموں میں

میرا ہمنوا بنا تھا

جانے وہ اب کہاں ہے؟

جانے وہ اب کہاں ہے؟

وہ ایک اسکول کی محترمہ کمارت کے طے کے

ب کھڑی تھی۔ اس کی پشت پر سبز زار تھا جس کے

کمرے کنارے پر کھڑے جیلی کلپٹر کے پروں کی بھاری

گولڈ اسٹ اس احاطے میں موجود بیسیوں لوگوں کو

ہم پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

محبت کے ٹوٹے ٹکڑوں اور دلی لوبے کی سلوں

کے جانے کتنے بچے ابھی تک زندہ دفن تھے۔ مقامی

لاڈلے کو سیکو نہیں رضا کار اور فوجی جوان مسلسل

پہنا کر بچوں کو نکالنے میں لگے ہوئے تھے۔

وہ بچے سے چند قدم دور بیٹھے پر ہاتھ باندھے خاموشی

کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کچھو سے

کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کچھو سے

نکلنے بل تیز ہوا سے اڑ رہے تھے۔ ہوا میں خلی بڑھتی

جا رہی تھی۔

کسی بچے کے زخمی وجود کو نکال کر اسٹریچر پر ڈالے

فوجی جوان ٹیمپ لے جا رہے تھے۔

وہ گردن موڑ کر اسٹریچر پر موجود معصوم بچے کو دیکھتی

رہی۔

جیلی کلپٹر کی جانب سے کیونفلانج یونیفارم میں لمبوس

ایک آری آفیسر تیزی سے دو جوانوں کو کوئی ہدایت

دے رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا کہ دس سے بیس گلو والے پیکٹ

بنا تے ہیں ایڑی ڈراپ کے لیے مگر انہوں نے۔“

پوچھتے ہوئے وہ ایک تخت رک کر پریشے کو دیکھنے لگا۔

پریشے نے ایک ہر سہری نگاہ اس پر ڈال کر چہرہ داپس

منہدم عمارت کی جانب موڑ لیا۔ اسے کیپٹن بشیر کا

انتظار تھا جس کے ساتھ اس نے ابھی باغ کے

میڈیکل کیمپ جانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ یہ اسٹارٹ سا

آفیسر ابھی تک اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے گردن موڑ

کر اسے دیکھا۔ وہ اب پری کی جانب اشارہ کر کے

کیپٹن بشیر سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کیپٹن بشیر چند لمحوں

بعد کروہاں سے چلا گیا۔ وہ آفیسر پھر سے اسے دیکھنے

لگا۔ وہ پریشے کے لیے قلعہ ۱۲ جلی تھا۔ وہ اگر کسی آری

والے کو جانتی بھی تھی تو وہ وہ تھے جنہوں نے اسے

اکاوشی سے دھسکھو کیا تھا اور وہ آفیسران میں نہ

تھیں تھا۔

پھر جب کیپٹن بشیر آیا تو وہ اس کے ہمراہ وہاں سے

جانے لگی۔

کیپٹن بشیر سے اس کا تعارف وہیں مظفر آباد میں ہوا

تھا۔ وہ بہت سادہ، مؤدب اور اونچا لمبا سا تھا۔ اس کا

باپ فوج میں صوبے دار رہا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کا تیسرا

لڑکا تھا جو فوج میں گیا تھا اور اسے اس پر بے حد خیر تھا۔

پریشے وہاں آری کے فیلڈ ہسپتال میں ہی رہ رہی

تھی۔ بشیر اس دوران اس کی ہر ممکن مدد کرتا رہا تھا۔

دراستی سے اسے ایک دن پریشے نے اپنا "لیزن آفسر" کہا تو ڈاکٹر فرح حیرت سے بولی۔
"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں یہ مائنسین کا نمبرز اور پاکستان آری کا آپس کا جوک ہے۔" وہ ہنس کر بولی تھی اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ اس سے زیادہ وہ کسی سے فری نہیں ہوتی تھی۔

"سنو کیپٹن بشیر! یہ آدمی میرے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟" اس کے ہمراہ چلتے ہوئے پریشے نے پوچھ لیا۔
"وہ آپ کا نام وغیرہ پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا۔"

"اچھا۔" (جانے کون تھا) ہنس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

"ویسے میڈم! میں نہیں جانتا یہ کون تھے۔ ایوی ایشن کے تھے شاید اور۔"

"اچھا ٹھیک ہے اس اوکے۔" لمبی وضاحت سے بچنے کو وہ بولی تو کیپٹن بشیر فوراً خاموش ہو گیا۔ یہ سولین ڈاکٹر بہت موڈی تھی یہ وہ اندازہ کر چکا تھا۔

21 اکتوبر 2005ء

"کتنا خراب ہو رہا ہے زخم کاؤ گاڑا!" وہ برید کرتے ہوئے بچی کی پٹی کھولنے لگی۔ اس بچی کا گھر مسمار ہو گیا تھا۔ وہ 18 اکتوبر کی رات ہی نکال لی گئی تھی مگر ابتدائی طبی امداد کے طور پر اس کا زخم چائے کی پتی سے بند کیا گیا تھا جو اب اسے خراب کر رہی تھی۔

اودھریانغ میں بھی تمام لوگوں کے زخم پونہ بنی بند کیے گئے تھے جو بے حد نقصان دے رہے ہیں مگر خبر وہ اور کرتے بھی کیا۔ وہ اب زخم کو صاف کرتے ہوئے افسوس کر رہی تھی۔

وہ کل ہی باغ سے واپس آئی تھی وہاں روز تقریباً ڈیڑھ سو مریض دیکھتی تھی جو چھ چھٹے سفر کر کے کمپ تک پہنچتے تھے جانے کتنے دنوں سے اس کی

نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔
وہ اس وقت مظفر آباد کے نیلم اسپتال میں تھی۔ فیلڈ ہسپتال کے ایک خیمے میں تھی۔ اس کی سائے اور اس کے دائیں طرف چند اور مریض بھی بیٹھے تھے۔

دلعتنا "کیپٹن بشیر خیمے کا کپڑا ہٹا کر اندر آیا۔
"میڈم! ویکیسین آگئی ہے۔" اس نے پلٹ کر اس کی میز پر رکھا۔ پریشے نے سر اٹھا کر کچھ حیرت سے دیکھا۔

"آگئی جلدی؟ ابھی تو کہا تھا۔"
"یہ دراصل یونسف کے جو ڈاکٹرز تھے وہ لا ہیں۔ ساتھ میں ہائی انرجی ہسپتال بھی ہیں۔"

"اچھا اور اس اسکول کا پورا طبقہ ہٹا؟"
"تقریباً" برٹش ٹیم آئی ہوئی ہے۔
"ہوں۔" وہ سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔

برٹش یونسف جانے کتنے غیر ملکی ادھر آتے ہوئے ہیں۔ اس نے چمک کر مراغلیا کیسٹین شہر وہ جانے لگا تھا اس کی آواز پر جاتے جاتے پلٹا۔

کیپٹن میڈم؟
"جی ہاں بہت سے غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ ترکی سے کوئی نہیں آیا؟" اس نے بظاہر سرسری سا استفسار کیا۔

"آیا تھا۔"
"کائنات ایک بل کو ساکن ہو گئی۔"
"کون؟" وہ سانس روکے اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"رجب طیب اردگان آیا تھا شوکت عزیز کے ساتھ کل پورے علاقے کا دورہ کیا۔"
اس کے اعصاب اچیلے پڑ گئے۔ "اچھا۔" وہ پھر سے بچی کے زخم پر جھک گئی۔

کیپٹن بشیر نے باہر جانے کے لیے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ تب پریشے نے پھر اسے پکارا "سنو کیپٹن! آ۔"

"پڑا ہاتھ میں لیے ٹرک کر اس کی بات سننے لگا۔
"ترکی سے کوئی آئے تو مجھے بتانا۔" جانے کس اس نے کہہ ڈالا۔
"اسی نے آتا ہے کیا؟"

"نہیں" آنا تو نہیں ہے۔ آنا تو کسی نے نہیں ہے۔
"اسی سے سر جھٹک کر بچی کی پٹی کرنے لگی۔
وہ سمجھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ خیمے کا کپڑا اس کے اوپر پلٹا رہ گیا۔

22 اکتوبر 2005ء

فیلڈ ہسپتال سے کچھ دور وہ ایک پھر خاموشی سے بھی جھٹک ہو اکی سر سر اہٹ میں رہی تھی۔ اس نے لمبی اور آل پن رکھا تھا بال کہ جو میں مقید تھے بال میں مقید اور ہلکے گلابی جو کر رہے تھے جن کے رنگ اب پھلکے پڑ گئے تھے۔ اس کی زندگی کی طرح۔

یہ بارش سے کچھ دیر پہلے کا موسم تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح اس موسم میں ہوا میں ہو گئی تھی۔ آج سارا دن برف کا موسم تھا۔ آسمان میں آگے رہے تھے۔
"وجود پہاڑ تو ایک جھکے کے دوہران حقیقتاً" وہ کلچرل میں ٹوٹنے کو تھا۔ آج اس کی چوٹی پر برف بھی پڑی تھی۔

وہ اس اذہاتی شام میں وہاں تنہا بیٹھی کتلہ رہی تھی۔
"ہم لٹی ہیں ہم بچہ ہیں۔"

یہ گیت آف میں کمپ میں ہندو کٹر پورٹرز کو سنا تھا اور جب وہ برفانی غار میں "قید" تھے تب بھی جھٹک کر وہ کی گنگنا تا تھا۔

وہ اتنا بھولا ہی کب تھا۔ وہ تو ہر لمحہ ہریل اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کہیں برف دیکھتی تو اسے آنس کیو میں چت لینا افق یاد آجاتا وہ بارش دیکھتی تو اسے وائٹ ویس کی سیڑھیوں پر کھڑا موروں کو یہی سیلی مجھوں والا ٹرک گیت سنانا افق یاد آجاتا۔ وہ خواب میں آکر اسے کہتی۔

"پری! کیوں پریشان ہوئی ہو؟ مجھے درد نہیں ہو رہا۔"

اور وہ جانتی تھی اسے درد ہو رہا ہے۔
کبھی وہ کہتا "میرے ساتھ چلو۔" میں تمہیں ترکی لے جاؤں گا۔" اور وہ نیند میں ہی مروٹے لگتی۔

اس نے اپنے ہاتھ پر اس جگہ دیکھا جہاں تین ماہ قبل مایہو ڈھنڈ کے کنارے افق نے آفمنٹ لگایا تھا۔ اب وہ معمولی خراش وہاں نہیں تھی مگر وہ اندر ہی اندر "درد" بہت ہوتا تھا۔ اور جب یہ درد شدت اختیار کر لیتا تو وہ رو دیا کرتی تھی۔ "افق۔" واپس لوٹ آؤ۔ میرا زخم ہرا ہو گیا ہے۔ مجھے پیوند کر دو۔ اسی بہانے ہی لوٹ آؤ۔"

وہ اب بھی اس کے ساتھ تھا اس کے کہیں بہت اندر موجود تھا۔ اس کے ساتھ سانس لیتا تھا اس کے ساتھ ہنستا تھا اس کے ساتھ روٹا تھا۔

اس کے خیالات میں غل ہونے والی آواز بھاری بولوں کی دھمک تھی جو اسے اپنی پشت پر سنائی دی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی اس روز والا آدمی آفسر تھا جو اسے گھور رہا تھا۔ کھلتی رنگت، جیسے نقوش کافی چند سم سائے بحر کے رنگ کا آفسر تھا۔
"آپ ڈاکٹر پریشے جہاں لیب ہیں؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہ بات آپ ان روز کیپٹن

بشیر سے معلوم کر چکے ہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔
"معلوم نہیں" کنفرم کیا تھا۔ آپ نے مجھے پہچانا؟ میں مہجر عاصم روٹے ہوں۔ میں نے جی اوسلان کو راکا بوشی سے دیکھ کر کیا تھا؟"

"اوہ!" اس کے ماتھے پر بل غائب ہو گئے۔ "اچھا!" پھر وہی یاد اسے یاد آیا یہ دو ماہی میرا چچا کیوں نہیں چھوڑا؟ "اصل میں مہجر صاحب! میں نے آپ کو سرسری سا ایک موقع ہی دیکھا تھا اس لیے پہچان نہیں پائی۔" وہ مروٹا کہنے لگی۔

"آنس اوکے سیم! مجھے آپ سے ملنا تھا۔ آپ سی ایم ایچ میں بیہوش تھیں اور جس دن ہوش میں آئیں مجھے اسی صبح سی او نے فاروڈ ایریا میں بھیج دیا۔ میں ان ہسپتال میں دن وہاں موسم خراب ہونے کی وجہ سے

اپنے پہلی کاپڑ کے ساتھ stuck ہو کر رہا جب واپس آیا تو آپ جا چکی تھیں۔
”میں چلتی ہوں“ مجھے کچھ مریض دیکھنے ہیں۔
تھینکس اپنی ویز۔“ اسے اس کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سورسی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی پلٹ کر جانے لگی۔

”میم! میرے پاس آپ کی ایک امانت تھی۔ افق اور سلمان نے یہ آپ کے لیے دیا تھا کہ آپ کو ہوش آئے تو دے دوں۔“

وہ بے حد تیزی سے۔ مہجر عاصم کی جانب گھومی تھی۔
”کیا۔ کیا دیا تھا افق نے؟“ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔

”اس روز آپ کو دکھا تو یہ میرے پاس نہیں تھا“
ورنہ دے دیتا۔ کل اسلام آباد گیا تو لے آیا۔“ اس نے والٹ سے ایک چھوٹا سا خط کا لفافہ نکال کر پریشے کی جانب بڑھایا جسے اس نے تیزی سے کھڑا۔

لفافے کے کونے میں سبز رنگ کا آرمی کا کوئی نشان بنا تھا اور اوپر گلکٹ کٹو نمٹ کا ایڈریس لکھا تھا جیسے وہی ایچ کیو سے آیا ہو۔

”یہ لفافہ اس نے مجھ سے لیا تھا۔“ اس کے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھنے پر۔ مہجر عاصم نے وضاحت کی۔

پریشے نے کیکپاتے ہاتھوں سے وہ چھوٹی سی ٹیپ اتاری۔ مہجر عاصم اتنا مذہب تھا کہ پریشے کو یقین تھا افق کے ٹیپ لگانے کے بعد وہی پہلی دفعہ اسے کھول رہی ہے۔

لفافے کے اندر ٹشو میں لپیٹی تصویر تھی۔
دور تک پھیلا سترو، دائیں طرف جھیل، بائیں جانب گھوڑا گھوڑے کے ساتھ پریشے اور پریشے کے اس طرف افق۔ وہ ہنستے ہوئے منہ بہ منہ رہا تھا رکھے ہوئے تھی۔ سیاہ گھڑی کے ڈائل کا اہرام چمک رہا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا ”گھوڑا پریشے کے دائیں طرف ہے۔“

اس نے تصویر کو پلٹا پیچھے سفید کانڈ چپکا کر سبز روشناس سے ہاتھ سے انگریزی میں لکھا تھا۔

زندگی کے سفر میں پھرنے سے پہلے
ملن کے آخری شام کے ڈھلنے سے پہلے
اور ایک دوسرے کی سانسوں اور
دھڑکنوں کی آخری آواز سننے سے پہلے
کہ جس کے بعد تم میری دنیا سے دور چلے جاؤ گے
تمہیں مجھ سے

ایک وعدہ کرنا ہو گا
کہ جب بھی سورج طلوع ہو گا
اور سوات کی دلدلیوں میں روشنی بارش کے قطروں
کی طرح گرے گی

اور قراقرم کے جامنی پہاڑوں پر جی برف پگھلے گی
اور پھر جب اس برف میں دلی داستان لکھ
درمیان میں رہے جانے کی

تب تم کو مجھ سے ایک وعدہ نبھانا ہو گا
کہ اس رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والی
ہر صبح کی ٹھنڈی ہوا
اور ہر بارش کے بعد گیلی مٹی

اور جامنی پہاڑوں پر دھند کی سی جی برف کو
تم مجھے یاد کرنا
کہ یہ میرا تم پر
اور تمہارا مجھ پر

قرض ہے
اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرے گا
تجھ

اسے یاد تھا۔ برف کی دیوار ہے ٹھیک لگاتے اس کا
جانب گردن پھیرے بیٹھا افق۔
”تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔“ اور یاد
اس نے کمرے کرب سے آنکھیں موند لی تھیں۔

کچھ نہیں بولا تھا۔ اس میں بولنے کی وعدہ لینے کی
سکت بھی نہیں تھی۔
”آریو اوکے ڈاکٹر پریشے؟“ اس کو پرائیویسی دے
کے لیے مہجر عاصم جو نا محسوس انداز میں چند قدم
ہٹ چکا تھا اسے روٹے دیکھ کر تشویش سے بولا۔
”کب وہی اس نے یہ آپ کو؟“ جھیلی کی پشت پر
آنسو صاف کر کے وہ زبردستی مسکرائی۔

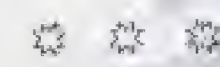
”بپ وہ آپ سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ آپ
میں۔ وہ آپ کے کمرے سے باہر نکلا اور مجھ
خلاف نشوونما اور صاف کانڈ مانگا۔

پھر اس نے پاکٹ سے ایک پیکر نکالی اس کی بیک پر
لگا کر کچھ لکھا، ٹشو میں لپیٹا، پین مجھے دیا اور لفافے
میں کر کے قریب پڑی کسی دوائی کی ڈبی پر لگی ٹیپ
لگا کر نکالی۔ اس نے یہ مجھے آپ کو خود دینے کی تاکید
کی اور جب میں کام سے اسکو رو گیا تھا تو ہلال یا
میں کودے کر جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بعد میں یہ
کو کوریر بھی نہیں کیا حالانکہ آپ کا ایڈریس اور
میرے پاس تھا۔ آپ کو کال بھی کی، ایس ایم ایس
کی کیا، مگر کسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے میری بات
میں سنی۔ پھر میرا پنڈی اتانی تھیں ہوا۔ کام میں بہت
دیر تھا۔ اب اتفاق سے آپ مل گئیں تو میں یہ لے
لا بہت محذرت دور کرنے پر۔“

”مجھے آپ کی کال ریسیو کرنا قطعاً یاد نہیں، مگر
یہ یو سی مہجر عاصم“
”اے اے اے“ وہ دوش میں مسکرایا۔ ایک
لکھ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کیوں مددی تھی۔ کوئی شخص
انہی سوال نہیں۔ وہی ٹیکل بہت ڈینٹ آرمی
میں!

”اور“ وائف اور بچے ٹھیک ہیں آپ کے؟“
پریشے نے یونہی اخلاقاً ”لوچھ لیا۔“
”جی عموش بالکل ٹھیک ہے۔ بچے بھی پنڈی میں
آئے ہیں۔“ وہ سانس کی سے مسکرایا۔ پھر چند ایک
الٹی کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

اور وہ وہاں کھڑی سوچنے لگی کہ کیا افق کو واقعی ”یاد
لے کا وعدہ“ کرنے کی ضرورت تھی؟ کیا وہ اسے
منزل سکتی تھی؟



23 اکتوبر 2005ء

الزے کے متاثرین میں وقت گزرنے کے ساتھ

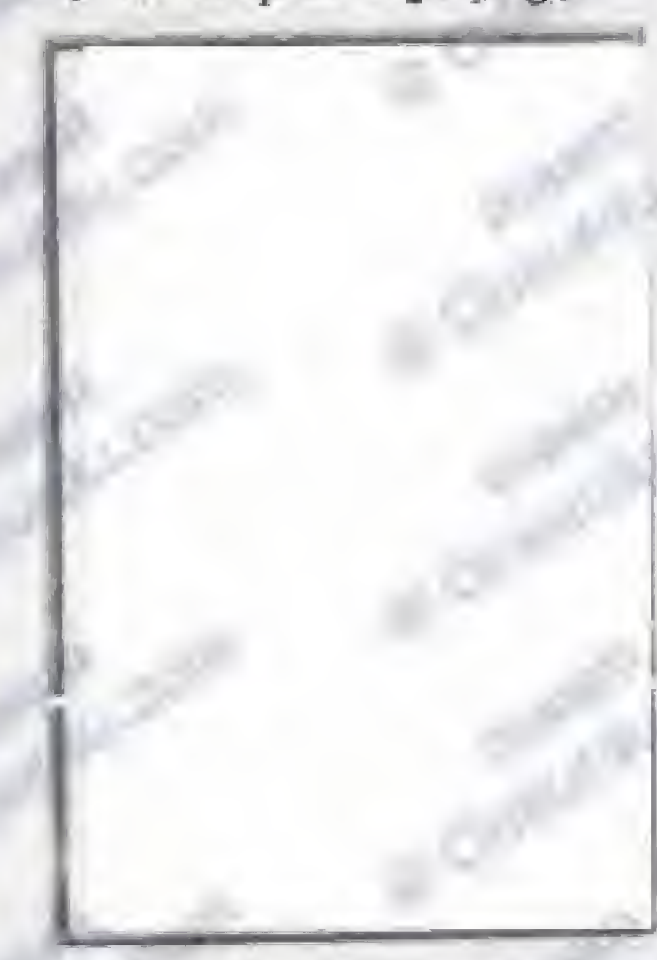
ساتھ tetnus کی دیا پھوٹ رہی تھی۔ اس وقت بھی
وہ اور غرج لپنے خیمے میں بیٹھی متاثرہ افراد کو انجکشن لگا
رہی تھیں۔

”فرح! میں ابھی اسلام آباد واپس جا رہی ہوں۔ تم
چلو گی یا ادھر مزید رہو گی؟“
”تم جا رہی ہو تو میں بھی چلتی ہوں۔ ویسے تم بائی
ایر جا رہی ہو؟“

”ہاں! ابھی بشیر آکر بتائے گا کہ۔۔۔ پہلی کاپڑ فارغ
ہے یا نہیں۔“ اسی اثناء میں کپٹن بشیر اندر آیا۔
”میڈم! پہلی بس آنے ہی والا ہے۔ کرنل طارق
اس میں کچھ لوگوں کو لے کر آرہے ہیں۔ بس آتے ہی
ہوں گے۔“

”اچھا۔“ وہ جھک کر بچے کو ننگے لگا رہی تھی پھر
بے حد نگر بندی سے ساتھ بیٹھی اس کی ماں سے اس کے
بارے میں سوالات کرنے لگی، کیونکہ اسے تیز بخار
تھا۔

کپٹن بشیر نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو
”اے اے اے“ وہ دوش میں مسکرایا۔ ایک
لکھ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کیوں مددی تھی۔ کوئی شخص
انہی سوال نہیں۔ وہی ٹیکل بہت ڈینٹ آرمی
میں!



جتائے کہ جو لوگ کرنل طارق کے ہیلی کرپٹر آباد آ رہے تھے وہ ترکی سے آئے تھے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے ترکی سے آنے والوں کے متعلق پوچھا تھا، مگر ایک تو وہ اتنی مصروف تھی، دوسرا اس نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ ترکی سے آنا تو کسی نے نہیں ہے اور پھر ڈاکٹر صاحب کو اگر ترکی سے آنے والوں میں کوئی دلچسپی ہوگی تو وہ یقیناً ”ترک ڈاکٹرز سے ہوگی۔ کیپٹن بشیر کچھ کئے بغیر وہاں سے چلا گیا، کیونکہ آنے والے ڈاکٹرز نہیں، انجینئرز تھے۔

آدھے گھنٹے بعد یہ کیپٹن بشیر ہی تھا جس نے دونوں کو کرنل طارق کے پتے کی اطلاع دی۔
”آپ سلمان وغیرہ پیک کر کے جلدی آجائیں، کیونکہ کرنل صاحب نے فوراً واپس جانا ہے۔ پائیر میڈم دیر مت کیجیے گا، کیونکہ کرنل صاحب کا غصہ پوری یونٹ میں مشہور ہے۔“

”ہاں میں ذرا اپنا سامان اس خیمے سے لے لوں جہاں رات ہم سوئے تھے۔“ وہ اس خیمے سے نکل آئی۔ اس کا رخ چند گز کے فاصلے پر موجود اس میدان کے سب سے آخری سبز خیمے کی جانب تھا جس میں وہ اور فرخ اتنے دن سے رہ رہی تھیں۔

وہاں کھلا سامان تھا، ایک طرف خیمہ بستی تھی، دوسری جانب خالی قطعہ اراضی پر ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے نیچے ابھی گھاس سے چند فٹ دور تھے۔

وہ اس آخری خیمے میں چلی آئی جلدی جلدی سامان سمیٹنا بالوں کو ایک دفعہ پھر اوپر کر کے کھینچو میں باندھا۔ کسی چیز کے چمکنے کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ دھیان دیے بغیر شل لیٹے، بیک کندھے پر ڈالے باہر آگئی۔

فرخ اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔
”چلو۔“

وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھنے لگیں۔ وہاں ارب گرد و دھیروں لوگ، جن میں اکثریت فوجی جوانوں کی تھی، ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

چند فوجی جوان ان مریضوں کو ہیلی کاپٹر میں رہے تھے جن کو انہیں سرجری اور طبی امداد کے لیے اسلام آباد لے جانا تھا۔ بشیر نے قریب سے ایک جوان کو روک کر ہدایت دی۔ ”Tok-1 کی طرف اس آخری خیمے میں لے جاؤ۔ ابھی وہی خالی ہے۔“ وہ دونوں سر نیچے کیے تیز ہوا سے بچتی آگے اندر داخل ہوئیں۔ مریض پہنچ چکے تھے۔ دروازہ ہو گیا۔ پریشے نے ہیڈ فون چڑھانے سے قبل شل آ کر بالوں کو دوبارہ سنوارنا چاہا مگر یہ کیا؟ اس کے قدم کے ایک طرف لگا دو رنگا پتھر غائب تھا۔

”اب کہاں ڈھونڈوں اسے؟ کبھی سستی میں اہلکار بھی نہیں جو یہاں۔“ وہ کپڑے جھانڈنے لگی۔ اسے روشنی خاصی کم تھی اسے پتھر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ ”فرخ! اس کا پتھر گر گیا ہے۔ وہ کونے والے میں گرا ہو گا۔ میں لے آؤں؟“

”بیوقوف، ہیلی اڑنے لگا ہے۔ کرنل طارق کے غصے کے قصبے نہیں سنے؟ خواجوادان کو غصہ منٹ دلاؤ۔“ مگر قریب وہ قہقہے پتھر تھا اور۔

”لوگوں کا گھیر مار لٹ گیا اور تمہیں پتھر کی پڑی ہے؟ ایک پتھر کے لیے۔ کرنل صاحب سے دوبارہ یہی اترواؤ گی؟“ فرخ بالکل نشاء کی گھرکتی تھی۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی، مگر جانے کیوں اس لیے اس دن چاہا کہ وہ کرنل طارق سے ہیلی اڑانے کی درخواست کرے، صرف ایک منٹ کے لیے۔ بس اپنا پتھر لے آئے۔

صرف پتھر نہیں، اس لمحے اسے مظفر آباد کے شہر خوشاں کی اداس اور سوگوار فضا میں ”کچھ اور“ محسوس ہوا تھا، کچھ ایسا جو ان پہنچنے سے بہت سارے دنوں میں اس نے وہاں گزارے تھے، نہیں تھا۔ وہ اس وقت ہیلی کاپٹر سے نیچے اترنا چاہتی تھی، وہ مظفر آباد چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، مگر محض موت میں وہ خاموشی سے ٹپکی

اور فرخ کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر کیپٹن بشیر تیز سے واپس آیا۔ جس جوان کو اس نے Tok-1 کے خیمے میں بٹھانے کو کہا تھا، وہ ان تین افراد کے آخری خیمے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ تینوں افراد ہیلی کاپٹر میں بیٹھے تھے۔

اس کے قریب آیا۔
”سلام علیکم سر!“
اس ایک ساتھ ملے۔

”کرنل انجینئر! کچھ قیامت کا مالک تھا۔ بال رگت، یورپین نقوش۔“

”نئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔“ آئی ایم کیپٹن اس کی انگریزی پورے گاؤں میں بہترین تھی۔ ”کرنل جنک۔“ ”کرنل انجینئر نے گرجوٹی سے کھانا کیپٹن بشیر دوسرے کی جانب بڑھا۔ وہ قدموں سے چار پانچ انچ چھوٹا تھا۔ بال کھنکھریالے، سر پر الٹی پی کیپ تھی۔

”قیددار کیسے کچھ لکھا تھا۔“

”کرنل۔“ اس نے خوشدلی سے بشیر سے کہا۔

”اٹھنی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اب اس نے کی جانب دیکھا۔

”کرنل انجینئر ان دونوں سے ایک قدم پیچھے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس کے سر پر کی پی کیپ تھی اور دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔

”کرنل بشیر کے ہاتھ بڑھانے پر وہ دایاں ہاتھ جیب میں کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا۔ اچھر روشنی میں آیا جس پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ ”اتنی حسین ارسلان۔“ اس نے اپنا تعارف دیا۔ اس میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس سے بشیر متاثر ہوا تھا۔ شاید وہ بہت پنڈ سم تھا، یا اس کی شخصیت میں عجیب سی مقناطیسیات تھی، دل کو مسمرانز کر دیا کرتی تھی۔

اور صاف تھا ماسوائے دور افتق پر تیرتے سیاہ پادلوں کے
جھنڈ کے، جو ابھی اسلام آباد سے خاصے دور تھے۔
گاڑی کھڑی کر کے وہ مین گیٹ عبور کر کے سی ایم
ایچ کی بلڈنگ کی جانب جانے والی ڈھلوان پر بنی سڑک
اترنے لگی۔ ڈھلوان کی اترائی کے آغاز میں سڑک کے
دونوں اطراف میں دو بڑے بڑے سرسبز درخت تھے۔
وہ ان کے قریب سے گزرنے ہی لگی تھی کہ نیچے سے
آتے میجر ڈاکٹر نعمان پر نگاہ پڑی۔ وہ عجلت میں اپنے
بھاری بوتلوں کی دھمک پیدا کرنا سڑک پر اوپر چڑھ ہی رہا
تھا کہ اسے وہاں دیکھ کر ٹھنکا اور پھر شناسائی سے مسکرا
کر تیزی سے اس کی جانب بلند ہوتے راستے پر چڑھنے
لگا۔

اس نے وہیں دونوں درختوں کے درمیان سڑک پر
قدم روک لیے اور جوالی مسکراہٹ کے ساتھ میجر
نعمان کو دیکھا۔

ان دونوں نے کئی دن سی ایم ایچ میں ساتھ کام کیا تھا
یوں سی ایم ایچ میں ملنا کوئی اتفاق نہ تھا کہ ظاہر ہے وہ
ہندی پوسٹڈ تھا اور سی ایم ایچ آنے پر پریشانی کا اس سے
فکراؤ ہونا لازم تھا۔

”کیسے مزاج ہیں ڈاکٹر صاحب؟ خیریت سے سی ایم
ایچ آئی ہیں؟“ وہ چند قلمیوں کی ہلندی عبور کر کے اس
تک آگیا تھا۔

”خیریت سے ہسپتال کون آتا ہے میجر صاحب؟“
بریکنڈ سرباجوہ کی سسڑی عیادت کے لیے آئی تھی ان کا
آپریشن ہوا تھا اور آپ کب آئے مظفر آباد سے؟“
ٹھنڈی ہوا ایک لمحے کو زور سے چلی۔ دونوں
درختوں کے سبز پتوں کے درمیان سے سوکھے زرد پتے
نیچے آن گئے۔

”صبح ارلی پہنچا تھا اور اب آپ کے سامنے ہوں۔“
یونیفارم اور سرخ ٹوپی میں ملبوس اس کے تروتار
چہرے پر تھکاوٹ اور سفر کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔
”کیسی گزر رہی ہے مظفر آباد میں؟“
دائیں جانب والے درخت تلے گھاس پھوس گھرے
خشک پتوں کے قریب ایک چڑیا پھدک رہی تھی۔

”بس میڈم! کام ہو رہا ہے۔ کوشش تو سب
رہے ہیں آگے حوالہ کو منظور اور آپ ٹھیک ہیں
چڑیا اب ایک سوکھے بھورے پتے کو چونک کر
لگی تھی۔

”ایم فائن، ٹھیکس اور کیپٹن بشیر وغیرہ سب
ٹھیک ہیں؟“ ٹھنڈی ہوا ایک دفعہ پھر زور سے چلی۔
گھاس پر گرے زرد پتے اڑ کر اوہر اوہر بکھرتے ہوئے
سڑک تک آ گئے۔

”الحمد للہ سب ٹھیک ہیں۔ کمپ بھی ٹھیک
ہے۔ کچھ فارنرز بھی آئے ہوئے ہیں۔ فارنرز
بھی تھے مگر پرسوں جن لوگوں سے مل کر آ رہا ہوں
کے سوشل ورک کے جذبے نے تو مجھے حیران
کے خیر کام تو ہو رہا ہے آگے دیکھیں۔“ (شری

بولنے کا خاصا شوٹن تھا، ورنہ آری والوں کو عموماً
نے ٹودی پوائنٹ بات کرتے دیکھا تھا۔) مسز باجی
خیر ابھی کچھ ٹیسٹ کروانے تھے، انہیں دو
ڈیہار ٹیسٹ تک لے کر گئے ہیں آپ کو کچھ دیر
کرتا رہے گا۔ میں یہ کہتا ہوں وہ مردم میں آجائے
میں آپ کو بتا دوں گا۔“

”ارے میجر نعمان! میں خود دیکھ لوں گی۔
خواجہ اتنی تکلیف نہ کریں۔“ وہ اس کا صرف
وجہ سے کہ وہ کمپ میں ساتھ تھی اتنا خیال کر
وہ شرمندہ ہونے لگی۔

”کوئی پراہم نہیں، میں دیکھ آتا ہوں۔ آپ
تکسٹنگ روم میں بیٹھ جائیں۔“
چڑیا اب میجر نعمان کے عقب میں سڑک پر
پتوں تک پھدک پھدک کر آگئی اور ایک پتے
مارنے لگی۔

”نہیں، میں اوہر ہی ٹھیک ہوں۔ آج صبح
اچھا ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، جس
چادر میں عین اس کے سر کے اوپر روٹی کے
طرح کا چھوٹا سا پادل تیر رہا تھا اور اسی سے
اور میں تو ویسے بھی خوب صورت موسموں
ہوں۔ میں یہاں قطعاً بھور نہیں ہوں گی۔“

”چلیں“ پھر میں آپ کو جاتا ہوں۔“ وہ اگلے قدموں پر مڑ گیا۔ بھوری چڑیا سہم کر اڑ گئی۔ مہجر نعمان سڑک کی دھولوان اترنے لگا۔ چڑیا دائیں طرف والے درخت پر جا بیٹھی۔ وہ دور ہو گیا تو وہ واپس درخت کے نیچے گھاس پر آگئی۔

پریشے اسے جانا دیکھتی رہی، پھر دائیں طرف اگے درخت کے قریب آئی اور اس کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بھوری چڑیا اس کے بالکل سامنے والے درخت کے نیچے گھاس پر چوچیں مار رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا زور دار جھونکا آیا۔ دونوں درختوں سے پھر سے زرد پتوں کی بارش ہوئی۔ کچھ اس کے اطراف اور کچھ اوپر گر گئے۔

وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بستے لمحوں کو یاد کرنے لگی جب انہی خوب صورت موسموں میں وہ ساتھ ساتھ دایوں اور غراووں اور چشموں میں پھرتے تھے، ایسا ہی ایک درخت تھا جس کے تنے سے کبھی وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے اور ایسی ہی گھاس تھی جس پر اپنا گھنٹا بھاڑتے ہوئے افق کی پینٹ پر سے سرخ رنگ کا کیرا اڑتا تھا۔

بھوری چڑیا اب پھدکتی ہوئی سڑک تک آگئی اور سرمئی تارکول میں ادھر ادھر چوچ مارتی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ زرد سوکھے چرمر کرتے چند پتے ابھی تک اس کے بالوں گود اور دوپٹے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے لب دھیرے دھیرے گنگنائے گئے، وہ گیت جو کبھی موسلا دھار بارش میں بھگیتے ہوئے ان چوڑی میڑھیوں پر کھڑے افق ارسلان پنجرے میں مقید موروں کو سنایا کرتا تھا۔

نہ کچھ کہو ہمیں ہم اس راہ کے مسافر ہیں ہم عشق میں پاگل ہیں نہ کچھ کہو ہمیں ہم اپنی ہیں ہم محفول ہیں شاید بلی نے فیس سے اتنی محبت نہیں کی ہوگی

جتنی پری نے اپنے کوہ پیما سے کی تھی پھر بھی آج وہی دلائل تھے۔

وہ جانے کنسی دیر Kayahan کا وہ ترک گیت گنگنائی رہی، ”دفعنا“ کسی احساس کے تحت آنکھیں کھولیں۔

بھوری چڑیا دوبارہ سہم کر سامنے والے درخت کے عقب میں چھپ گئی تھی کیونکہ اب وہاں سڑک پر مہجر نعمان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”آپ نے غلط پرو فیشن چوز کیا ڈاکٹر صاحب! آپ تو بہت اچھا گنگنائی ہیں، پھر میڈیکل میں کیوں آگئیں“

”نہیں، یہ تو بس ایسے ہی ایک صنف کرکیتی وہ اندھ کھڑی ہوئی۔ زرد پتوں کا دھیرا اس کی گود سے نیچے گھاس پر گرنا۔“

”بریلیڈ سر صاحب کی واکف واپس روم میں آپکی ہیں آپ ان سے مل لیں۔“ پھر وہ ایک کھٹے کے خوف سے کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”وہ ڈاکٹر صاحب کی کت کا سنا مشورے کیا؟“

”نہیں، اس نے فیس کر چھوڑا ہے۔“

”تک کر نیچے کر گئے۔“ آپ پاکستان میں اسے کسی کے صاحب سے نہیں سنیں گے۔“

”آرے نہیں میڈم! میں نے کل ان فکٹ ہی گیت افق ارسلان کو گاتے سنا تھا۔“

سرد ہوا کا تیز جھونکا پھر سے آیا اس کے اوپر سوکھے پتوں کی بارش پھر سے ہوئی اور وہ سب وہ اس کی طرف ساکت سی۔ مہجر نعمان کو دیکھ رہی تھی۔

”کس کو؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ شاید اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا تھا۔

”افق ارسلان کو آپ نہیں جانتیں، وہ ترک انجینئر ہے نا؟ اس کی بات کر رہا تھا۔ خیر آپ مسز اجوہ سے مل لیں جا کر۔“ اس نے پھر سے اطلاع دی، مگر وہ مسز اجوہ سمیت دنیا کی ہر شے بھول چکی تھی۔

”تک۔۔۔ کون سا ترک انجینئر؟“ شاید اس نے غلط سنا تھا۔ وہ شاید کوئی اور نام لے رہا تھا۔

”افق ارسلان نام ہے اس کا۔“

وہ ہلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔ ”وہ آپ کو کمال ملا؟“

”وہیں منظر آباد میں۔ وہ ریلیف اینڈ ریسکیو ورک کے لیے ترکی سے آیا ہے۔ کل یہی گانا گارہا تھا“

”شاید یہ ترک گیت ہے۔“ وہ جس طرح مہجر نعمان کو دیکھ رہی تھی وہ اچھ سا لیا۔

”مگر مگر میں نے تو منظر آباد میں کوئی ترک انجینئر نہیں دیکھا۔“ اس کا وجود قیامت خیز زلزلوں کی زد میں تھا، آواز چھٹی پھٹی سی نکلی۔

”وہ اس روز بلکہ اسی پہلی پر آیا تھا کرمل طارق کے ہمراہ جس پر آپ دلچسپی لیں، شاید اسی لیے۔“

اب کے مہجر نعمان کو واضح بے ہوشی ہوئی تھی۔

”اسی پہلی پر؟“ وہ بے خبری کہیں دھڑک رہی تھی۔ اسے یاد تھا اس روز وہ کرمل طارق کے ہمراہ اپنے والے مسافروں کو دیکھ نہیں سکی تھی۔

”آرہو اوکے ڈاکٹر جیال زیب؟“

وہ بے اختیار چمکی۔ مہجر نعمان تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے سر ہلایا۔

”نہیں، وہ اس کا پورا نام کیا ہے؟“

مہجر نعمان نے ایک گہری سانس بھری۔ ”افق حسین ارسلان“ اب وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا، وہ شاید اسے جانتی تھی اور اب کفر کرنا چاہ رہی تھی۔

”یہ حسن حسین ارسلان کی خون پسینی کی کمانی ہے جسے ہم بلبل کہتے ہیں، جھونک رہے ہیں۔“ اس کے ذہن میں بہت سارے دن پہلے کہا گیا افق کا قصہ گونجا۔

”افق حسین ارسلان؟“ اس نے زیر لب پوچھا۔

افق ارسلان ترکی کا سب سے کامن نام تھا مگر حسین تو شاید صرف اس کے افق کے نام میں آتا تھا تو کیا مہجر نعمان اس کے افق کی بات کر رہا تھا؟

عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”مہجر نعمان۔۔۔ وہ وہ کیسا دکھتا ہے؟“ وہ کھوئے کھوئے لبے میں پوچھنے لگی۔

”آہ۔۔۔ مہجر نعمان سوچتے ہوئے بتانے لگا، ”خاصا

اونچا لہا سا ہے، مجھ سے بھی دو انچ لمبا ہو گا۔ سکس ون یا سکس ٹو۔ بال براؤن ہیں اور آنکھیں۔“

”اور آنکھیں؟“ وہ سانس روکے جواب کی منتظر تھی۔

”کوئی لائنٹ کلر تھا۔“

”ہنی کلر؟“

”شاید ایسی ہی تھیں۔ سوری میں نے غور نہیں کیا۔ یہ لڑکیوں کا شعبہ ہے۔“ وہ ہنس دیا مگر وہ کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔

”وہ انجینئر ہے نا تو سر پر کیپ تو لیتا ہو گا؟“

مہجر نعمان نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

”اس کی کیپ کی پشت پر کچھ لکھا بھی ہو گا؟“ وہ اپنے دل کی تصدیق و نشانی کے لیے کہہ رہی تھی ورنہ دل تو جیجی کر گواہی دے رہا تھا کہ وہ افق ارسلان اس کا کوہ پیما ہی تھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں لکھا تھا۔“

”اچھا۔۔۔“ اسے واضح یاد سی ہوئی۔ اسے یاد تھا افق کی کیپ کی پشت پر۔ مگر وہ افق کی کیپ تو نہیں دیکھی تھی۔

”اس کے۔۔۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو گا۔ کوئی دوسرا انجینئر؟“ وہ بے تلی سے بولی۔

”جی ہاں انجینئر اور بھی تھے۔“ پھر وہ قدرے توقف سے بولا، ”ہاں ان میں سے ایک کے سر پر جو کیپ تھی اس پر وائنٹ کلر سے طیب اردگان کے حق میں نعروں درج تھا، جینک یقین نام ہے اس کا۔“

اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

”اور تیسرا کون ہے ڈاکٹر؟“

”نہیں، وہ بھی انجینئر ہے۔ کہنی۔“

”ان کے ساتھ کوئی ترک ڈاکٹر نہیں ہے؟“

”میں نے تو نہیں دیکھا، شاید یونیسف کے ساتھ جو ڈاکٹر تھے ان میں سے کوئی ترک ہو۔ آپ جانتی ہیں انہیں؟ ای پی پر ایلم؟“ بہت عمل سے اس کے تمام سوالوں کا جواب دینے کے بعد وہ اپنے فطری تجسس کو

چھپانہ سکا۔
 ”میرا کچھ کھو گیا تھا ان پرانوں میں۔ وہی ڈھونڈنا ہے۔“ وہ جیسے خود سے بولی تھی۔
 ”وہ کیا کھو گیا تھا؟ آپ کی چوہری وغیرہ کا وہ دور نگاہیم اسٹون جو وہاں خیمے میں گر گیا تھا؟“
 پریشے نے چونک کر اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”ہاں وہی۔“
 ”وہ کیپٹن بشیر کے پاس ہے، بلکہ ان کی کھٹ انہی انجینئرز کے پاس ہے۔ شاید کل کیپٹن بشیر اس کو ساتھ لے آئے۔“
 ”پتھر کو؟“
 ”نہیں اس انجینئر افق ارسلان کو۔ اس نے امانت آپ کا قیمتی پتھر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں بتانا بھول گیا تھا۔ وہ آپ کو مل جائے گا ڈونشوری۔ آپ سنباجوہ سے مل لیں۔“ وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔
 وہ مظفر آباد میں تھا؟ اس روز وہ مظفر آباد آیا تھا اور وہ چلی گئی تھی مگر جانے سے قبل اسے محسوس ہوا تھا کہ اس شہر فحوشاں کی سی ویرانیوں والی راوی میں جہاں سلیم کاپانی اور بھی آواز میں رہتا تھا کوئی اس لمحے آیا تھا۔ کوئی جو اس کی زندگی تھا۔
 وہ مظفر آباد میں اسی آسمان تلے تھا جس کے نیچے وہ اس وقت کھڑی تھی؟ وہ خدا یا وہ کیوں علی آئی وہاں سے؟
 اور نعمان کیا کہہ رہا تھا؟ بشیر کل افق کو اس کے پاس لانے والا تھا؟ مگر کل میں تو ابھی کئی گھنٹے پرانے تھے وہ کل کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے عجیب سی۔ بے چینی و بے قراری ہونے لگی۔ اسے افق کے پاس جانا تھا ابھی اور اسی وقت۔
 اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میجر نعمان کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان میں وہ بادل کا ٹکڑا وہ حصوں میں بٹ چکا تھا۔ بھوری چٹیا اب وہاں نہیں تھی۔ سڑک پر زرد پتے اسی طرح بکھرے

تھے۔
 وہ جیزی سے ڈھلوان اترنے لگی۔ سوکھے پتوں سے اس کے پنک اور سفید جو گرز ٹکرائے تو وہ چرمر کی آواز کے ساتھ کچلتے گئے۔ وہ تقریباً ”بھاگتے ہوئے ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوئی۔“
 ہسپتال پر ایک سفید یونیفارم والی لڑکی اور خالی یونیفارم والا لڑکا بیٹھا تھا۔
 وہ ان کی جانب لگی۔
 ”میجر ڈاکٹر نعمان کدھر ہیں؟“
 لڑکا نا سمجھی کے عالم میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لڑکی نے کہا۔
 ”اوہ رائنٹ سائڈ پر جائیں گا ریڈور کے آخر میں لیفٹ۔“ وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر پریشے نے بغیر دیکھیں جانب بھائی کا ریڈور عبور کیا۔ آگے دو اطراف بھائی راہداریاں تھیں۔ پتہ نہیں لڑکی نے کیا بتایا تھا۔ وہ کس طرف جائے؟ پھر اندازے سے وہ ایک جانب کو مڑ گئی۔ جانے سی ایم ایچ میں اتنی بھول بھالیاں تھیں کہ ”کارڈیڈور کے اختتام پر اسے میجر نعمان کی آغوش سے بات کرنا چاہی۔ وہ دوڑ کر اس کی طرف چلی۔“
 ”میجر نعمان۔۔۔“ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میجر نعمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ دوسرے انجینئر کو کچھ کہہ کر وہاں سے بھیج دیا اور پتھر کی جانب مڑا۔
 ”ریلیکس ڈاکٹر صاحب! آرام سے بتائیں۔“
 ”ہے؟ سنباجوہ نہیں ملیں آپ کو؟“
 ”بھاڑ میں جائیں سنباجوہ۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی پھر چند گہری سانسیں بھرتے ہوئے نفس بھال کیا۔
 ”آج کوئی پہلی مظفر آباد جا رہا ہے؟“
 ”پہلی تو روز ہی جاتے ہیں۔ ابھی تو کتنے رکوٹ ایریا ز ہیں جہاں سے طلبہ نہیں ہٹایا جاسکا۔ آپ کو کیا مظفر آباد جانا ہے؟“
 ”جی پلیز مجھے ابھی جانا ہے۔“
 ”ابھی تو۔۔۔ وہ سوج میں پڑ گیا۔“ شاید ہمارے ایک

لڑکے صاحب سانسو جا رہے تھے۔
 ”تو مجھے راستے میں مظفر آباد چھوڑ دیں۔“ وہ پہلی سے بولی۔
 ”مظفر آباد سانسو کے راستے میں نہیں چڑتا؟“ ڈاکٹر صاحب آپ کو کوئی ایرجیسی ہے کیا؟“
 ”ہاں۔۔۔ وہ میرا پتھر۔“
 ”تو کل وہ لوگ لے تو آئیں گے۔“
 ”مگر کل میں ابھی کالی دیر ہے۔ میرا پتھر بہت قیمتی تھا۔ مجھ سے اتنا انتظار نہیں ہو گا۔ مجھے ابھی ان سے بات کرنی ہے۔“
 ”بات کرنی ہے؟ تو وہ میں کرا دیتا ہوں۔“
 ”کہہ کیسے؟“ لڑکی نے کچھ حیرت ہوئی۔
 ”مثلاً۔“ لڑکی سو برس پہلے گراہم ہیل نامی آدمی نے ایک چیز بتائی تھی جسے ہم فون بولتے ہیں۔“
 ”وہ تو مجھے پتا ہے مگر مواصلات کا نظام تو ڈاکٹر صاحب سنگٹل نہیں آ رہے تھے وہاں۔“
 ”اب کچھ کچھ آئے گے ہیں اور اب بھی آئیں گے۔“ وہ لڑکی نے دہری آرمی کا رابطہ تو جب آپ مجھے یہ سن رہے ہیں۔ میں آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔“
 وہ کہہ کر چلا گیا اور پریشے وہیں ٹائلز سے جھپکے ریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے اضطراب کی کیفیت میں انگلیاں مروڑتے لگی۔
 اس کے پر ہوتے تو وہ ڈاکٹر مظفر آباد جا پہنچی۔ اسے ہر حال میں افق سے ملنا تھا اسے دیکھنا تھا۔
 ”آپ خدائے ایشیا کی عیسیٰ آئی وہاں سے؟“
 وہ بے چینی سے وہیں کارڈیڈور میں ٹھہرنے لگی۔ پتہ نہیں میں منٹ کب گزر رہی گے اور وہ افق کی آواز سن سکے گی؟ اس کی مدد کیا سی تھی؟ اس کی سماعتیں پیاسی تھیں۔
 ہاتھ اب دو ماہ بعد وہ کیسا ہو گا؟ ویسے ہی ہنستا ہو گا؟ ویسے ہی مسکراتے ہوئے اس کی شد رنگ آنکھیں پہلی ہو جاتی ہوں گی؟
 اس کا دل اتنی بے قراری سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ہی سینہ ٹوڑ کر باہر آجائے گا جانے میں منٹ

پورے ہوئے بھی تھے یا نہیں وہ مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے اور انتظار ہو ہی نہیں رہا تھا۔ سو وہ اتنی گہری کی طرف چلی گئی جہاں میجر نعمان گیا تھا۔ بے قراری اتنی زیادہ تھی کہ تذبذب کے قوائد کو بھلا کر بغیر دستک دیے اندر داخل ہو گئی۔
 میجر نعمان ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور کلن سے لگائے ٹیبل کے پیچھے کھڑا بات کر رہا تھا۔
 جانے ذلیف کام تھا یا سید لاٹ فون یا عام فون! ”ہاں میں انہیں بلاتا ہوں، بلکہ وہ آہی گئی ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے پریشے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں چلتی ہوئی اس تک آئی تھی۔
 ”آپ نے کس انجینئر سے بات کر لی ہے؟“ اس نے سناؤ تھا پس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
 ”افق۔۔۔ افق ارسلان سے۔“ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔
 ”ہاں افق ارسلان سے بات کراؤ۔“ میجر نعمان نے ریسیور اس کی جانب بڑھا دیا اور ایک طرف سے کلن کر گہرے سے باہر چلا گیا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔
 کتنی ہی دیر وہ فون کا ریسیور ہاتھ میں لیے اسے دیکھتی رہی اسے افق سے کیا کہنا تھا اسے معلوم نہیں تھا اور جانے وہ اس کا افق تھا بھی یا نہیں؟
 اس نے ریسیور کلن سے لگایا۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر سارے الفاظ لبوں پر دم توڑ گئے۔
 دوسری جانب کوئی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پھر پریشے کی سماعتوں میں آواز گونجی۔
 ”پاری شے؟“
 اور اس لمحے پوری کائنات رک گئی تھی۔
 وہ اس آواز کو لاکھوں کے مجمع میں شناخت کر سکتی تھی۔ وہ آواز جو کسی نغمہ ساز کی دھن سے زیادہ مدھر اور خوب صورت تھی۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ اس کا افق ارسلان ہی تھا۔ وہ پری کا کہہ پتا ہی تھا۔
 اس کے پاؤں لڑکھڑانے کو تھے اس نے بے اختیار

میز کا کونا مضبوطی سے تھام لیا۔

”پری! ہو لو نا پری۔ میں سن رہا ہوں۔“
اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

”افسوس۔“

”کیسی ہو پری؟“ وہ شاید اواسی سے مسکرایا تھا۔

”تم۔ تم کہاں ہو افق؟“ وہ اسی طرح حریسور کان سے لگائے دو سرے ہاتھ سے میز کا کونا پکڑے کھڑی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چہرے پر گرنے لگے تھے۔

”میں ہالیوڈ کے آسمان کے نیچے ہوں۔“

تو ایک دفعہ پھر ہالیوڈ کا آسمان دونوں کے بیچ آچکا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر ان ہانڈوں میں واپس آچکا تھا جہاں سے پہلے اسے واپس لانی تھی۔

”تم رو رہی ہو پری؟“ وہ بے چین سا ہو گیا۔

اس نے جواب نہیں دیا ”اسی طرح بے آواز روتی رہی۔“

”پری مت رو۔ پلیز آنکھیں صاف کرو۔“ وہ اس سے بہت دور تھا مگر اس کے اسے خود سے بہت قریب محسوس ہوا تھا۔ اس نے میز کا کونا چھوڑ دیا اور اس ہاتھ کی پاشٹ سے بھگا چہرہ صاف کیا۔

”اب بتاؤ کیسی ہو؟“ وہ جانے کیسے سمجھ چکا تھا کہ وہ آنکھیں صاف کر چکی ہے سوزی سے پوچھنے لگا۔

”بہت اچھی وہاں ہوں میں افق! بہت ویران۔ اتنی ویرانیاں میرا مقدر کیوں بن گئی ہیں؟ میں کیوں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں؟ میں نے تو وہ سب بھی کیا جو کسی لڑکی کسی بصر نے نہیں کیا ہو گا۔ سوہنی کا تو صرف گھر اٹوٹا تھا جبکہ میرا تو سب کچھ دہائی کی دھند میں ٹوٹ کر بکھر گیا۔ پھر بھی منزل نہیں ملی؟ میں نے تو۔ میں نے تو عشق میں برف کا صحرا پار کیا تھا۔ پھر بھی ساری ریاضتیں رائیجاں چلی گئیں؟“ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ ”تم تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے افق؟“

”تم ہی نے تو کہا تھا۔“ وہ بہت آہستہ سے بولا۔

”میں نے کہا تھا؟“

”ہاں تم نے ہی تو عہد لیا تھا۔“ وہ کلمہ بکھشتو۔

باراموش پر آتا ابوالاچ اور دہائی کی دھند اس عہد کی گواہ تھی۔ تمہیں یاد نہیں؟“

”میں نے عہد لیا تھا؟ میں نے کہا تھا؟ میں نے تو اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ میں نے تو۔ میں نے تو ایثار پر تمہیں جوتے اتارنے کو بھی کہا تھا۔ تم نے اتارے تھے؟ میں نے تو کیپ ٹو سے واپس چلنے کو بھی کہا تھا۔ تم نے میری بات مانی تھی؟ صرف وہی بات کا کیوں یاد رہا تمہیں؟ تم کیوں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟ میں ہسپتال میں جاگتی تو میں اکیلی تھی۔ آج پھر میں اکیلی ہوں۔ تم۔ تم نہیں رکے میرے لیے تم نے میرے ہوش میں آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور چلے گئے؟“

کافی دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

”میں نے اپنی خوشی سے وہ وعدہ نہیں نبھایا تھا۔“

”خوشی نہیں تھی تو نہ نبھاتے۔ ایک دفعہ تو کہتے کہ میں تمہارے لیے لڑوں گا۔ ایک دفعہ تو احتجاج کرتے کہ تم میری بات نہ سناؤ گے۔ تمہیں یاد ہے؟ تم نے کہا تھا تم رہ لوگی۔“

”ہاں کہا تھا۔“

”پھر؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”پھر؟ پھر تمہیں یہ سکی۔“ آنسو اس کی گردن پر پھسل رہے تھے۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ دونوں کے بیچ طاری ہو گیا۔

”پری! چند لمحے سر کے توافقی نے اسے پکارا۔

وہ جواب میں لب سے اسی طرح روتی رہی۔

”پری! میں رکنا چاہتا تھا مگر تم نے مجھے جانے کے لیے صرف اور صرف اپنے پیار کی وجہ سے کہا تھا۔ میں تمہارے لیے اپنے پیار سے بڑھ کر مقدم نہیں ہوتا تھا۔ نہ مجھے ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے میں چلا گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہسپتال میں جب تم جاؤ اور مجھے وہ کھو تو تمہارے سمجھوتے کی ہانکی ڈور ٹوٹ جائے۔“

”ہاں۔ تم کیوں رکے؟ تم کیوں میرا انتظار کرتے؟ میں۔ میں تمہارے لیے ہالیوڈ کے طوفان سے لڑی کی مگر تم کیوں میرے لیے لڑتے؟ تم نے۔ تم نے اپنی اہمیت کی ہوتی تو تم رکے۔“ وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ پچھلے دو مہینوں کا کرب آج باہر کو برہنہ ہوا تھا۔

”ہاں۔“ وہ جیسے زخمی دل کے ساتھ مسکرایا۔

”کی کتنی ہو میں نے واقعی محبت نہیں کی تھی۔ میں بہت کمری نہیں سکا۔ حالانکہ کوشش بہت کی تھی کہ صرف محبت کروں مگر میں نے تم سے محبت نہیں کی کی پری! میں نے تو تم سے عشق کیا تھا۔ محبت کی ہوتی ہو شاید تمہیں اسے بالکل سے بغاوت کرنے پر مجبور کر دے۔ محبت کی ہوتی تو شاید وہ لیتا۔ محبت کی ہوتی تو شاید اب واپس نہ آتا مگر میں نے محبت ہی تو نہیں کی تھی۔“

اس کے آنسو بہنا رک گئے تھے، فضا بالکل خاموش تھی۔ ساری کائنات ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کمرے کی چرے رک کر پھر کمرہ بہت دھواں سے سے سن رہی تھی جو کہ رہا تھا کہ اس نے محبت نہیں کی تھی اس نے عشق کیا تھا۔

”افق۔“ وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ آنسو پھر سے ابل پڑے۔

”پری۔ تمہارے پیار۔“

”وہ۔ وہ نہیں رہے۔ وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”وہ چوکی۔“ تم کیسے جانتے ہو؟“

”وہ بہت مشہور آدمی تھے۔ تم نے ایک دفعہ ان کا پرانا نام بتایا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑی تھی۔ ان دو ماہ میں نے کمرے میں بند رہ کر کسی اخبار پڑھنے والا کام ہی تو کیا ہے۔“ پھر وہ رادیر کو پھر کر بولا۔ ”میں تم سے ان کا افسوس بھی نہیں کر سکا۔ میرے پاس سارا کوئی نمبر نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی تعلق رہا تھا۔“

”تعلق؟ تعلق تو تھا افق!“

اس نے کمری سانس اندر کو کھینچی۔ ”ہاں وہ تعلق تو دنیا کے تخلیق ہونے سے بھی قبل بنا تھا۔ اب تو اس کے مٹنے کے بعد ہی ختم ہو گا۔“

وہ جب چاپ آنسو صاف کرنے لگی۔ اس کے دل کا بوجھ پتلے سے بہت ہلکا ہو گیا تھا۔

”پری!“ کچھ دیر بعد افق نے اسے پکارا۔ ”میں آ جاؤں؟“

”کیا تمہیں اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟“

”نہیگ ہے۔“ وہ اب کھل کر مسکرایا تھا۔ ”پھر میں کل آ رہا ہوں۔ مجھو ایسے بھی تمہارا پتھر بنا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ بھر نعمان نے بتایا تھا کہ وہ پتھر بلکہ جیم اسٹون تمہارے پاس ہے۔“ وہ اب خود کو سنبھال چکی تھی۔ میز کا کونا اس نے چھوڑ دیا تھا۔

”جیم اسٹون؟“ وہ دیر سے سے ہنسنا۔ ”اچھے اچھے فوٹی اگر دھوکہ کھاتی گئے ہیں تو تم انہیں یہ مت بتانا کہ یہ پتھر ایک دھاتی سورہ پے کے کچھو پر لگا تھا اور جیتی نہیں تھا۔“

”نہیں میں کیوں بتاؤں گی؟ میرے لیے تو وہ ویسا ہی قیمتی ہے جیسے وہ تصویر تھی۔“

”یہ بھر عاصم نے دے دی تھی وہ؟“

”ہاں مجھے مل گئی تھی۔ مجھے وہ گیت بہت اچھا لگتا تھا جو تم نے تین ماہ پہلے مجھے وائٹ بیلس کی بالکونی میں کھڑے ہو کر سنایا تھا۔“ وہ سر جھکائے میز کا کونا کھینچ رہی تھی۔

”پھر میں کل آ رہا ہوں اور اب رونا نہیں ہے۔“

”ہاں نہیگ ہے۔“ اس نے پھر سے آنکھیں رگڑیں۔ ”نہیں روؤں گی۔“ میز کی چمکتی سطح پر اسے اپنا رویا رویا مشورہ چھوڑ کھالی دے رہا تھا۔

”افق۔“ تم نے آخری دفعہ ہسپتال میں میرے کان میں کیا کہا تھا؟“ اچانک یاد آنے پر اس نے پوچھا۔ ”تو ہی جو اس تصویر پر لکھا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ دیر سے سے ہنس دی۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی ”سنو؟“

”تم کل کدھڑاؤ گے؟“

”ہیو! اسلام آباد۔“

”نہیں وہاں مست آنا۔“ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

”وہ کیوں؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”افق! تمہیں یاد ہے وہ وقت؟“ سن سے تین ماہ اور تین دن پہلے، جب مارگلہ کی پہاڑیوں پر فوج سڑک پہ مجھے ایک شہزادہ ملا تھا۔“

”اور جب فوج سڑک پر شہزادے کو ایک پری ملی تھی؟“ وہ مسکرایا۔

”ہاں! تمہیں یاد ہے اس روز مارگلہ کی پہاڑیوں پر بادل اترے تھے اور میں سڑک کے کنارے اس سفید پتھر پر بیٹھی تھی جب تم کھڑا دوڑاتے ہوئے سڑک کی اونچائی سے نیچے آئے تھے۔ تمہیں وہ بادل سڑک کی وہ اونچائی اور وہ سفید پتھر یاد ہے؟“

”میں کچھ بھولا ہوا ہوں؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم کل اسی وقت مسجد پر کے تین بجے مجھے وہیں ملو۔ میں اسی پتھر پر بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تم اسی طرح کھڑا دوڑاتے ہوئے میرے قریب آکر مجھے پکار کر کہنا کہ ”کیا تم میری تصویر اتار سکتی ہو؟“ پھر میں تمہارے کمرے سے تمہاری تصویر لوں گی۔ تب تم کہنا کہ تم میں سال بعد ایک سفر لکھو گے اور اس کے فریٹ بیج بریکی تھوہر لگاؤ گے اور اس کا کپشن ہو گا ”اس کو بیج کی تصویر“ پھر کبھی پہاڑوں میں نہیں جائے گا۔“ ”اچھا۔ پھر افق۔“ پھر ہم تصور کریں گے کہ ہم کائنات بننے کے بعد پہلی دفعہ ان پہاڑیوں پر مل رہے ہیں ہم تصور کریں گے کہ آج کے یہ تین ماہ ہماری زندگیوں میں جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔“

”تم کبھی نہیں بد لوگی پریشے جہاز سے، اتم ہیڈ نام چیزوں میں بھی خوب صورت کی تلاش نہ ہوگی۔“ وہ اس کے خوب صورت خیال پر ہنس دیا۔

”تم بھی تو یہی کہتے ہو ”شیر“ میں دعا کروں گی کہ کل بھی مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایسے ہی بادل اتریں جیسے تین

ماہ اور تین دن قبل اترے تھے۔“

”اور میں دعا کروں گا کہ مجھے میری پری اسی طرح سفید اور گلابی رنگوں میں ملے۔ تم کل وہی جو گزرا اور وہی گہڑے پہننا جو اس روز پہنے تھے۔“

پریشے نے سر جھکا کر اپنے جو گزرا کو دیکھا جو اب بد رنگے ہو چکے تھے۔ کیا وہ یہی بہن کرافٹ سے ملے جائے گی؟ نہیں وہ نئے خریدے گے کی افق کو کون سا ان کا ڈیزائن یاد رہتا ہے۔ مردوں کو ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں بھلا؟

”ٹھیک ہے، اور تم بھی وہی جیکٹ پہنتا۔“ پھر دونوں ایک لمحے کو خاموش ہوئے دونوں نے کچھ سوچا اور پھر اکٹھے ہی بولے۔

”اور تم وہی واللہ۔“ ”مگر کچھ یاد آنے پر دونوں دوبارہ سے خاموش ہو گئے۔ چونکہ اکٹھے بولے تھے وہ سہارے کی بات نہیں سن سکے تھے۔“

”خیر اب تمہارے ہاتھوں تمہارے گارڈین ہیں۔“

پھر کل ان کے پاس چلیں گے ٹھیک؟“

”وہ کبھی بات میں گم نہیں ہونے دیتی۔“

”تمہیں یاسم کروٹنے پر پورا کیا تھا نا سو اس کا

پروڈل پہنچانے آؤں گا میں۔“

وہ ہنس دی۔ ”ہاں! اچھا آدمی ہے۔ میں کراؤں گی

اس سے شادی۔“

”ہاں مگر مجھے قتل کرنے کے ہی اس سے ہی شادی کرنا

وہ جل کر لولا اور پھر خود بھی ہنس دیا۔

”اچھا اب میں فوج کا مزید خرچہ کرانے کے بجائے

فون بند کر رہی ہوں۔ کل مسجد پر تین بجے یاد رکھا

”مجھے یاد ہے۔ میں ارٹھ کو بیک ریلیف ایکشن

کے لیے آیا تھا مگر کل کے لیے وقت نکال لوں گا۔

میرے لیے سب سے اہم کام تم ہو۔ مجھے یاد ہے۔

ڈاکا بوشی کی برف میں تمہارے آئینہ گرے تھے۔“

”آؤ تمہیں لوٹانے ہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔“

اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

آج کتنے دنوں بعد وہ ر سکون تھی۔

اس نے آنکھیں میچ کر ایک طمانیت بھری سانس لیا اور پھر آنکھیں کھول دیں۔

وہ کمرہ کتنی خوب صورتی سے آراستہ تھا، کھڑکی سے باہر نظر آتا پورا کتنا سرسبز تھا، اور فضا کتنی

آشیودار تھی۔

وہ باہر نکل آئی۔

میں جعفر نعمان اسے تھوڑی دیر بعد مل گیا تھا۔

”ہوئی بات؟ اب خوش ہیں؟“

پریشے نے بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلادیا۔

”چیکس! یہ تو کبھی بھی بات ہے۔“ وہ کچھ چکا تھا

کہ معاملہ محض پتھر کا نہیں تھا۔

وہ اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلی آئی۔

آج اسے بہت سارے کام کرنے تھے۔



وہ پورا گھنٹہ منظر آباد کی سڑکوں کے قریب

ملاشی نگاہوں سے کچھ دیکھ رہا تھا، مگر اس کی مطلوبہ

لے اسے مل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔

جائے کب وہ مایوس سا چلتا چلتا ہائی کورٹ لائنز تک

آیاد۔

ہائی کورٹ لائنز میں بھی خیمہ بہتی نصب تھی۔ وہاں

ایک جگہ گھاس پر بے تحاشا گول پتھروں ”سویٹروں“

لوہوں اور موڑوں وغیرہ کا ڈھیر لگا تھا۔ ارد گرد چند لوگ

گھوم رہے تھے مگر ارد گرد کے کپڑوں کے ڈھیر سے کوئی کچھ

میں اٹھا رہا تھا، پھر بھی اس نے ملاشی نگاہوں سے

اس ڈھیر کو دیکھا لیکن اس کی مطلوبہ چیز وہاں بھی نہیں

تھی۔

وہ مایوسی سے پلٹنے ہی لگا تھا جب اسے دور ایک

دھت کے تنے کے ساتھ ایک کم عمر لڑکی سر جھکائے

ہی دکھائی دی جس کے سر پر ہاتھ سے بنا ہیٹ تھا۔

اس کی سرادر آئی تھی۔

وہ اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، میز

ہوں۔“

قدیموں سے چلتے ہوئے اس تک آیا۔

”بات سنو۔“ اس کے بالکل سامنے جا کر افق نے اسے مخاطب کیا۔

لڑکی نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کے بال بھورے

اور رخسار سپیوں کی طرح سرخ تھے۔ اس کا رنگ سا

حلیہ دیکھ کر افق کو قدرے متغذیب ہوا۔

”تم انگریزی سمجھتی ہو؟“

”ہاں! میں یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہوں بلکہ تھی۔“

دھوپ سے سرخ ہوتے چہرے پر سولگواریت کھڑ

گئی۔ ”اب کہاں کی یونیورسٹی اور کہاں کی انگریزی۔“

سب کچھ تو راکھ ہو گیا۔ خیر تم بتاؤ، تمہیں کچھ چاہیے؟“

”ہاں! مجھے تمہارا ہیٹ چاہیے۔“ وہ اسی طرح

اس کے سامنے کھڑا گردن جھکائے اسے دیکھتے ہوئے

کہہ رہا تھا اور لڑکی ویسے ہی درخت سے ٹپک لگائے

سراٹھائے اسے تنگ رہی تھی۔

”میرا ہیٹ؟“ اس نے اپنی سبز آنکھیں حیرت

سے سکیڑیں۔ ”اس بد رنگ پرانے ہیٹ کا کیا کرو گے؟“

”مجھے کسی کو گفٹ کرنے کے لیے ہیٹ چاہیے“

مگر منظر آباد میں مجھے تمہارے ہیٹ کے سوا کوئی دوسرا

ہیٹ نہیں دکھائی دیا۔“

”یہ تو بہت پرانا ہیٹ ہے شاید تین سال قبل میں

نے بنایا تھا۔“ لڑکی ہیٹ سر سے اتار کر اسے غور سے

دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”وہ یعنی تم ہیٹ بنا سکتی ہو؟ بلاشبہ یہ ایک مشکل

کام ہے۔“

”جی تو مگر میری چھٹی نے مجھے یہ سکھایا تھا۔ خیر

تمہیں ہیٹ چاہیے؟ میرے گھر میں شاید کوئی رکھا ہو؟“

اس نے اسے دوبارہ سر پر پہن لیا۔

”ہاں! سادہ سا ہو، اور اوپر ایک اوبھ کھلا سرخ گلاب

ضرور لگانا جس کی پتیاں کنارے سے سیاہ ہو کر مر جھا گئی

ہوں۔“

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ”باسی گلاب کا کیا فائدہ؟“

”میں تمہیں یہ بات نہیں سمجھا سکتا مگر جسے دینا ہے اسے باسی گلاب اچھا لگے گا۔“

وہ فون پر اسے بھی بیٹھ پس کر آئے کو کتنا چاہتا تھا مگر تب اسے یاد آیا تھا کہ وہ بیٹھ تو ہوا وہ دھند کے پانی پر تیرتا بہت دن پہلے اشو میں گر چکا تھا۔ ان دونوں نے عشق میں بہت کچھ کھویا تھا اب اسے پریشے کے جسے کی چیز اسے لوٹانی تھی۔

”تو تم نے اسے وہ بیٹھ کب دینا ہے؟“ لڑکی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ جینز میٹھیٹھ سر پر کی کپ پٹے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اونچا لہا سا وجہ غیر ملکی اسے غاصد کچھپ لگا تھا۔

”کل سہ پہر۔“

”تو پھر میں صبح نان گلاب ہی لگا دوں گی اسے پھر تک تو وہ مر چکا جائے گا۔ میں صبح روشنی ہونے کے بعد گلاب توڑوں گی“ ایسے وہ جلدی مر جھاتے ہیں منہ اندھیرے توڑ تو دور تک فریٹس رہتے ہیں۔

”واہ! تم تو بہت عقل مند لڑکی ہو۔“ شمد رنگ آنکھوں میں ستائش اتر آئی۔ ”خیر مجھے کل صبح سویرے وہ بیٹھ ٹیلیفون اسٹینڈیم میں لا دینا وہاں جو آرمی کیمپ کا آخری کونے والا سبز خیمہ ہے نا وہ میرا ہے۔ وہاں آجانا دیکھتے کتنے پسے لوگ بیٹھ کے؟“

لڑکی بہت دکھ سے مسکرائی۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”ترکی سے۔“

”کیا ڈاکٹر ہو؟“

”نہیں! مجھ نے نہ ہوں۔“

”پھر تم صرف میرے پناہوں میں بسنے والے لوگوں کی مدد کرو؟ وہ بیٹھ میری طرف سے میرے پاکستان آنے والے ترک انجینئر کے لیے ایک تحفہ ہو گا۔ تمہیں شام میں ہی لا دوں گی۔“

”نہیں! ابھی تو ہم کچھ لوگ دور در دور بیٹھ کر سیریا زائد

لے کر جا رہے ہیں شام تک تو شاید واپس آئیں۔“

صبح آجانا اور تجھے کا شکر یہ۔“ وہ کہہ کر بیٹھنے لگا۔

”سنو“ تم نے وہ بیٹھ دینا کہ ہے؟“ لڑکی کی آواز میں تجسس تھا۔

الٹی نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا پھر مسکراتے ہوئے شانے بھٹکے۔ ”تمہیں کیوں پتاؤں؟“

کتنے مہینوں بعد آج وہ کھل کر مسکرایا تھا۔ پھر منہ کچھ کے بنا وہاں سے چلا آیا۔

اس کے دوست اس کا انتظار کر رہے ہوں گے ان سب نے ابھی آگے پھاڑوں میں جانا تھا۔

ہوئے اس نے اپنے قدم جیز کر دیے۔

”آپ کے پاس ابدر ہیں؟“ وہ سی ایم ایچ سے سیدھی ماموں کے آفس گئی تھی اور اب ان کے کمرے کے باہر ایک لمبے کورک کمر ان کی سیکرٹری نے انتظار کر رہی تھی۔

”جی ہاں! وہ آفس کے لیے نکلتی ہے۔“

”آپ کچھ دن۔“

وہ ان سے کہتی ہوئی دروازہ کھیل کر اندر داخل ہو گئی۔

دروازے کی سیدھ میں کافی دور آنوسی میز کے چھ ماموں انہی بائیں کینو جیسے بیٹھے ٹیبل ٹاپ پر رکھی فائل پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے، آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا پھر شفقت انداز میں مسکراتے تھے۔

”او بیٹا! انہوں نے فائل ایک طرف ڈال دی۔“

”آج آفس میں؟ خیریت؟“

”جی ہاں! ایک بات کرنی تھی۔“ وہ طویل کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں کوئی ایسے اچھے ٹائمپ آئی ہو میں ابھی فلائٹ کے لیے نکل رہا تھا خیر کیا ہوئی؟ چائے؟ کافی؟“

”نہیں رہتے دیں۔ مجھے بس بات کرنی تھی۔“

”چلو پتاؤ کون سی اتنی ضروری بات تھی۔“ وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر بہت وحیان سے اس کی طرف متوجہ

پریشے نے بمشکل تھوک لگایا۔ ہمت کر کے آؤ جی کی مگر اب بات کہے کرے؟ شاید اسے ماموں سے پہلے بات کرنی چاہیے تھی یوں براہ راست ماموں سے بات کرنا مناسب نہ تھا لیکن انہیں آج چلے جانا تھا اور پھر بیٹھ بعد ان کی واپسی تھی۔ وہ اب اور انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

”وہ۔۔۔ ماموں۔۔۔ میں دراصل۔۔۔“ وہ رکی قدرے ہلکی اور پھر انگلی سے انگوٹھی نکال کر سامنے بیز کی

”آپ یہ پچھو کو وہ لپس کر دیں۔“

نظر میں گور میں دھیرے ہاتھوں پر جمائے وہ آہستہ سے بولی۔ اس میں اس وقت نگاہ اٹھانے کی بہت نہیں تھی۔ وہ اور الٹی بعض معاملات میں بہت بہادر اور بعض میں بہت بزدل تھے۔

کچھ دن تک ماموں کچھ نہ بولے تو اس نے ڈرتے ڈرتے پھر آگیا۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو مجھ پر غصہ نہیں آیا کہ میں نے پیپا کی خواہش کیوں پوری نہیں کی؟“

”خواہشات زندگی تک ہوتی ہیں۔ جو چلے جاتے ہیں ان کو خواہشات کے پورا ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ عموماً ہم لوگ دوسروں کی زندگیوں میں مل کودھ دیتے ہیں اور ان کی موت کے بعد ان کے لیے کسبیاات بڑھتے ہیں۔ تم نے پری! اپنے پیپا کی زندگی میں کبھی ان کی باغیالی نہیں کی۔ ان کی ہریات پر سر جھکایا ہر صدم کی تعمیل کی۔ تمہارے پیپا تم سے لائسنسی اس دنیا سے گئے ہیں۔ تمہاری شادی جس سے بھی ہو اب ان کو فرق نہیں پڑے گا۔ انہیں صرف اس بات سے فرق پڑے گا کہ تم خوش ہو یا نہیں؟“

”آپ لوگ بھی اس رشتے سے ناخوش تھے نا؟“

ماموں کی باتوں سے اس کا ذہن اعتماد کوٹنے لگا۔

”ہم قطعاً خوش نہیں تھے مگر اس میں جہانزیب کا

تصور نہیں تھا۔ بھانجے بھتیجے سب ہی کو پیارے ہوتے ہیں۔ نشاء کی منگنی بھی تو میں نے تمہارے مامی کے بھتیجے کی ہوتی ہے۔ اپنے خون کے باعث انسان جانے بوجھے ہوئے بہت کچھ نظر انداز کر دیتا ہے۔“

”پھر بھی آپ نے پیپا کی ڈنٹہ کے بعد یہ رشتہ ختم کرنے کا نہیں سوچا؟“

”میں کئی دنوں سے تمہارے منہ سے یہ سب سننے کا خطر تھا۔ آج میرا انتظار ختم ہو گیا ہے۔“ وہ بزرگانہ شفقت سے مسکراتے۔

”آپ یہ پچھو کچھ۔ میرا مطلب ہے کس بنیاد پر۔“ اس نے فقرہ اور حورا پھوڑ دیا۔

”وہ میرا مسئلہ ہے۔“

”لیکن پھر بھی وہ بہت شور مچائیں گی۔“ وہ واقفانہ پریشان تھی۔

”بیٹا! میری بھی تو کوئی بات ہوتی ہے نا؟ اگر اتنا حوصلہ کر کے مجھ پر اعتماد کر کے یہ سب کہا ہے تو جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں سنبھال لوں گا تو تمہیں اس بارے میں سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے شکر سے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہو ماموں! میں چلتی ہوں۔“ پھر وہ کھڑی دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے پلٹی۔ ”آپ پچھو سے کب بات کریں گے؟“

”دعویٰ سے واپسی پر۔“

”اچھا۔“ وہ جانے کے لیے مڑی۔

”پری بیٹا!“

وہ دروازے کے قریب تھی جب انہوں نے اسے پکارا وہ دروازے کی تاب پر ہاتھ دھرے واپس مڑی۔

”جی ماموں؟“

”بیٹا! اپنے پیپا کے بارے میں کبھی بدگمان نہ ہونا۔ اپنے بھانجوں سے ہر نبی کے باپ کو بہت امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ راکا بوجھی جانے کی اجازت نہ ملے پر تمہاری ناخوشی محسوس کر

”اس ممبر پر فون کر کے۔“ وہ نرس کو سمجھانے لگی، پھر تمام ہدایات مکمل کر کے ’لو! نیوں والا لفافہ ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنے قدم وارڈ کی طرف بڑھا دیے جہاں ڈاکٹر کامران نے انجیکشن منگوائے تھے۔ دونوں نرسیں ڈیڈ باڈیز والے اسٹریچرز لے کر ابھی اسی طرف جا رہی تھیں۔

نرس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر مڑ جانے والے رہسک پر گر کر پڑا ہوا جس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھکا تھا اور اس کے سینے کے مقام پر چادر کے اندر کوئی ابھری ہوئی شے رکھی تھی۔

اسے بہت سے کام کرنے تھے مگر گدم جیسے اسے کوئی احساس ہوا تھا اس نے نرس کو روکا اور چادر مٹائی۔

مرنے والے کا چہرہ اور جسم خون میں لست پست تھا۔ اس کے سینے پر رکھی چیز اس کی پی کیپ تھی۔

پریش نے کیپ اٹھائی۔ نیلی پی کیپ خون سے سرخ ہو چکی تھی۔

”بے چارہ۔“ افسوس سے سر جھٹک کر وہ کیپ کو واپس رکھنے ہی والی تھی کہ ایک دم کسی چیز نے اسے ٹھٹھکنے پر مجبور کیا۔

اس نے کیپ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر سفید رنگ سے ’جو خون کے باعث گلابی ہو چکا تھا ہاتھ سے لکھا تھا۔

”Hail to tayyip Erdogan“ زمین اور آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

وہ بے اختیار لڑکھرائی۔ کیپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

”ہیل ٹو طیب اردگان؟“ اس نے بے یقینی سے دہرایا، پھر تیزی سے مرنے والے کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔

چوڑا جبر، گھٹکھریا لے سنہری بال۔ وہ افق نہیں تھا، مالا تکہ وہ کیپ افق پہناتا تھا، مگر وہ

کیپ افق کی نہیں تھی۔ وہ اس کے دوست جینک یقین کی تھی۔

”جینک افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔“ اجیت کا فقرہ اس کے دل میں گونجا۔

مرنے والا یقیناً ”جینک تھا“ اور جینک واقعی افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ اگر جینک ادھر تھا تو افق کہاں تھا؟ اس نے سر اٹھا کر سامنے دو سری نرس کو دیکھا جو دو سری ڈیڈ باڈی والا اسٹریچر دھکیل رہی تھی۔

وہ تیزی سے اس اسٹریچر کی جانب لپکی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر کا کونا پکڑا اس میں چادر پٹائی کی ہمت نہیں تھی۔ وہ افق کو خون میں لست پست لاش بنا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے چادر پٹائی چاہی مگر اس کی لرزائی انگلیوں نے حرکت نہیں کی۔ ان میں چادر پٹانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

نرس نے جیسے کچھ سمجھ کر سفید کپڑا مرنے والے کے چہرے سے اتار دیا۔

اس کا سانس رک گیا۔ وہ افق نہیں تھا۔ وہ اجیت دور ان تھا۔ محسوس کیوں نہ ہو اس وقت وہ ان جو بہت ہنساکرتا تھا۔

”اجیت۔ اوہ گاڈ!“ اس نے بے اختیار اس کا خون میں لست پست چہرہ تھپتھپایا۔ وہ بے جان تھا۔ اجیت مر چکا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کندھے پر ڈھلک گئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ اجیت نہیں۔“ وہ چیخ رو کتنے کو منہ پر ہاتھ رکھے دو قدم پیچھے ہٹی۔

دور کارڈور کے دوسرے کنارے پر وہ فوجی اور وارڈ بوائے تیسرا اسٹریچر دھکیل کر لے جا رہے تھے۔ اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ تیسرا کون تھا۔

وہ بے اختیار ان کی جانب بھاگی۔ دوائی کے لفافے کا ایک سرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لفافہ ترچھا ہوا، چھوٹی چھوٹی شیشیاں ایک ایک کر کے اس

پر تے بدحواس قدموں کے ساتھ چمکتی ٹانگوں پر لگیں۔ شیشیاں لوٹنے کی چھانکے دار آواز پر تے ہی لوگوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا جو اب اس کے کارڈور کے دوسرے سرے تک آئی۔

”لو۔۔۔ رکو۔۔۔“ اس کی ہر اسباب آواز پر جوان ایک کر اسٹریچر تک آئی اور زخمی انجینئر کا چہرہ دیکھ گیا۔

”آٹھوں سے رک رک کر سانس لیتا افق ہی تھا۔“

”میرے اللہ! یہ تو بہت زخمی ہے۔ اسے مہر لاؤ۔“ وہ بدحواسی کے عالم میں ان کے ساتھ ہاتھوں سے اسٹریچر کھینچی دھکیل کر ایمر جنسی

الٹرو اسٹری! ممبر پلیر اسے دیکھیں، جلدی کریں، مرجائے گا۔“ کسی اور طرف متوجہ ڈاکٹر اسٹریچر

مچ گیا۔ انہیں اس تک لائی تھی۔ سر پلیر جلدی کریں، اس کا خون بے جا رہا ہے۔

ان کا پورا وجود کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ اسے ابتدائی طبی امداد دینے کے تھوڑی دیر بعد اسٹریچر کے کھڑی نرس سے کہنے لگے ”اس کا بلڈ سہ گیا ہے“ اس کا گروپ چیک کریں اور بلڈ کا

ت کریں۔“ اس کا گروپ ”ایمریشے“ نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ہے۔ اس کا گروپ اونگیٹو ہے۔“ کہہ کر وہ پس بکھ بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ تب اسے یاد آیا کہ اس میں اونگیٹو تو ختم ہو چکا تھا۔ اوہ خدا یا! اب وہ اس سے لائے؟ افق کو خون کی شدید ضرورت تھی کہیں سے لائے؟

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کے کس کسے دار کا گروپ اونگیٹو ہے اور تب ایک خیال اس کے ذہن میں گوندا۔

”یہاں سیف کا گروپ اونگیٹو ہے۔“

وہ دوڑتے ہوئے رہسپین تک آئی۔ نرس کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے تیزی سے ریسیور چھینا، کال ڈسکنکٹ کی اور لرزائی انگلیوں سے سیف کا نمبر ملا لے لگی۔ وہ اس بری طرح ہراساں اور پریشان تھی کہ اسے بھول گیا کہ اس کے اوپر آل کی پانکٹ میں موبائل بھی رکھا ہے۔ اس سے تو سیف کا نمبر بھی نہیں ڈائل ہو رہا تھا۔

دلچسپی طرح ہائون تھا۔ ہمشکل نمبر ڈائل کیا۔ تیسری کھنٹی پر سیف نے ”پیلو“ کہا۔

”سیف۔ سیف تم پلیر اوہر ہیز آجاؤ۔ ایمر جنسی ہے۔ بلڈ چاہیے۔“

”کون پری؟ کیا ہوا؟ ای تو ٹھیک ہیں؟“ سیف کا ذہن فوراً ”ماں کی جانب گیا تھا جو ہائی پی پی کی مریض تھیں۔“

”ہاں وہ ٹھیک ہیں، مگر ایک ہوشیار زخمی ہے۔ اس کا گروپ اونگیٹو ہے۔“

”اوہ تو ہوشیار ہے۔“ وہ ریلیکس ہو گیا۔ ”ہاں اور اس کو فوری بلڈ چاہیے۔“

”تو ہسپتال کے بلڈ بینک سے لے لو۔ زلزلے پر اسنے تو لوگوں نے خون دیا ہو گا۔“

”جو تھا وہ لگا دیا گیا ہے۔ اگر ہوتا تو میں تم سے مانگتی؟“ وہ جھنجھلا گئی تھی۔ ”تم۔۔۔ تم بس فوراً اوہر آجاؤ۔“

”پریش! میں بڑی ہوں۔ ہم میڈر لینے کے لیے نگر زدے رہے ہیں۔ میں نہیں آسکتا۔“

”سیف! خدا کے لیے وہ مرجائے گا۔ اس کو فوری بلڈ چاہیے۔ تم پلیر آجاؤ۔ پلیر تمہارے آٹم کے قریب ہی تو ہے۔“ صرف افق کی زندگی کے لیے اس نے ایک دفعہ پھر اس کی منت کی۔

”میں نے کہا نا، نہیں آسکتا۔ سارے شہر میں خون ختم تو نہیں ہو گیا ہو گا۔ کسی دوسرے ہسپتال سے پتہ کرو۔“ وہ بے زار سا بولا۔

”اس ممبر پر فون کر کے۔“ وہ نرس کو سمجھانے لگی، پھر تمام ہدایات مکمل کر کے ’لو! نیوں والا لفافہ ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنے قدم وارڈ کی طرف بڑھا دیے جہاں ڈاکٹر کامران نے انجیکشن منگوائے تھے۔ دونوں نرسیں ڈیڈ باؤنڈ والے اسٹریچرز لے کر ابھی اسی طرف جا رہی تھیں۔

نرس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر مڑ جانے والے رہسک پر گر کر پڑا ہوا جس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھکا تھا اور اس کے سینے کے مقام پر چادر کے اندر کوئی ابھری ہوئی شے رکھی تھی۔

اسے بہت سے کام کرنے تھے مگر گدم جیسے اسے کوئی احساس ہوا تھا اس نے نرس کو روکا اور چادر ہٹائی۔

مرنے والے کا چہرہ اور جسم خون میں لست پست تھا۔ اس کے سینے پر رکھی چیز اس کی پی کیپ تھی۔

پریش نے کیپ اٹھائی۔ نیلی پی کیپ خون سے سرخ ہو چکی تھی۔

”بے چارہ۔“ افسوس سے سر جھٹک کر وہ کیپ کو واپس رکھنے ہی والی تھی کہ ایک دم کسی چیز نے اسے ٹھٹھکنے پر مجبور کیا۔

اس نے کیپ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر سفید رنگ سے ’جو خون کے باعث گلابی ہو چکا تھا ہاتھ سے لکھا تھا۔

”Hail to tayyip Erdogan“
زمین اور آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

وہ بے اختیار لڑکھرائی۔ کیپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

”ہیل ٹو طیب اردوگان؟“ اس نے بے یقینی سے دہرایا، پھر تیزی سے مرنے والے کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔

چوڑا جبر، گھٹکھریا لے سنہری بال۔
وہ افق نہیں تھا، مالا تک وہ کیپ افق پہناتا تھا، مگر وہ

کیپ افق کی نہیں تھی۔ وہ اس کے دوست جینک یقین کی تھی۔

”جینک افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔“ اجیت کا فقرہ اس کے دل غ میں گونجا۔

مرنے والا یقیناً ”جینک تھا“ اور جینک واقعی افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ اگر جینک ادھر تھا تو افق کہاں تھا؟ اس نے سر اٹھا کر سامنے دو سری نرس کو دیکھا جو دو سری ڈیڈ باؤنڈ والا اسٹریچر دھکیل رہی تھی۔

وہ تیزی سے اس اسٹریچر کی جانب لپکی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر کا کونا پکڑا اس میں چادر ہٹانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ وہ افق کو خون میں لست پست لاش بنا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے چادر ہٹائی چاہی مگر اس کی لرزائی انگلیوں نے حرکت نہیں کی۔ ان میں چادر ہٹانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

نرس نے جیسے کچھ سمجھ کر سفید کپڑا مرنے والے کے چہرے سے اتار دیا۔

اس کا سانس رک گیا۔ وہ افق نہیں تھا۔ وہ اجیت دور ان تھا۔ محسوس کیوں نہ ہو اجیت وہاں جو بہت ہنساکرتا تھا۔

”اجیت۔ اوہ گاڈ!“
اس نے بے اختیار اس کا خون میں لست پست چہرہ تھپتھپایا۔ وہ بے جان تھا۔ اجیت مر چکا تھا۔
اس کی گردن ایک طرف کندھے پر ڈھلک گئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ اجیت نہیں۔“ وہ چیخ رو کتنے کو منہ پر ہاتھ رکھے دو قدم پیچھے ہٹی۔

دور کارڈور کے دوسرے کنارے پر وہ فوجی اور وارڈ بوائے تیسرا اسٹریچر دھکیل کر لے جا رہے تھے۔ اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ تیسرا کون تھا۔

وہ بے اختیار ان کی جانب بھاگی۔ دوائی کے لفافے کا ایک سرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لفافہ ترچھا ہوا، چھوٹی چھوٹی شیشیاں ایک ایک کر کے اس

پر تے بدحواس قدموں کے ساتھ چمکتی ٹانگہ پر لگیں۔ شیشیاں لوٹنے کی چھانکے دار آواز پر تے ہی لوگوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا جو ابوئے کارڈور کے دوسرے سرے تک آئی۔

”لو۔۔۔ رکو۔۔۔“ اس کی ہر اسباب آواز پر جوان ایک کر اسٹریچر تک آئی اور زخمی انجینئر کا چہرہ دیکھ گیا۔

”آٹھوں سے رک رک کر سانس لیتا افق ہی تھا۔“

”میرے اللہ! یہ تو بہت زخمی ہے۔ اسے مہر لاؤ۔“ وہ بدحواسی کے عالم میں ان کے ساتھ ہاتھوں سے اسٹریچر کھینچی دھکیل کر ایمر جنسی

الٹرو اسٹری! ممبر پلیر اسے دیکھیں، جلدی کریں۔
مر جائے گا۔“ کسی اور طرف متوجہ ڈاکٹر اسٹرو اسٹری

”مجھ کو! انہیں اس تک لائی تھی۔“
”ممبر پلیر جلدی کریں! اس کا خون بے جا رہا ہے۔“
”کا پورا وجود کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔“
”ابتدائی طبی امداد دینے کے تھوڑی دیر بعد اسٹری ساتھ کھڑی نرس سے کہنے لگے ”اس کا بلڈ“
”سہ گیا ہے“ اس کا گروپ چیک کریں اور بلڈ کا

”ت کریں۔“
”گروپ“ ایمریش نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ہے۔ اس کا گروپ اونگٹیڈ ہے۔“ کہہ کر وہ پس بٹک بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ تب اسے یاد آیا کہ

”میں اونگٹیڈ تو ختم ہو چکا تھا۔ اوہ خدا یا! اب وہ لاش سے لائے؟ افق کو خون کی شدید ضرورت تھی کہیں سے لائے؟“
”یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کے کس کسے دار کا گروپ اونگٹیڈ ہے اور تب ایک خیال اس کے ذہن میں گوندا۔“
”یہاں سیف کا گروپ اونگٹیڈ ہے۔“

وہ دوڑتے ہوئے رہسپین تک آئی۔ نرس کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے تیزی سے ریسیور چھینا کال ڈسکنکٹ کی اور لرزائی انگلیوں سے سیف کا نمبر ملا لے لگی۔ وہ اس بری طرح ہراساں اور پریشان تھی کہ اسے بھول گیا کہ اس کے اوپر آل کی پاکٹ میں موبائل بھی رکھا ہے۔ اس سے تو سیف کا نمبر بھی نہیں ڈائل ہو رہا تھا۔
دل غ بری طرح ہاؤف تھا۔
پیشکل نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر سیف نے

”پیلو“ کہا۔

”سیف۔ سیف تم پلیر اوہر ہیز آجاؤ۔ ایمر جنسی ہے۔ بلڈ چاہیے۔“

”کون بری؟ کیا ہوا؟ ای تو ٹھیک ہیں؟“ سیف کا ذہن فوراً ”ماں کی جانب گیا تھا جو ہائی پی پی کی مریض تھیں۔“

”ہاں وہ ٹھیک ہیں، مگر ایک ہوشیار زخمی ہے۔ اس کا گروپ اونگٹیڈ ہے۔“

”اوہ تو ہوشیار ہے۔“ وہ ریلیکس ہو گیا۔
”ہاں اور اس کو فوری بلڈ چاہیے۔“

”تو ہسپتال کے بلڈ بینک سے لے لو۔ زلزلے پر اسنے تو لوگوں نے خون دیا ہو گا۔“

”جو تھا وہ لگا دیا گیا ہے۔ اگر ہوتا تو میں تم سے مانگتی؟“ وہ جھنجھلا گئی تھی۔ ”تم۔۔۔ تم بس فوراً اوہر آجاؤ۔“

”پریش! میں بڑی ہوں۔ ہم میڈر لینے کے لیے نگر زدے رہے ہیں۔ میں نہیں آسکتا۔“

”سیف! خدا کے لیے وہ مرجائے گا۔ اس کو فوری بلڈ چاہیے۔ تم پلیر آجاؤ۔ پلیر تمہارے آٹم کے قریب ہی تو ہے۔“ صرف افق کی زندگی کے لیے اس نے ایک دفعہ پھر اس کی منت کی۔

”میں نے کہا نا، نہیں آسکتا۔ سارے شہر میں خون ختم تو نہیں ہو گیا ہو گا۔ کسی دوسرے ہسپتال سے پتہ کرو۔“ وہ بے زار سا بولا۔

سونا نہیں ہے۔ سو گئے تو پھر نہیں جاگو گے۔ میں نے

14 اپریل 2009ء

59

لوگ انہی پر ہلکے ہوئے تھے۔ لیکن اسے مہرے سے

”دو مہینے مت وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کے قریب آ کر بہت آہستگی سے اس نے کہا۔ پری نے چونک کر بیگناہ چہرہ صاف کیا۔

”اتنے عرصے بعد وہ آپ کو کھوجانے کے لیے نہیں ملا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ افق ارسلان ہے۔“ وہ اتنی مدہم سرگوشی میں کہہ رہا تھا کہ پریٹے کے علاوہ کوئی دوسرا اس کمرے میں اس کی بات نہیں سن سکتا تھا۔

”کیا واقعی وہ ٹھیک ہو جائے گا؟“

”جی اور اب میں آپ کو آپنی بول سکتا ہوں؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

وہ نم آنکھوں سے ایک ہل کو مسکراتی۔ اس کا سر خود بخود انبات میں ہل گیا۔ بعض دفعہ بعض لوگوں کو ہم کتنا غلط سمجھتے ہیں۔

وہ اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ پریٹے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ”سنو۔“

”وہ جاتے جاتے مڑا؟“ جی؟“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ وہ پھر بھول گئی تھی۔

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ”محبوب۔ محبوب عمر۔“ کہہ کر وہ رکا نہیں۔

وہ افق کے قریب چلی آئی۔ اس پاس کتنے لوگ موجود تھے وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں افق کے چہرے اور سدا آنکھوں پر جمی تھیں۔

وہ اس کے سر ہاتھ گھڑی ہو گئی اور اس کا بایاں ہاتھ مجوز خموں سے کسی حد تک محفوظ رہا تھا اپنے ہاتھ میں تھام لیا اس کی کلائی میں وہی گھڑی تھی۔ چوہو کور سیاہ ڈاکل کے درمیان چمکتا ایسروں کا اہرام۔ ڈاکل کا شیٹ البتہ چمکتا چور ہو چکا تھا۔

اس نے بھکی آنکھوں سے افق کا چہرہ دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا تھا۔ وہ آنکھیں کھولتا کیوں نہیں تھا؟ وہ کچھ کہتا کیوں نہیں تھا؟

”افق!“ وہ دھیرے سے پوچھتی۔ ”افق! اٹھو۔“

سونا نہیں ہے۔ سو گئے تو پھر نہیں جاوے گے۔ میں نے

منع کیا تھا تاکہ سونا نہیں ہے پھر کیوں سونا جاؤ افق۔ صرف ایک دفعہ اپنی پری کے قریب پری تمہارے قریب ہے۔ وہ نہیں پکار رہی پری کا نجات دہندہ کہاں ہے؟ وہ سو کیوں رہا افق۔ اپلیز آنکھیں کھولو۔

اور تمہیں وائٹ پلس کی وہ اونچی سیڑھیاں اور وہ موروں کا چھو جس میں مورنا جا کر اٹھا کوئے میں مورنی دبی بیٹھی ہوئی تھی اور پھر وہ اداس گیت گاتی چڑیا، جھرنے کی پانی اور پتھروں کے ہمارے قدموں کے نشان وہ سب تمہیں پکار رہی ہیں۔

تم نے کہا تھا، ہم پھر بھی وائٹ پلس کے ڈاکوں وار لیے اس قوارے کے پیچھے چھپا یا کریں گے۔ افق اس سب کو اوتوں اور پرندوں نے نہیں کھایا۔ وہ سب دوبارہ آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اٹھو افق! لیجئے باہر ڈھنڈ کے نیلے بانوں اور چھو موٹے کھال پر سہری رات کے تری سورج کی پریوں کے۔

شاید تمہیں وہ سب بھول گیا ہو مگر وہ پریاں بھولیں۔ وہ آج بھی تمہیں یاد کرتی ہیں۔ تمہیں ایک دفعہ پھر ان کے پاس جانا ہے۔ ہمیں ایک دفعہ پریوں کا وہ نہیں دیکھنا ہے۔ مجھے ایک دفعہ پھر پلس کی تیسری آہلی کی بالکونی میں کھڑے ہو کر

ارسلان کا گیت سننا ہے وہ گیت جس میں ہاتھوں پر جمی برف اور اناٹولید کی گھوٹ کا ڈھنگ گیت جس میں پتھرنے اور وعدہ بھانے کا ڈھنگ مجھے وہ گیت پھر سناؤ نا افق۔ اپلیز اٹھو۔

سے کوئی وعدہ کوئی عہد نہیں لوں گی۔ اب تمہیں یہاں سے نہیں جانے ہوں گی۔ تمہیں اس عشق کا واسطہ جس کا اظہار تم نے بھی نہیں اٹھ جاؤ۔“

اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر پھسلنے لگے تھے۔ وہ آکھڑ ہانک سے سانس

کے تنفس کی آواز تک سنا کی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھیں پھول رہی تھیں۔ سامنے رکھی ای سی جی کی گیس اسٹرو کے پانی کی طرح پچلتی پچلتی ڈوبتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ ان لکیروں کو دیکھتی رہی۔ وہ اب اسے پھاٹوں کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ ان ظالم پھاٹوں کی طرح جو افق کے بیٹے والپس نہیں لوثاتے تھے۔ قراقرم اور کے پھاٹ۔ کوئی چھوٹے تھے اور کوئی بڑے تھے۔ ان کی وحشی اور کوئی قابل کوئی خونی اور کوئی ملکہ۔ وہ ایک جیسے تھے۔ ظالم اور خوب صورت۔ بہت ظالم۔

”کیا بکا ڈا تھا اس نے تمہارا لہتم بہت ظالم ہو۔ تم بہت ظالم ہو انسانی خون کا خراج لیتے ہو۔ برادر کا خراج۔“

اس کے ارد گرد برف گر رہی تھی اور وہ دور تک برف براڈی سلے پر نظرس جمائے بیٹھی تھی۔ افق اس کے سامنے لیٹا اور وہ اسے کہہ رہی تھی۔ ”افق! اٹھو۔“

خدا کے لیے سونا نہیں ہے۔ کبھی نہیں کہے اٹھو نہیں ایک دفعہ اپنی پری کو دیکھ لو۔ وہ اتنے ہیں گے۔ بس وہ ابھی آجائیں گے۔ ہمیں ایک دفعہ رات نہیں گزارنی پڑے گی۔“

ماہی خال سب آپس میں گھٹھ رہا تھا۔ قراقرم کے ہاٹھ ”لو“ کے نیچے سفید لکیروں کے ہاٹھ اس پر نہیں تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے ہرگز رتے پل وہ

گھٹے ہوئے جا رہے تھے۔ زمین میں دفن ہو رہے تھے اور آخر میں وہ یوں ہو گئے جیسے شاہراہ قراقرم برابر سب برابر تھا۔

”افق! اٹھو۔ خدا کے لیے اٹھو۔ یہ اٹھتا کیوں نہیں ہے؟ یہ بولتا کیوں نہیں ہے؟ اسے اٹھاؤ۔ خدا را! اسے اٹھاؤ۔ میں نے راتوں کو جاگ کر خدا سے کی خیریت مانگی ہے۔ اور یہ بولتا نہیں ہے؟ آنکھیں نہیں کھولتا۔ کیوں نہیں کھولتا؟ وہ اس کو اس سے پکڑ کر بچھوڑنے لگی اسے اٹھانے

جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ کسی نے پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر روکنا چاہا۔

”ایسے مت کرو پریٹے!“

”اسے اٹھائیں ڈاکٹر واسطی! یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟ اسے کہیں سونا نہیں ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ میں نے پہلی کاپیٹو کھا ہے۔ مجھے آواز آرہی ہے۔ اسٹورم (طوفان) ختم ہو چکا ہے۔ آج آسمان صاف ہے۔ یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟ اسے اٹھائیں، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔“ وہ بولنے لگی تھی ساتھ ساتھ اسے جھنجھوڑ بھی رہی تھی۔

”مت کرو پریٹے! اسے مت ہلاؤ۔ وہ مرجائے گا۔“

لوئی اسے کہہ رہا تھا۔

”وہ نہیں مرے گا۔ وہ نہیں مر سکتا۔ میں نے اسے جسے کا گرہ پائی اسے دیا تھا۔ میں نے اس کو دیکھنے کے لیے کئی دن برف میں پیدل سفر کیا تھا۔ سرد راتیں کٹی تھیں سحر اسے گرم میں سلایا تھا۔ بارہ گھنٹے برفانی طوفان میں اس مرے ہوئے آدمی کو اپنی کمر بٹھا کر پیچھے لائی تھی پھر بھی آپ کہتے ہیں وہ مرجائے گا؟ اللہ ان ظالم نہیں ہے۔ وہ اسے کیوں مارے گا؟ اس نے کیا بکا ڈا تھا کسی کا؟ وہ نہیں مر سکتا۔ افق نہیں مر سکتا اسے اٹھاؤ، خدا را! کوئی اسے اٹھائے اور کہے کہ میری بات کا جواب دے۔ وہ نہیں مر سکتا۔ میں نے خون لا کر دے دیا تھا اسے۔ پھر پھر کیوں مرے گا؟“

وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

وہ ایک دفعہ پہلے ہسپتال کے کمرے میں جا گئی تھی تو اکیلی تھی۔

اب پھر زندگی اسی موڑ پر آگئی تھی۔ وہ پھر سے ہسپتال کے کمرے میں تھی وہ پھر سے اکیلی ہونے جا رہی تھی۔ وہ اس کو چھوڑ کر جا رہا تھا بستر پر لیٹا شخص مر رہا تھا اور وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

روستے روتے اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ بہت سے لوگ افق پر جھکے ہوئے تھے۔ کوئی اسے کمرے سے

جانے کو کہہ رہا تھا مگر وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔

بٹانا چاہا۔

”وہ سو رہا ہے؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
”وہ بچ جانے لگا؟“

”ہاں وہ بچ جائے گا۔ تم باہر جا کر بیٹھو۔“

مگر وہ پھر بھی اس کے سرہانے کھڑی رہی۔ اس نے ابھی تک افق کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے چھوڑنا نہیں جاسکتی تھی۔ بس وہ خوف زدہ نگاہوں سے اسی کی مشین پر ابھرتے ڈوبتے پہاڑوں کو دیکھتی رہی۔ اب ٹھیک سے چل رہے تھے۔ اب انہیں سیدھی نہیں بٹانا تھا۔

ایک سکون سا اس کے رگڑے میں اترتا تھا۔ اس کا افق زندہ تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑنا بند نہیں کی وہیں فرش پر گٹھنوں کے بل کر گئی۔ وہ کسی دیر افق کے سرہانے روتی رہی تھی؟ اسے وہ گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔

اور تب اس نے ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ افق کا بادل تھا۔
”یہ کیا ہے؟“ وہ سانس نہیں لے سکی۔

اس کا بایاں پاؤں بری طرح کچلا گیا تھا۔ اور وہ اسے بہت آرام سے کٹ رہے تھے۔ وہ ان کے ہاتھ روکنا چاہتی تھی۔ ان کی منت کرنا چاہتی تھی کہ خدا! وہ افق کا پاؤں نہ کاٹیں۔ اگر اس کا پاؤں کٹ گیا تو وہ تمہارا کیسے دوڑائے گا؟ پہاڑوں پر کیسے چڑھے گا؟ کوئی پاؤں نہ اپنے انہی قدموں پر ہی تو تازہ ہوتا ہے۔ اور وہ سفال ڈاکٹر زافق ارسلان سے اس کے قدم چھین رہے تھے۔
”خدا کے لیے ایسا نہیں کرو۔ وہ اپنا اصرار وجود کچھ کر مرجائے گا۔“ وہ انہیں روکنا چاہتی تھی۔ روک نہیں سکی۔

باہر صبح طلوع ہو رہی تھی۔ چڑیوں نے مدھرائے ہوئے شروع کر دیے تھے۔ وہ طویل سیاہ خوفناک رات اس ختم ہو چکی تھی۔ ایک لمبی مسافت اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔

از کالی دیر ہوئی وہاں سے جا چکے تھے۔ افق اب زندہ اس کو آکھن ابھی تک کٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے دلی کوئی بات نہیں تھی۔

اس نے سکون سا سو رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس نے کٹ چکا تھا۔

پیشے نے تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا دل لہا اور پھر بے اختیار اس کے ماتھے اس کے اوپر چھو۔ وہ اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتی تھی۔ اب اسے یقین آ چکا تھا۔

اب اس نے تھکی تھکی ہالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں میں جانے دیں کی۔ میں دنیا کے بہترین ہسپتالوں کے شمار اعلیٰ کراؤں کی ایک دن تمام بالکل ٹھیک ہو گئے۔ پھر ہم ترکی چلے جائیں گے۔ اور ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ ہمیں اب زندگی بھر ان ظالم اہل کی شکل نہیں دیکھنی۔ ان پہاڑوں نے اسے کھینچ کر لیا۔ وہ اسے چھین لیا ہے۔ ہم اب بھی وہیں رہیں۔ وہیں اس کے لیے مجھے ہالیہ کی کھینچوں کی کھینچ ہے۔ میں نہیں پھر رہی اور وہیں میں آئے ہوں گی۔“

اس نے افق کی ایک طرف رکھی جیکٹ کی جانب سے نیلا اور سبز وہ رنگا پھر نکالا۔ جس پر وہ سیاہی میں گہری تھی۔ وہ اس پتھر کو دیکھ کر اس کی سے مسکرا دی۔

وہ جانتی تھی وہ اب کبھی گھوڑا نہیں دوڑائے گا۔ وہ کبھی پہاڑوں کا سفر نہیں کر سکے گا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کی وہ سکون تھی۔

اس کی زندگی کا سیاہ باب ختم ہو چکا تھا۔ اب اسے اپنی زندگی کی شروعات کرنی تھی۔

اس نے نرمی سے افق کے ماتھے پر آئے ہموارے لہانے۔

قراقرم کی پہی کو بالآخر اس کا گھر بنا مل ہی گیا تھا۔

30 جون 2006ء

خوب صورتی سے آراستہ کمرہ مہمانوں سے بھرا تھا۔ یہ ہال نما کمرہ یوان صدر میں اسی نوعیت کی تقاریب کے انتظام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں آٹھ اکتوبر کے زلزلے میں شہاں خدمات انجام دینے والوں کے لیے تقسیم اعزازات کی ایک جدارتی تقریب منعقد تھی۔

تمام کرسیاں کسی سرکل کی شکل میں بچھائی گئی تھیں۔ سامنے ایک پلیٹ فارم سایا تھا۔ جس پر صدر صاحب کھڑے تھے۔ ایک طرف ڈائس رکھا تھا۔ جس کے پیچھے موجود یکسیر باری باری مائیک پر اعزازات وصول کرنے والوں کے نام لکھے رہا تھا۔

کسی سرکل میں کرسیوں کے واسٹینڈ تھے۔ دائیں طرف والا اسٹینڈ مقامی سول و فوجی افسران اور لوگوں سے بھرا تھا جبکہ بائیں طرف تمام غیر ملکی پیشے تھے۔ ان میں اقوام متحدہ، امریکہ، یورپ، چین اور اسلامی ممالک سے اہل رکنے والے وہ تمام رضا کار شامل تھے جنہوں نے کشمیر کے زلزلہ زدگان کے لیے دن رات کام کیا تھا۔

بائیں طرف کی کرسیوں کی دو سری قطار میں بیٹھے تمام افراد سوائے ایک کے، خوب صورت نقوش والے ترک تھے جو آج بطور خاص حکومت پاکستان کی دعوت پر اسلام آباد آئے تھے۔

ان میں عروہ ہلیم بھی تھی۔ گلابی رخسار اور شہد رنگ ہالوں والی بہت چاری سی سات سالہ بچی، جو اپنے والدین اور چھوٹی بہن کے درمیان پر جوش و آسودہ سی بیٹھی تھی۔ اس کے اوپر اس کی چھوٹی بہن کے ہاتھوں میں ایک ایک جھنڈی تھی۔ جس کے ایک طرف پاکستان کا سبز اور دو سری جانب ترکی کا سرخ پرچم چلتا تھا۔ سربراہ کارف اوڑھے عروہ کی ہاں کے ہاتھ میں تین سو ڈالر کا وہ چیک تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے صدر پاکستان نے اسٹیج پر عروہ کو بلا کر ”جیو پاکستان“ سننے کے بعد اسے ڈائی طور پر تحفے میں دیا تھا۔

”افق! تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ پلیز آنکھیں کھولو۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میں سرجاؤں گی۔“ وہ پھر سے اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

”ڈاکٹر واسطی! سر! یہ بچ جائے گا؟ اسے کچھ نہیں ہو گا؟“ آسویں سے اس کا پورا چہرہ جھجک چکا تھا۔ وہ بکھری بکھری سی روتے ہوئے ڈاکٹر واسطی سے پوچھ رہی تھی۔

”شاید۔“ کسی ڈاکٹر نے کہا۔ وہ شیور نہیں تھے۔ وہ پر امید بھی نہیں تھے۔

”افق!“ وہ اس کے چہرے پر جھکی۔ ”افق! آنکھیں کھولو پلیز افق!“ وہ اسے پکار رہی تھی مگر وہ آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ اسی سی جی مشین پر ابھی سیدھی لکیر نہیں آئی تھی۔

”افق! ہمیں تمہارے عشق کا واسطہ ہے۔“ آنکھیں کھول دو۔“ وہ آہستہ سے شاید دل میں ہی کہہ رہی تھی مگر اسے لگا کہ اب افق نے من لیا ہے۔ بہت آہستہ سے اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ اس کی اوہ کھلی آنکھوں میں کوئی جذبہ، کوئی تاثر کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ پھر سے کیوں بے ہوش ہو گیا ہے؟“ اس نے بے اختیار اس کا چہرہ پتہ کیا۔ مگر اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ ”یہ۔۔۔ یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟“

”ریلیکس پریشے! اب وہ خطرے سے باہر ہے۔“ پتہ نہیں کس نے کہا تھا۔ وہ تو بس اس کی بند آنکھوں کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
”اسے اٹھائیں۔ اسے کہیں یہ آنکھیں کھولے۔“

”پریشے! اب وہ ٹھیک ہے۔ وہ سو رہا ہے۔“ ڈاکٹر واسطی نے اسے شاتوں سے پکڑ کر افق کے قریب سے

دوسری قطار میں بیٹھے افراد میں اور بن یقین اور ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ مسز یقین کی گود میں دھڑے خوب صورت کپڑوں میں جینیک یقین کے لیے حکومت پاکستان کی طرف سے ”ستارہ ایثار“ موجود تھا۔ وہ بار بار آنکھوں میں اٹھ کر آتے آنسو پونچھتی تھیں۔

مسز یقین کے بائیں جانب سیاہ بالوں کا فریج ٹاٹ پیٹے، سنہری رنگت اور دراز قد کی حامل سلمیٰ دوران تھی جو مسلسل ضبط سے لب کاٹتی، پلک جھپکائے بغیر سامنے صدر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی جسے بار بار وہ اپنے اندر اتار لیتی تھی۔

سلمیٰ کے پہلو میں سیاہ ڈنر جیکٹ سفید شرٹ اور سیاہ پنٹ میں لمبوس، بے تاثر نگاہوں سے سامنے دیکھتا ہوا افق ارسلان بیٹھا تھا اس کے ساتھ پریشے تھی جو اس قطار میں واحد نان ترک تھی۔

آفٹر شاک کے اس حادثے میں افق کا بایاں پاؤں بری طرح کچلا گیا تھا جو پھر مجبوراً ”ڈاکٹر کو کٹاڑا تھا۔ وہ دو مہینے اسلام آباد میں ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ پھر پریشے اسے علاج کے لیے امریکہ لے گئی تھی۔ مسئلہ صرف مصنوعی پاؤں لگانے کا نہیں تھا، مسئلہ افق کی ذہنی حالت کا تھا جو احمیت اور جینیک کو گھوڑنے کے بعد بہت بگڑ گئی تھی۔ جب وہ ہسپتال میں جا کا اور اسے احمیت اور جینیک کی ذہنی حالت کا علم ہوا تو پسلی بار پریشے نے اس اونچے لمبے مرد کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔

اس کی ذہنی حالت کی بحالی کے لیے پریشے کو بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ وہ دن رات اس کے ساتھ رہ کر اسے زندگی کی طرف واپس لاتی تھی۔ پھر انہوں نے افق کو جدید طرز کا پروتھیسز لگا دیا تھا۔ شروع میں اسے چلنے میں دقت ہوتی تھی، مگر ان گزرے چھ ماہ میں وہ اس کا بہت عادی ہو چکا تھا۔ معمولی سی لنگر اہٹ اس کی ٹانگ میں ابھی تک موجود تھی مگر وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ آج

نہیں تو آج سے ایک سال بعد ہی سہی اسے یقین کہ وہ ویسے ہی چلنے لگے گا جیسے پہلے چلتا تھا۔ اسے جانتی تھی کہ وہ دونوں اب کبھی قراقرم میں نہیں جائیں گے۔

پانچ ماہ پہلے جب وہ اس کے ساتھ شادی کر کے اپنے ہمراہ ترکی لے گیا تھا تب دونوں نے ایک وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ لینے والا افق خود تھا۔

”سری! ہم آج ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آج کے بعد ہم کبھی قراقرم میں واپس نہیں جائیں گے۔ مجھے اب ان پہاڑوں کو کبھی نہیں دیکھنا۔ جنہوں نے مجھ سے میرے بہترین دوست یقین کو ہٹا دیا۔“

اور پھر اس نے افق ارسلان کے ترکی میں ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔ اب وہ محض ایک جیولوجیکل انجینئر تھا اور دنیا کے بہت سے نارمل لوگوں کی طرح تائن ٹو فائیو جاب کرتا تھا پہاڑوں سے وہ دونوں اس تک خائف تھے کہ وہ تو ماؤنٹ اراٹ دیکھنے بھی گئے تھے۔ یہ شاید پہلی دفعہ تھا جب افق نے اسے اس اور کوہ پناہ کی ترک کر کے مسلسل پانچ مہینے لگا مارا اس جا کر زندگی کو انقرہ کی گلیوں تک محدود کر دیا تھا۔ وہ دونوں کوہ پناہ نہیں بلکہ ڈاکٹر اور انجینئر بن کر اس نئی زندگی میں بھی خوش تھے۔ ان کو اب کسی اور شے کی فکر نہیں تھی۔ افق کی شدتوں بھری محبت اس لیے کافی تھی۔

ہاں بس پچھلے پانچ ماہ میں ایک بے کلی سی زندگی تھی۔ سالی سی اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ کپڑوں کی خشکی رہ گئی تھی۔ وہ بہت غور بھی کر لی تو بظاہر سب ٹھیک تھا، سیف اور پچھو لوگوں نے شروع میں شور مچایا، مگر پریشے نے سیف کے خون نہ دینے کی کوشش کو ایشوینا کر مٹائی توڑ دی تھی۔ ان لوگوں نے اسے بھی بہت بنائیں، مگر اسے پروا نہ تھی۔ وہ بایا کے اثاثوں کا نگران ماموں کو بنا کر ترکی چلی آئی تھی۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا۔ نشاء کی بھی شادی ہو چکی تھی۔

جب اور اس کا وہ دوست مزید تعلیم کے لیے لندن جا رہے تھے۔ ہاں سب کچھ ٹھیک ہی تو تھا، پھر بھی اسے کالہ کپڑے پہننا پڑا اور اسے۔

اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے ساتھ لے افق کے بائیں جوتے پر نگاہ ڈالی۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ کوئی شخص اس کا جوتا دیکھنے پر سوچ بھی نہیں لگاتا تھا کہ اندر موجود پاؤں مصنوعی ہے۔ پریشے نے اسے سے نگاہیں ہٹا کر اس کے خاموش چہرے کو دیکھا۔

وہ ابھی تک سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی شہر رنگت لہووں میں جھللاتی پرانے دنوں کی یادیں دیکھ سکتی تھی وہ شہرے پرانے دن جب وہ تینوں انقرہ کی گلیوں میں بارش میں بھگا کرتے تھے۔ جب تینوں کلاس ٹیچر میں چٹنگ کرتے پکڑے جاتے اور پھر احمیت کی معصوم شکل اور بھولہ پن کے باعث اسے چھوڑ دیا کرتی تھی اور افق اور جینیک کو سزا ملتی۔ بعد میں وہ اس سے خوب لڑتے تھے۔ اور وہ دن جب افق اور جینیک نے اپنا بھائیڈا پھوڑنے پر احمیت کو نچ پانی سے مڑے پول میں پھینک دیا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی میں ہاتھ دھو رہا تھا، چیخ رہا تھا، انہیں گالیاں دے رہا تھا اور وہ ان کو کھڑے ہٹ رہے تھے اور پھر ہٹتے ہٹتے افق نے جینیک کو بھی اندر دھکا دے دیا تھا۔ اب وہ دونوں پول کے اندر تھے اور وہ باہر ہٹتے ہوئے اکیلا کھڑا تھا۔

آج پھر وہ اکیلا تھا۔ احمیت نہیں تھا۔ جینیک نہیں تھا۔

زندگی کے ہر سفر میں وہ اور جینیک اکٹھے جاتے تھے۔ پہلی دفعہ جینیک اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دو سترم پر کھڑا کمپیٹر احمیت دوران کی بیوہ کو بلا رہا تھا۔

سلمیٰ بہت آہستگی سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اونچے پلیٹ فارم پر کھڑے صدر تک آئی اور احمیت کا ”ستارہ ایثار بعد از شہادت“ وصول کیا۔

پھر آنکھیں رگڑتی بمشکل خود پر ضبط کرتی واپس آئی۔
پھر افق حسین ارسلان کا نام پکارا گیا۔

وہ اپنی نشست سے اٹھا اور آہستہ سے چلتا ہوا اوپر اسٹیج تک آیا۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے صدر سے ہاتھ ملایا۔ صدر نے چند تعریفی کلمات کہتے ہوئے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے سر جھکا کر اپنے بائیں پاؤں کو دیکھا ہال میں موجود تمام مہمانوں کی نگاہیں اس کے قدموں میں جمک گئیں۔

افق نے بائیں پاؤں ہلکا سا اوپر کیا پھر واپس زمین پر رکھتے ہوئے شانے اچکا دیے جیسے کہہ رہا ہو ”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس کے چہرے پر بے حد اواس مسکراہٹ رقصاں تھیں۔

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ صدر افق کے کوٹ پر ستارہ ایوارڈ لگا رہے تھے اور تمام سامعین و حاضرین اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر ایک بھارے ترک کے لیے تالیاں بجا رہے تھے ان تالیاں بجانے والوں میں پریشہ جہاں زیب بھی تھی جو آنکھوں میں نمی لیے بہت فخر سے افق کو دیکھ رہی تھی۔

”ہم مظفر آباد جا رہے ہیں۔“ سہ پہر میں جب وہ مری میں اس بل کھاتی سڑک پر آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنے ریسٹ ہاؤس کی جانب جا رہے تھے جہاں وہ سرکاری مسلمان کے طور پر مقیم تھے عروہ نے اپنی زبان میں سسلی کو بتایا اور آگے بھاگ گئی۔

ریسٹ ہاؤس پھاڑ کی چوٹی پر تھا اس تک جاتی سڑک دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہو جاتی۔ یہاں تک کہ ریسٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت تک پہنچ جاتی۔ پریشہ کو سسلی کے ساتھ اس پتھر ملی سڑک پر چلتے ہوئے بے اختیار مری مال روڈ یاد آئی جو اس سے بے حد مشابہت رکھتی تھی۔

”میں آ رہی ہوں۔“ سسلی نے بھاگتی عروہ کو بلند آواز میں کہا۔ عروہ اب دوڑتے ہوئے افق سے بھی آگے نکل چکی تھی جو ان دونوں سے کافی اوپر ڈھلوان پر

سر جھکائے جیسوں میں ہاتھ ڈالے چڑھ رہا تھا۔
”تم مظفر آباد جا رہی ہو؟“ دونوں خاموشی چھوٹے چھوٹے قدموں سے اوپر چڑھ رہی تھیں جب پریشہ نے اواسی سے پوچھا۔ یہ بارش سے منٹ قبلے کا موسم تھا جو اسے ہمیشہ اواس کر دیا کرتا تھا۔ سسلی نے ایک کمری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”مسٹر اینڈ مسز اور بن یقین اور عروہ کی پہلی ایک ترک مشرجم اور ترک سفیر کے مظفر آباد جا رہے ہیں۔ تمہارے سرکاری ٹی وی کا crew بھی ہو گا۔ ستارہ ایوارڈ حاصل کرنے والے ہر کوں پر تو کوئی بھی رے ہے جو آج شاہد تمہارے سرکاری ٹی وی دکھائی جائے گی۔“

دونوں سڑک کے کنارے سفید پتھروں کی باڑے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ افق ان سے کافی آگے سڑک کے بلند ترین مقام پر کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسوں میں ہاتھ ڈالے وہ سر اٹھا کر اوپر سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔
”لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔“ الفاظ اس کے

لبوں میں ہی تھے کہ بادلوں نے برسات شروع کر دیا۔ سسلی نے ہاتھ میں پکڑی گلابی چھتری کھول دی۔ پریشہ ریم جیم سے بچنے کو چھتری تلے سمٹ آئی۔
”تم کوئی مظفر آباد؟“ دونوں تیز ہوئی بوند باندی میں اوپر چڑھ رہی تھیں۔

”کوئی نہیں۔“
”کیوں؟“ سسلی پوچھی پتھر سڑک میں رک کر اسے دیکھنے لگی۔ چھتری اس نے پکڑ رکھی تھی پریشہ بارش کے باعث اس کے اور قریب کھسک آئی۔
”میں پہاڑوں میں واپس نہیں جانا چاہتی۔“
”اور۔“ افق؟“ سسلی نے کہتے ہوئے گردن ہموار سڑک کی بلندی پر دیکھا جہاں وہ اسی طرح کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔
”وہ بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔“

سسلی نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ ”تم کہتی ہو۔ ہم سب اپنی زندگیوں کی بہت بڑے مسائلات سے گزر چکے ہیں۔“ پھر وہ اضطراری انداز میں اب بچنے لگی۔

”جانتی ہو پری! یہ سب مظفر آباد کیوں جا رہے ہیں؟“ سب سلیم اسٹیڈیم میں آری کے کیمپ کا وہ آخری دن دیکھنا چاہتے ہیں جہاں امت اور جینیٹک نے اپنی آخری راست گزاری تھی۔ مگر میں۔ میں مظفر آباد کی فضاؤں اور غلیم کے پانی سے پوچھنا چاہتی ہو کہ میرے چھڑنے سے قبل وہ کیسا لگ رہا تھا؟ میں اس کی قبر کو کھنا چاہتی ہوں جس کی لاش نکالتے ہوئے امت خود لاش بن گیا۔ میں اس آخری خیمے کی مٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں مجھے اس سرخ مٹی اور غلیم کے پانی میں اپنے آئس کر اسٹے ہیں۔“
چھتری ابھی تک ان کے سروں پر تھی مگر سسلی کی بھیجی ہوئی ایک چٹائی۔

”افق جینیٹک کیمپ سمیت امت کو جانے والا شخص یہ کہا کرتا تھا کہ وہ صرف چلنے سے مقصود لگتا ہے اور اندر سے بہت خبیث ہے مگر میں نہیں جانتی۔“
دونوں پریشہ لڑیں نے اس کے ساتھ آٹھ سال گزارے ہیں۔ وہ شخص اندر سے بھی بھاری کی طرح معصوم تھا۔ وہ چہرہ انھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ پر روئی۔ چھتری اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگی۔ پریشہ نے فوراً ”چھتری پکڑو۔“

”میں چلتی ہوں۔“ کچھ دیر بعد اس نے بھیجا چہرہ صاف کیا۔ ”مجھے ایک آخری بار ہمالیہ کے آسمان تلے رونا ہے ان تمام دوستوں کے لیے جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آئے۔ امت دوران کے لیے۔ ار۔۔ بخاری کے لیے۔ جینیٹک یقین کے لیے۔“

”آج آخری دفعہ رولو پھر ہم ان ظالم پہاڑوں میں کبھی نہیں آئیں گے۔ آج شام ہم اپنا ماضی یہاں دفن کر کے جائیں گے۔“
سسلی کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”میں کوشش کروں گی۔“ پھر وہ گردن گھما کر دور کھڑے افق

کو دیکھنے لگی جس کا سیاہ کوٹ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔
”افق! سسلی نے پکارا۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ ہوا میں نور سے چل رہی تھیں۔ آواز اوپر تک نہیں گئی۔“

”افق! سسلی نے پھر آواز دی۔
افق نے گردن ترچھی کر کے نیچے ان دونوں کو دیکھا پھر جیسوں میں ہاتھ ڈالے ڈھلوان سے نیچے اترنے لگا۔

”تم بارش میں کیوں بھیگ رہے تھے؟ چلو چھتری کے نیچے آؤ۔“ وہ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا بھورے پیل ملتے پرچکے تھے۔ سسلی کی بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر چھتری تلے آیا اور پریشہ کے ہاتھ سے وہ لے لی۔

”میں چلتی ہوں۔“ سسلی چھتری کے نیچے سے نکل کر برستی بارش میں اوپر سڑک پر چڑھنے لگی۔
وہ دونوں چھتری تلے کھڑے خاموشی سے اسے موسلا دھار بارش میں اوپر جاتے دیکھتے رہے۔ جب وہ لگا ہوں سے اوپر چلے ہو گئی تو افق نے چہرہ اس کی طرف کیا۔

”اب تم میں سال بعد اپنے سفر نامے میں یہ لکھ سکتے ہو کہ جب تم اسلامی دنیا کے سب سے طاقتور ملک مئے تو اس کے ”بادشاہ“ نے تمہاری خوب آؤ بھگت کی وغیرہ وغیرہ۔“

”جھے کافی عرصے سے اپنی زندگی میں ایک اوصورا
پن محسوس ہوتا تھا۔ آج مجھے اس اوصورے پن کا راز
مل گیا ہے پری!“ وہ دونوں ابھی تک تیز بارش میں
چھتری تلے کھڑے تھے۔

”ابھی تم سلکلی کو کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ اب
کبھی پہاڑوں میں نہیں جائیں گے۔“ وہ کہتے کہتے
رک گیا اور پریشے کو علم تھا کہ آگے وہ کیا کہنے والا تھا
وہی کہنے والا تھا جس کا اور اک اس پر بھی بالکل ابھی ہوا
تھا۔

”یاد ہے میں نے تمہیں راکا پوشی پر ایورسٹ کی

چوٹی پر اترتی سنہری بریوں کا قصہ سنایا تھا اور شاید تم نے
یقین نہیں کیا تھا۔ مگر میں تمہیں بتاؤں پری اس کا راز

کی چوٹی پر واقعی ہونے کی بنی پر یاں اترتی ہیں۔ میں نے
انہیں دیکھا ہے اور میں نے تمہیں وہ دکھائی ہیں۔ میں

ایک دفعہ پھر ایورسٹ جانا چاہتا ہوں“ میں نہیں جانتا
میں اس دفعہ بچ کر آؤں گا یا نہیں، مگر مجھے ایک دفعہ پھر

جھوٹ بھگانی چوٹی پر کھڑے ہو کر پال اور تبت کو
دیکھنا ہے۔ میں پھر پہاڑوں میں جانا چاہتا ہوں۔“

سرد ہوا کا تیز جھونکا چھتری اڑا کر لے گیا، مگر
چھتری کے پیچھے نہیں گئی۔ وہ اسی طرح بارش میں

بھگتی بہت غور سے افق کو دیکھ رہی تھی۔
”مگر ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کبھی قراقرم نہیں

جائیں گے اور اچھے بچوں کی طرح کھڑے رہیں گے۔
ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کوہ پیما کی چھوڑ دیں گے۔“

پریشے کی بات پر وہ مسکرا دیا۔ شہد رنگ آنکھیں
چھوٹی ہو گئیں۔ اس نے ماتھے پر آئے، گیلے بھورے

بال پیچھے کیے اور اس کو دونوں شانوں سے تمام کر خ
سے قریب کیا، پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے بہت

آہستہ آواز میں پچھلے کئی گھنٹوں سے سوچی جانے والے
وہ بات کہی، جو بارش کے قطروں نے اور سیاہ بادلوں نے

بھی سن لی تھی۔
”کیا کوہ پیما کی بھی کوئی چھوڑنے والی چیز ہے؟“

وہ دھیرے سے مسکرایا اور گردن گھما کر دور دور
تک پھیلی مارگلہ کی پہاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ پریشے نے
اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ان پہاڑی سلسلوں کو
دیکھا۔ ان تمام پہاڑوں سے دور، بہت دور، ہمالیہ،
ہندو کش اور قراقرم کے پہاڑ شروع ہوتے تھے۔ وہ
ان کو وہاں سے نظر نہ آنے کے باوجود دیکھ سکتی تھی۔ وہ
ان میں پھیلی دلکش وادیوں کو بھی دیکھ سکتی تھی، جہاں
وائٹ پیلس کی میڑھیوں کے ساتھ نصب پنجرے میں
مقیدہ موروں کا جوڑا اس ترک گیت کو یاد کرتا تھا جو
کبھی ایک شہد رنگ آنکھوں والا سیاح انہیں سنایا کرتا
تھا۔ ماہو ڈھنڈ کے کنارے اگا سبزہ زار آج بھی اس
گھوڑے کو یاد کرتا تھا جس سے کبھی قراقرم کی ایک
پری اترتی تھی۔

وہاں دور دور تک پھیلے پہاڑ تھے۔ پر اسرار سیاہ پہاڑ
جو اپنے ظالم چہروں پر سفید چادر کی بفل مارے اپنے

اندروں ڈھیروں راز و فن کے بہت تمکنت سے کئی
صدیوں سے زمین پر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان تمام

پہاڑوں کے بیچ ایک ایسا پہاڑ بھی تھا جس کی برف بھی
تک نہیں پگھلی تھی۔ وہ آج بھی بہت غور سے بہت

تسخیر سے دنیا والوں کو دیکھ رہا تھا۔
لوگ اس پہاڑ کو کئی ناموں سے پکارتے تھے۔

راکا پوشی۔ The shining wall۔
دہانی۔

The mother of mist۔
برہتوں کی دیوی۔

قراقرم کا تاج محل
اس پہاڑ کا NW راج آج تک ناقابل تسخیر تھا۔

اسے 2005ء کے بعد پھر کسی نے سر کرنے کی
کوشش نہیں کی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر افق کو دیکھا۔ وہ کسی گہری
سوچ میں گم تھا۔

”افق حسین ارسلان“ ستارہ اینار“ آپ کیا سوچ
رہے ہیں؟“

اس کے انداز خطاب پر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔